دارالمصنفین کی تاریخی خدمات

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

دارالمصنفین کی تاریخی خدمات

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

اشاعت ۲۰۰۲ء

قیمت -/▬روپے

غیر ممالک کے لیے ۹ ڈالر

طابع وناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

حرفِ آغاز

دارالمصنفین اعظم گڑھ علامہ شبلی نعمانی کے خواب کی عظیم الشان تعبیر ہے۔ شبلی کو بعض ناگزیر حالات کے تحت ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ وہ ایک عملی انسان تھے۔ ہر وقت مصروف رہنا ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ چنانچہ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اپنے اس خاکے میں رنگ بھرنے کا منصوبہ بنایا جسے انھوں نے ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا۔ یہ خاکہ تھا ایک علمی و تحقیقی ادارے اور اس سے متعلق ایک کتابخانے کے قیام کا۔ اس پر انھوں نے بڑی گرم جوشی سے کام کیا لیکن جب یہ منصوبہ اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں پہنچنے ہی والا تھا کہ پیغام اجل آگیا اور شبلی اس عظیم منصوبے کو نامکمل اور ناتمام چھوڑ کر مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوگئے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اپنے پیچھے وہ اپنے تلامذہ اور معتقدین و متوسلین کا ایسا حلقہ چھوڑ گئے جس نے ان کے علمی و ادبی کاموں کو آگے بڑھانا اور علمی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنے لیے باعث سعادت جانا۔ چنانچہ ان حضرات نے ان کے مذکورہ بالا منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر دارالمصنفین کے نام سے اعظم گڑھ میں ایک علمی و ادبی اور تحقیقی ادارہ قایم کیا۔ یہ اواخر ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ اس کے مقاصد اور دائرہ کار کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی تھی:

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا

۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ

۳۔ تصنیف شدہ کتابوں و دیگر علمی و ادبی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا۔

اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس پورے عرصہ میں دارالمصنفین نے ان مقاصد کو پورا کرنے کی خلوص نیت سے کوشش کی اور تصنیف و تالیف، ترجمہ اور نشر و اشاعت کا اعلیٰ معیار قایم رکھتے ہوئے اہم موضوعات پر کتابیں طبع کیں۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے اور طویل عرصہ تک اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسے روز اول سے ہی علماء وفضلا اور بلند پایہ محققین و مصنفین کی سرپرستی اور تعاون حاصل رہا۔ ان میں علامہ

سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، حاجی معین الدین ندوی. مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولوی ابوظفر ندوی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا ضیاء الدین اصلاحی جیسی مایۂ ناز اور نابغۂ روزگار شخصیات شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک شخصیت بجائے خود ایک دبستان اور ایک انجمن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان حضرات کی کوششوں سے دارالمصنفین کی مطبوعات کا معیار ہمیشہ بلند اور دائرہ خاصا وسیع رہا ہے۔ ان کے موضوعات بھی بڑے متنوع رہے ہیں۔ ان میں سیرتِ نبویؐ، سوانح و تذکرہ، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ اسلام، تاریخ ہند (بالخصوص عہد وسطیٰ کی سیاسی و تمدنی تاریخ)، فلسفہ، علم الکلام اور ادبیات جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک موضوع پر اس عالمی شہرت یافتہ ادارہ نے بڑی معیاری اور وقیع کتابیں شایع کی ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ اس کی تمام مطبوعات کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا جائے اور ان کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا جائے۔ اس نوعیت کا پہلا کام ڈاکٹر خورشید نعمانی نے کیا اور دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ ۱۹۷۷ء میں یہ کتابی شکل میں شایع ہوا۔ لیکن اب دارالمصنفین کی خدمات اتنی وسیع اور مطبوعات کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ محض ایک کتاب میں ان سب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اب مناسب یہ ہوگا کہ ہر ایک موضوع پر جداگانہ حیثیت سے کام کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور صرف تاریخ سے متعلق دارالمصنفین کی مطبوعات اور ان کے مؤلفین سے متعلق ایک کتاب 'دارالمصنفین کی تاریخی خدمات' بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دی۔ جسے شایع کرنے کا فخر خدا بخش لائبریری کو حاصل ہورہا ہے۔ کتاب کے شروع میں، پس منظر کے طور پر، انھوں نے اردو میں تاریخ نویسی کی روایت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے اصل موضوع کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ توقع ہے کہ لائبریری کی دیگر مطبوعات کی طرح اسے بھی قبول عام نصیب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری
ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ

دارالمصنفین علامہ شبلی کی عظیم علمی، تحقیقی، تاریخی اور مذہبی زندگی کا حسن خاتمہ اور ان کے تخیل و تمناؤں کی حقیقی تعبیر ہے۔ گو ان کی زندگی میں یہ تعبیر کامل طور سے عمل میں نہ آسکی اور اس کے ظہور اور نشو و نما کا مرحلہ دور آغاز ہی میں تھا کہ انھوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ تاہم ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ اور منتسبین خاص نے اس کے خاکۂ شبلی میں انہی کے ارمانوں کے مطابق رنگ بھرا۔ خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی بے نظیر علمی صلاحیت اور جدوجہد سے دارالمصنفین کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ان کے پیش نظر ہمہ وقت یہ حقیقت رہی کہ قوموں کی تمام ترقیاں خیالات کی بلندی و اصلاح پر منحصر ہوتی ہیں اور ملک کے خیالات میں انقلاب صرف لائق اہل قلم ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی مقصد دارالمصنفین کے قیام کا تھا چنانچہ انھوں نے دارالمصنفین کے ذریعہ اہل علم و قلم کی تربیت پر خاص توجہ دی جس کا ثمرہ یہ مرتب ہوا کہ اہل علم و قلم کی ایک معتد بہ تعداد اسی ادارہ کی توجہ و تربیت کی بدولت مصنف بن کر نکلی۔

دارالمصنفین کے قیام پر پون صدی سے زاید کا عرصہ گذر چکا ہے مگر وہ آج بھی مصنفین اور اہل قلم کی ذہنی و دماغی اور تصنیفی تربیت کے لحاظ سے برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔

دارالمصنفین کا خیال علامہ شبلی کے دل میں نہ جانے کب سے تھا مگر اس کا پہلا اظہار انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں کتب خانہ ندوہ کی ضرورت کے سلسلہ میں کیا۔ اسی اجلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی علامہ شبلی کے مشورہ سے دارالعلوم کی جدید عمارت میں کتب خانہ کی ضرورت پر تقریر کی جس میں انھوں نے بہ صراحت دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کی اور فرمایا کہ:

> ''کتب خانہ کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لیے بنایا جائے جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو۔

مادری زبان جس کا گہوارہ طفولیت یہی دہلی ہے ان کی تصنیفات کے ذریعہ سے ترقی دی جائے۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم و مصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے اس کے مصارف بطور یادگار اپنی جیب سے پورے کریں اور اس عمارت کا نام دارالمصنفین ہو"۔(۱)

اس کے بعد اگست ۱۹۱۰ء میں نواب سر مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب ملنے کی خوشی میں علامہ شبلی کو خط لکھا کہ میں آپ کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوانا چاہتا ہوں اس کے جواب میں علامہ مرحوم نے ماہنامہ الندوہ (اگست ۱۹۱۰ء) میں ایک نوٹ لکھا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ:

"ہم چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تصنیف و تالیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شائع ہوں۔ باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آکر رہیں ان کے لیے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے تمام ضروری علوم و فنون کی کتابیں مہیا رہیں۔ چونکہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طبقہ میں تصنیف و تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس لیے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہوگی نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں"۔(۲)

ابھی یہ منصوبہ زیر غور ہی تھا کہ ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی کی مخالفت شروع ہوگئی جس سے بالآخر بددل ہو کر علامہ شبلی مستعفی ہوگئے ساتھ ہی ندوہ میں دارالمصنفین کی تجویز بھی نامکمل رہ گئی اور ندوہ ایک بہت بڑی دولت سے محروم رہ گیا۔

ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد علامہ شبلی نے دارالمصنفین کے قیام کا پھر منصوبہ بنایا اور اسے اپنی زندگی کا آخری میدانِ عمل اور زمرہ مصنفین کی دائمی(۳) خدمت سمجھ کر اس کا آغاز کیا اور مورخہ ۱۱؍ فروری ۱۹۱۴ء کے الہلال میں دارالمصنفین کی تجویز قوم کے

۱- حیات شبلی ص ۶۹۲۔ ۲- ایضاً ص ۶۹۲-۶۹۳۔ ۳- مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۹۳۔

سامنے پیش کی۔ حالانکہ یہ دور علامہ شبلی کے لیے نہایت پُر آشوب تھا مخالفین ندوہ کے علاوہ بھائی (مولوی محمد اسحق وکیل ہائی کورٹ) کی وفات، ذاتی اور خانگی مسائل نیز صحت کی خرابی وغیرہ نے انھیں شدائد و محن میں مبتلا کر رکھا تھا اس کے باوجود دارالمصنفین کی تجویز کی اشاعت اور اس کا اہتمام، ان کے شدید تعلق و احساس کا غماز ہے۔ انھوں نے اس اعلان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اپنے احباب خاص اور دوسرے اہل علم کے پاس اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت و تفصیل سے لبریز خطوط روانہ کرنا شروع کیے۔

اب مسئلہ درپیش تھا کہ دارالمصنفین کہاں قائم کیا جائے مولانا مسعود علی ندوی کا خیال تھا کہ ندوہ میں قائم کیا جائے علامہ شبلی کی بھی شروع سے یہی رائے تھی، مولانا مسعود علی ندوی کے ایک خط کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

> "بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں میری اصل خواہش یہی ہے لیکن کیا کیا جائے حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے"۔(۱)

علامہ شبلی کے حبیب خاص مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نے دارالمصنفین کے لیے اپنے وطن حبیب گنج کو پیش کیا لیکن اس پیش کش کا جواب انھوں نے یہ لکھ کر دیا کہ:

> "آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں"۔(۲)

بالآخر ابتدائی حیص بیص کے بعد قرعہ فال اعظم گڑھ کے نام ہی نکلا اس کے لیے علامہ شبلی نے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو خاندان کے اور افراد کی مرضی و اجازت کے بعد برائے دارالمصنفین وقف کر دیا ابھی وقف نامہ تیار ہی ہو رہا تھا کہ یہ سراپا علم شخصیت مالک حقیقی کے بلاوے پر سیرت، سیرت کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

علامہ شبلی کی وفات کے تین روز بعد یعنی ۲۱ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر مولانا سید سلیمان ندوی کی موجودگی میں علامہ شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے ایک عارضی مجلس اخوان الصفا کے نام سے قائم کی گئی جس کے صدر مولانا

۱- مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۲۷۔ ۲- ایضاً حصہ اول ۲۰۹۔

فراہی، ناظم مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم ندوی رکن قرار پائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونہ میں پروفیسر تھے وہ استعفاد دے کر اعظم گڑھ آگئے، مولانا عبدالسلام ندوی نے کلکتہ کو خیرباد کہہ کر اعظم گڑھ کا رخ کیا، مولانا مسعود ندوی نے بھی ان دونوں احباب کی معیت میں مزار شبلی کے پہلو میں باقی زندگی گذارنے کا فیصلہ کیا۔ یہی عارضی مجلس اخوان الصفا گویا دارالمصنفین کا نقطۂ آغاز ہے۔ دارالمصنفین کی یہ مختصر جماعت بے سروسامانی کے باوجود منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ سید صاحب نے علامہ شبلی کے تلامذہ اور فضلائے ندوہ کی ایک پوری جماعت کو دارالمصنفین سے وابستہ کر لیا۔ تصنیف و تالیف کی ابتداء سیرت نبویؐ، سیر الصحابہ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور علوم و فنون کی تاریخ کی تدوین سے ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں پریس قائم کر کے ماہنامہ معارف کا اجراء عمل میں آیا دفتر اور کتب خانہ کی عمارتیں تعمیر ہوئیں گویا لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

علامہ شبلی کا مقصد حیات یہی تھا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد علماء کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی نئی ضروریات کو پورا کرتا رہے (۱)، چنانچہ اسی مقصد کی برآری کے لیے دارالمصنفین نے باضابطہ ان مقاصد کا اعلان کیا کہ:

۱- ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔

۲- بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرنا۔

۳- ان کی اور دیگر علمی و ادبی کتابوں کے طبع و اشاعت کا انتظام کرنا۔

آج دارالمصنفین کی خدمات کے مطالعہ کے بعد پوری دیانت کے ساتھ یہ اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ دارالمصنفین اپنے مقاصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب رہا۔ پچاسوں مصنفین اور اہل قلم اس کی آغوش میں پل کر خود اس لائق ہوئے کہ ان سے سیکڑوں افراد و اشخاص نے علمی و قلمی تربیت حاصل کی۔

بیسویں صدی کے اختتام پر اگر عہد رفتہ پر نظر ڈالی جائے تو اردو زبان و ادب کا وسیع دامن، گلہائے رنگارنگ سے رشک چمن نظر آتا ہے اور بلاشبہ اس میں سب سے حسین،

۱- حیات شبلی مقدمہ ص ۱۸۔

رنگین، معطر اور دیرپا رنگ دبستان شبلی کا ہے اور یہی اس پورے ذخیرہ گل میں گل سرسبد کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

دارالمصنفین کا بنیادی مقصد بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ ہے چنانچہ اب تک اس کے مصنفین نے دو سو سے زائد بلند پایہ اور اعلیٰ درجہ کی علمی و تحقیقی اور تاریخی کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کیں نیز ان کے طبع و اشاعت کا بھی اہتمام کیا اور اس آخری مقصد کے لیے دارالمصنفین نے اپنا پریس اور دارالاشاعت قائم کیا۔

دارالمصنفین صرف ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ و تابندہ تحریک ہے ایک مملکت علم و دانش ہے۔ علم و ادب، تحقیق و تنقید اور تاریخ و تہذیب کی گوناگوں اور عظیم الشان خدمات کے پیش نظر ضرورت تھی کہ اس کی مفصل اور مبسوط تاریخ لکھی جاتی لیکن افسوس کہ اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان وغیرہ پر اگرچہ تحقیقی کام ہوا ہے جس میں قدرتاً دارالمصنفین کا ذکر شامل ہے لیکن یہ ضمنی حیثیت کا حامل ہے خود دارالمصنفین پر عمدہ تحقیقی مقالہ لکھے ہی نہیں گئے۔ اس میں ڈاکٹر خورشید نعمانی کے مقالے "دارالمصنفین کی ادبی خدمات" کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے لیکن وہ بھی اس کے ایک پہلو یعنی ادبی خدمات پر لکھا گیا ہے۔ اس بڑی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے اپنی کم مائیگی کے باوجود دارالمصنفین کی تاریخی خدمات کو اپنا موضوع منتخب کیا۔ ظاہری طور پر یہ بھی جزوی مطالعہ ہے لیکن اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ فن تاریخ اور متعلقات تاریخ ہی دراصل دارالمصنفین کا بنیادی اور مرکزی موضوع ہے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ محض جزوی نہیں بلکہ اس میں دارالمصنفین کے کل سرمایہ کی تفصیل کا احاطہ ہو گیا ہے۔

میں کہاں تک اس موضوع کا حق ادا کر سکا ہوں یہ فیصلہ ارباب نظر کا ہے تاہم یہ ضرور عرض کروں گا کہ حتی المقدور اس موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اردو میں تاریخ نگاری کی ابتداء و ارتقاء، عہد بہ عہد کی ترقیاں اور عہد شبلی سے پہلے کی تاریخی کتب اور طرز تاریخ نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں ابواب میں علی الترتیب علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن جو آسمان تاریخ کے آفتاب و ماہتاب تھے ان کے تاریخی کارناموں کا مفصل تحقیقی و

تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں دوسرے مؤرخین دارالمصنفین کی تاریخی خدمات کا ان کی تاریخی کتابوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتویں یعنی آخری باب میں دارالمصنفین کے تمام تاریخی کارناموں کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان ابواب و مباحث سے دارالمصنفین کی مکمل خدمات کا نقشہ واضح طور پر سامنے آجاتا ہے، اس کے باوجود دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرف آخر ہے۔ تحقیق و تدقیق کی دنیا میں حرف آخر کوئی چیز نہیں اس لیے اہل علم و دانش سے فروگذاشتوں کے درگذر اور نئے معلومات کی رہنمائی کی گذارش ہے جس سے مستفید ہو کر یہ مقالہ زیادہ مفید اور زیادہ بہتر ہو سکے۔

اظہار تشکر وامتنان

اس مقالہ کی ترتیب و تیاری میں جن لوگوں نے میرا تعاون کیا ان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ لیکن سب سے پہلے اللہ تعالی کے حضور میں سر بسجدہ ہوں اور اس کی رحمت بے پایاں کا شکر گذار ہوں کہ اس نے یہ مقالہ لکھنے کی سعادت بخشی اور مجھ بے بضاعت کو اس لائق بنایا۔ اس بار گراں کی ذمہ داری اٹھا سکوں۔

خوش قسمتی سے دبستان شبلی کے نامور محقق اور ادیب و شاعر اور ہمارے مشفق استاد گرامی قدر عالی جناب ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی صاحب کی توجہ و عنایت اور مقالہ کی نگرانی کی دولت میسر ہوئی۔ استاذ محترم کو دارالمصنفین سے تعلق نہیں بلکہ عشق ہے۔ ان کی زندگی کے قیمتی لمحات شبلی کالج اور اردو کی خدمت میں گذرے ہیں۔ انھوں نے میرے ذوق اور اپنے شوق سے اس موضوع کا انتخاب کیا اور اس کی ترتیب و تدوین میں ہر ہر قدم پر میری رہنمائی کی، تحقیق و تنقید کے رموز بتلائے۔ ان کی مشفقانہ توجہ و عنایت کا نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ان کی توجہات و عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں اللہ تعالی ان کی عمر میں برکت اور مزید علم و فن کی خدمت کا موقع دے ان کی محبت و شفقت میرا سرمایہ افتخار ہے۔

دارالمصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کا بھی صمیم قلب سے شکر گذار ہوں کہ اس مقالہ کی تدوین و ترتیب میں ان کی محبت و شفقت میرا بڑا سہارا رہی۔ تاریخ کے رموز و نکات سے آشنا ہونے کے لیے ڈاکٹر جاوید علی خاں صدر شعبۂ تاریخ شبلی نیشنل

کالج اعظم گڑھ کا بھی ممنون ہوں۔ احباب میں مولانا عمیر الصدیق ندوی، مولانا محمد عارف عمری (رفیق دارالمصنفین) اور ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (علی گڑھ) کا شکریہ نہ ادا کرنا احسان فراموشی ہوگی کہ ان لوگوں نے میرا ہر طرح سے تعاون کیا، ان لوگوں کا مخلصانہ تعلق اس زمانہ میں بڑی دولت سے کم نہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری صاحب ڈائرکٹر خدابخش لائبریری، پٹنہ کا بھی ممنون ہوں انھوں نے قیمتی اور مفید مشورے دیے اور بعض کتابیں جن تک رسائی مشکل تھی فراہم کیں۔ کتب خانہ دارالمصنفین کے ناظم برادر عزیز سلیم جاوید سلمہ کتب خانہ جامعۃ الرشاد، شبلی کالج لائبریری، مبتہ لائبریری وغیرہ کے لائبریرین حضرات کا بھی شکرگزار ہوں کہ ان لوگوں نے میری بڑی مدد کی بروقت اور دلچسپی سے کتابت کے لیے جواں سال کاتب حافظ محمد قاسم فیض آبادی کا بھی ممنون ہوں، آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مقالہ کو مفید بنائے اور قبولیت سے سرفراز کرے۔

مخلص

محمد الیاس الاعظمی

انور گنج، مہراجپور، اعظم گڑھ

باب اول

اردو میں تاریخ نگاری کی روایت

اردو زبان کی ابتداء سے لے کر اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول تک کی اردو کتابوں کے سرمایہ پر نظر ڈالنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کا دائرہ مذہبی، لسانی اور ادبی موضوعات پر محیط ہے، تاریخ نویسی کے عناصر اور رجحان کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اس رجحان میں تبدیلی کے اولین نقوش ملنے لگتے ہیں اور تاریخ کے موضوع پر چند کتابیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں رستم علی بجنوری کی قصہ واحوالِ روہیلہ، منعم خاں اورنگ آبادی کی تاریخ سوانح دکن اور تاریخ ہندوستان وغیرہ کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اسی زمانہ میں فارسی تاریخ کی بعض کتابوں کے اردو ترجمے بھی سامنے آگئے مثلاً تاریخ فیروز شاہی کو وارث علی بن شیخ بہادر نے اور تاریخ حیدری کو منشی محمد قاسم نے تاریخ سرنگاپٹم کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔

یہ دور اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی دور میں ہندوستان میں انگریزی تاریخ نویسی کی بھی ابتدا ہوئی جس کے ذریعہ دوسرے موضوعات کی طرح تاریخ نویسی بھی جدید نظریات و خیالات سے متاثر ہوئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو تاریخ نویسی کی ابتداء ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کے زوال کا آغاز بھی ہے۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں کہ اردو میں ابتدأ جو تاریخیں لکھی گئیں ان پر عربی و فارسی کی بہ نسبت انگریزی کے اثرات زیادہ مثبت ہوئے۔

یہاں اردو کی چند ابتدائی تاریخی کتابوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے نیز اردو تاریخ نویسی نے عہد بہ عہد جو ترقی کی اور اس میں جو نمایاں رجحانات آئے اور وہ جن مراحل سے گذری اس کا ایک نقشہ سامنے آجائے۔

تاریخ کی پہلی کتاب: قصہ واحوالِ روہیلہ (۱)

اردو زبان میں تاریخ کی پہلی کتاب قصہ واحوالِ روہیلہ رستم علی بجنوری نے لکھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ یہ ۱۷۷۴-۱۷۸۱ء کے درمیان میں لکھی گئی۔ اس میں ۱۷۳۰ء سے لے کر ۱۷۷۵ء یعنی شجاع الدولہ تک کے حالات وواقعات بیان ہوئے ہیں۔

قصہ واحوالِ روہیلہ دراصل علی محمد خاں، جو نوابان رامپور کے جدّ اعلیٰ ہیں، کے احوال پر مبنی ہے اور ان ہی کے حوالے سے رستم علی بجنوری نے اس دور کے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے چنانچہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ:

"اس کتاب میں ہندوستان کی تقریباً پچاس سالہ تاریخ روہیلوں اور پٹھانوں کے حوالہ سے بیان ہوئی ہے"۔ (۲)

قصہ واحوالِ روہیلہ اگرچہ تاریخ کے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے تاہم اس میں تاریخ نویسی کے اہم عناصر ترکیبی واضح طور پر موجود ہیں۔ مثلاً اس میں ربط و تسلسل کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر جاوید علی خاں نے اس کے اس وصف کا ذکر کیا ہے۔ (۳)

صحت واقعات پر بھی رستم علی بجنوری نے خاص توجہ کی ہے اور کوشش کی ہے کہ وہی واقعات بیان کیے جائیں جو ان کے علم میں عینی یا سمعی ذرائع سے آئے۔ (۴)

مؤرخ کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ وہ واقعات میں رنگین بیانی اور انشاء پردازی سے کام نہ لے۔ چنانچہ قصہ واحوالِ روہیلہ کے اسلوب نگارش میں یہ خوبی حیرت انگیز طور پر موجود ہے۔ حیرت انگیز اس لیے کہ اس وقت تک اردو نثر نگاری کا تصور انشاء پردازی اور رنگین بیانی کے بغیر دشوار تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

"رستم علی کی نثر بیانیہ ہے اس میں رنگینی و عبارت آرائی نہیں

۱- پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے تاریخی نقطہ نظر سے اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ملاحظہ ہو سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸ء میں ان کا مضمون بعنوان "اردو زبان میں تاریخ نگاری کی ابتدا"۔

۲- ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ص ۱۰۷۶۔

۳- Dr.Javed Ali Khan "Beginnings of historical writings" in Urdu Journal of th Pakistan historical society vol XLII January 1994, P23.

۴- قصہ واحوال روہیلہ ص ۳۔

ہے بلکہ وہی زبان اور وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو عام طور سے بول چال کی زبان میں استعمال ہوتا ہے یہاں نثر انشاپردازی کے لیے نہیں بلکہ اپنا مقصد بیان کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے اس لیے اس میں سلاست و روانی بھی ہے اور اپنی بات کہنے کی قوت بھی۔ اس دور میں جب اردو نثر میں تاریخی کتابیں لکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی رستم علی کی یہ تصنیف اردو نثر کی ایک نئی روایت کو جنم دیتی ہے"۔(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"قصہ و احوال روہیلہ کی نثر طبع زاد ہے جس میں اظہار بیان کا تنوع بھی ہے۔ موقع و محل کے مطابق جیسے تاریخی منظر بدلتا جاتا ہے اس کا اسلوب بھی اسی کے مطابق اپنا لہجہ اور رُخ بدلتا جاتا ہے۔ اس میں جنگی تناظر بھی ہیں اور سازشوں کا احوال بھی درج ہے، فوجی حکمتِ عملی بھی بیان کی گئی ہے اور مختلف مراسلے اور نامہ و پیغام بھی لکھے گئے ہیں۔ تاریخ نویسی اور نثر نگاری دونوں لحاظ سے یہ اس دور کی ایک اہم تصنیف ہے"۔(۲)

تاریخ ہندوستان

تاریخ کی یہ کتاب ۸۱-۱۷۸۰ء میں لکھی گئی، اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس میں تیمور سے لے کر سلطان ٹیپو شہید تک کے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔ دہلی کی طوائف الملوکی، نادر شاہ، احمد شاہ، سورج مل کی تباہیوں اور سکھوں، جاٹوں اور کھتاری قوم کے ساتھ برطانوی حکومت کے تعلقات اور نواب نجف خاں اور سکھوں کے تنازعات وغیرہ کی بھی بھرپور تفصیلات آگئی ہیں۔

مختلف حکمرانوں کے ساتھ ان کے امراء و رؤساء کا حال بھی اس میں بیان کیا گیا ہے۔ نوابوں کا ذکر تفصیل سے ہے اس میں میر جملہ، فخر الدولہ، سراج الدولہ، ناصر جنگ اور مظفر جنگ وغیرہ نیز حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید کے احوال اور ان کی معرکہ آرائیوں کی روداد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ غرض اس میں ۱۷۸۰ء تک کے ہندوستان کی تاریخ کے

۱- تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ص ۱۰۷۷۔ ۲- ایضاً۔

اہم واقعات آگئے ہیں۔

کتاب کا اسلوب نگارش عام فہم اور آسان ہے اور تاریخی نثر کا احساس ہوتا ہے۔ حکمرانوں کے سیاسی واقعات، ان کے معاشرتی اور بعض تمدنی واقعات کا ذکر بھی اس میں آگیا ہے۔ عقائد کی بعض بحثیں اس میں شامل ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا تعلق اہل تشیع سے تھا۔

اس کتاب کا بنیادی ماخذ فرزند علی حسینی کی کوئی فارسی تصنیف ہے جس کی مصنف نے نشاندہی نہیں کی ہے۔ اس لیے ہم واضح طور پر اسے ترجمہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس کا مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہے اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے تذکرۂ مخطوطات میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۱)

تاریخ سوانح دکن

یہ کتاب ۱۷۸۲ء میں منعم خاں اورنگ آبادی نے لکھی جو ایک بڑے مؤرخ تھے۔ انھوں نے مذکورہ نام سے فارسی میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، اردو میں اصلاً اسی کتاب کا اختصار پیش کیا گیا ہے اور جابجا اپنی اصل تصنیف کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس میں حکومتِ آصفیہ کی مفصل تاریخ لکھی گئی ہے جس سے اس کے چھ صوبوں کے مجموعی حالات آگئے ہیں۔ مصنف نے ان صوبوں اور ان کی قدیم و جدید تاریخ تسلسل سے لکھی ہے اور ان علاقوں کا مکمل جغرافیہ بھی بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ یہاں کی جھیلوں، ندیوں، پہاڑوں، چشموں، قیمتی پتھروں، جواہرات، کپڑے، غلّہ اور پھول و پھل کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ منعم خاں نے دہلی کے بارے میں لکھا ہے کہ مورخوں نے اس کی بجا تعریف کی ہے مگر دکن اس سے کسی طرح کم نہیں بلکہ نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کی رونق ختم ہو کر دکن میں منتقل ہو گئی تھی۔

مصنف نے خاندان آصفیہ کے حکمرانوں اور ان کی شان و شوکت کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کیا ہے خاص طور سے نواب نظام علی خاں کی بڑی تعریف کی ہے۔(۲)

یہ کتاب تاریخ کی جزئیات نگاری اور جغرافیائی احوال جیسے علمی مباحث سے یقیناً ایک منفرد کارنامہ ہے اور تاریخ نویسی کا معیاری نمونہ قرار دیے جانے کے بھی لائق ہے۔

۱- تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول ص ۲۰۷۔ ۲- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل شمارہ ۳۱ ص ۳۰۔

مذکورہ بالا کتابیں اٹھارہویں صدی میں تاریخ نویسی کا کل موجود و دستیاب سرمایہ ہیں، ان کے علاوہ ہمیں کسی اور تاریخی تصنیف کا اس صدی میں سراغ نہیں ملتا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ کتابیں اگرچہ اردو تاریخ نگاری کا ابتدائی نمونہ ہیں تاہم ان میں تاریخ نویسی کے اہم عناصر مثلاً واقعات کی صحت واستناد اور ربط و تسلسل نیز تاریخی اسلوب وغیرہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں حوالوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، واقعات میں تسلسل بھی پایا جاتا ہے، زبان و بیان بھی مروجہ نثر نگاری سے جدا ہے، تاریخ کے ساتھ جغرافیائی حالات بھی ملتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان میں تاریخ نگاری کے اصولوں کا بڑی حد تک پاس و لحاظ کیا گیا ہے۔ راقم کے خیال میں ان تاریخوں سے اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔

انیسویں صدی کو اردو تاریخ نویسی کا عہد زریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس صدی میں باقاعدہ اس کی طرف توجہ دی گئی۔ سیکڑوں تاریخی کتابیں لکھی اور ترجمہ کی گئیں، مؤرخوں کی انفرادی کوششوں کے علاوہ اجتماعی طور پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور مرحوم دہلی کالج نے درجنوں کتابیں ترجمہ کرائیں۔ اس کے بعد سرسید احمد خاں کا دور آتا ہے جنھوں نے نہ صرف تاریخ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ اسے جدید فکر و نظر اور اسلوب و آہنگ سے روشناس کرایا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ اس کا ذوق عام کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کی نگرانی و سرپرستی میں اردو تاریخ نویسی کا سب سے تابناک ستارہ علامہ شبلی کی شکل میں آسمانِ علم پر روشن ہوا جس نے تاریخ نویسی کے بلند ترین اور جدید ترین نمونوں کے علاوہ ایک نیا فلسفہ تاریخ بھی پیش کیا۔

یہاں عہد سرسید تک کی تاریخ نگاری کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی تاریخی خدمات

ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں نے ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ بعد میں یہ تاریخ مقدم کر کے ۴ر مئی ۱۸۰۰ء اس لیے کردی گئی کہ یہ سلطان ٹیپو شہید پر انگریزوں کی فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد ہندوستان میں نووارد انگریزوں کو اردو زبان کی تعلیم دینا تھا۔ چنانچہ ان نوواردوں کے لیے عام فہم اور آسان زبان میں اردو کتابوں کی ضرورت پڑی تو کالج کے ارباب حل وعقد نے ملک کے متعدد اہل علم کو جمع کر کے کالج میں شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کیا، ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تحقیق کے مطابق فورٹ ولیم کالج میں چھوٹی بڑی تقریباً ۱۲۲ کتابیں لکھی اور ترجمہ کی گئیں۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں یہ اردو کی سب سے بڑی خدمت تھی جو انگریزوں کے ذریعہ انجام پائی۔

ان کتابوں کے موضوعات مختلف ہیں۔ ان میں مذہبی کتابیں بھی ہیں اور قصہ و داستان کی بھی، تذکرے بھی ہیں اور تاریخ بھی۔ تاریخی کتابوں کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس سے پہلے تاریخ کے موضوع پر چند کتابیں ہی اردو کے دامن میں تھیں جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے، یہاں فورٹ ولیم کالج کی تاریخی کتابوں کا ایک تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

تصنیفات و تالیفات

۱۔ حسنِ اختلاط

یہ کتاب میر ابوالقاسم خاں نے ۱۸۰۳ء میں لکھی۔ اس میں ابتداً کرسپ اور گل کرسٹ کی تعریف ہے۔ اس کے بعد راجہ بکرماجیت اور تورانیوں کے ہندوستان پر غلبے کے حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں، پھر محمد شاہ اور نادر شاہ کے حملوں کا ذکر ہے۔ ضمناً بنگال اور عظیم آباد کے حالات و واقعات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان کے بعد انگریزوں کے عہد کی تاریخ ہے۔ مصنف نے انگریزوں کی مدح و ستائش میں بڑی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔

حسنِ اختلاط شائع ہو چکی ہے مگر اب اس کے نسخے دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ قلمی نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدر آباد اور سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔(۱)

۱۳۰ اوراق پر مشتمل تاریخ کی اس مختصر کتاب کا اسلوب نگارش مورخانہ ہے۔ رنگین بیانی اور ادبیت سے دانستہ گریز کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ہم اردو کی اہم ابتدائی تاریخی کتابوں میں شامل کر سکتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۶۰۔

۲-انتخابِ سلطانیہ

تاریخ کی یہ کتاب مسٹر ماروِنٹ رکٹس کی فرمائش پر خلیل علی خاں اشک نے ۱۸۰۵ء میں لکھی، ''انتخابِ سلطانیہ'' کے نام سے اس کی تاریخ تصنیف بھی نکلتی ہے۔(۱) نہ معلوم کن اسباب سے یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہو سکی، ۱۵۳ اوراق پر مشتمل اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں موجود ہے جس کے آخر میں کالج کی مہر بھی ثبت ہے۔(۲)

اس میں دلی کی ابتدائی تاریخ سے شاہ عالم تک کے سلاطین کی تاریخ ہے۔ دلی کی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد سلطان معزالدین شاہ کا ذکر ہے۔ اس کی ہندوستان میں آمد، فتح، نظامِ حکومت اور قطب الدین ایبک کی جانشینی کا احوال ہے۔ اس کے بعد مملوک، خلجی، تغلق، لودی، پٹھان اور مغل بادشاہوں کے حالات اور ان کے عہد کی اجمالی مگر جامع تاریخ ہے۔ یہ پوری کتاب تاریخی ترتیب پر لکھی گئی ہے، ڈاکٹر عبیدہ بیگم لکھتی ہیں:

> ''انتخاب سلطانیہ ہندوستان کے بادشاہوں کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے۔ اشک نے ہر بادشاہ کے ذیل میں اجمال سے اہم واقعات کو درج کیا ہے، اس کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے واقعات، بادشاہوں کے عادات و اطوار، سیاسی حکمت عملی، دانشمندی اور تدبر وغیرہ کی جانب بھی اشارہ کیا ہے''۔(۳)

دوسرے حکمرانوں کے مقابلہ میں مغل حکمرانوں کی تاریخ قدرے تفصیل سے لکھی گئی ہے اور ان کے ذکر میں اشک کا لب ولہجہ بھی زیادہ پُر اعتماد محسوس ہوتا ہے۔ اکبر کا ذکر کرتے ہوئے خلیل علی خاں اشک لکھتے ہیں:

> ''جس سال کہ یہ فرخندہ افعال تخت سلطان پر بیٹھا اسی سال میں دلی اور آگرے سے خبر پہنچی کہ ہیموں لشکر گراں اور فوج بے حد اپنے ساتھ لیے ہوئے دلی میں داخل ہوا چنانچہ سن ہجری نو سو چونسٹھ میں عاشورے کے دن نزدیک پانی پت کے جہاں مرکب عالی تھا آیا اور حضرت جہاں پناہ سے لڑا

۱- قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ ورق ۱۸ بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۱۵۔ ۲- ایضاً۔
۳- ایضاً ص ۵۱۷۔

لیکن شکستِ فاش کھائی"۔(۱)

انتخاب سلطانیہ کی سب سے بڑی خوبی اس کا اسلوبِ نگارش ہے اور یہ مکمل طور پر تاریخی اسلوب ہے۔ اس میں کہیں انشاء پردازی اور رنگین بیانی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ عام اسلوب کی طرح سادہ اور عام فہم ہے، دلی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ابتدائے مطلب اب احوال کو تاریخ کے لکھتا ہوں، اکبر نامے میں مرقوم ہے کہ دلّی قدیم سے بڑی بستی ہے ابتدا میں نام اس کا اندرپت تھا، بکرماجیت کے سن چار سو انتیس میں اننگ پال راجہ نے کہ قوم تونور سے تھا اپنی حکومت میں اس کو آباد کیا اور دلّی نام رکھا"۔(۲)

انتخاب سلطانیہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ خلیل علی خاں اشک نے حالات و واقعات مستند اور مشہور تاریخوں کے حوالوں سے نقل کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ پر ان کی نظر گہری تھی۔ انیسویں صدی کی ابتدائی تصنیف ہونے کے باوجود اس میں تاریخ نویسی کے دو بنیادی اصولوں کا واضح طور پر استعمال ہوا ہے یعنی کتاب میں تحقیق اور صحت وصداقتِ واقعہ پر توجہ دی گئی ہے اور دوسرے اسلوب نگارش بھی تاریخ نگاری کا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ غلام اکبر کی تواریخ بنگالہ، غلام شاہ بھیک کی تواریخ سلاطین، محمد عمر کی تواریخِ عالمگیری اور تصدق حسین کی تواریخ تیموری وغیرہ بھی فورٹ ولیم کالج کی تاریخی مساعی میں شامل ہیں مگر ہماری رسائی ان تک نہیں ہو سکی اس لیے ہم نے صرف ان کے ناموں پر اکتفا کیا ہے۔

تراجم

۱- آرائش محفل

میر شیر علی افسوس نے مسٹر ہارنگٹن کی فرمائش پر منشی سجان رائے بٹالوی کی فارسی تصنیف خلاصۃ التواریخ کے ایک حصے کا ۱۸۰۵ء میں اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام آرائش محفل رکھا۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلاً ۱۸۰۸ء میں مکمل ہو کر اسی سال ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ چونکہ یہ کتاب اردو دانی کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں شامل کر دی

۱- انتخاب سلطانیہ ورق ۱۰۴، بحوالہ سابق۔ ۲- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۱۶۔

گئی تھی اس لیے کلکتہ، لکھنؤ اور لاہور سے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کا قلمی نسخہ ۲۳۷ اوراق پر مشتمل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔(۱)

خلاصۃ التواریخ منشی سجان رائے بٹالوی کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کی مفصل تاریخ معتبر و مستند حوالوں سے قلمبند کی ہے

محققین نے اگرچہ آرائشِ محفل کو خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ بتایا ہے مگر واقعہ ہے کہ خود میر شیر علی افسوس نے اسے اپنی تالیف بتایا ہے۔(۲)

خلاصۃ التواریخ کا انھوں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کا صرف مفہوم ادا کیا ہے اور متعدد مقامات پر حذف و اضافہ بھی کیا ہے، خلاصۃ التواریخ کے علاوہ آئین اکبری سے بھی استفادہ کیا ہے(۳)۔ افسوس نے اپنے وسیع مطالعہ سے بھی اس تصنیف میں کام لیا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم لکھتی ہیں:

> "ہندوستان کے صوبوں کے ذکر میں افسوس نے بہت سی ایسی جگہوں کا ذکر کیا ہے جو خلاصۃ التواریخ میں موجود نہیں مثلاً نارنول، مرزاپور، مرشد آباد، بندر ہوگلی، کلکتہ اور چندن نگر وغیرہ یہ اضافے افسوس کی اپنی معلومات پر مبنی ہیں ان میں انھوں نے کسی تاریخ سے استفادہ نہیں کیا ہے"۔(۴)

ہمارے خیال میں یہ کتاب میر شیر علی افسوس کی تالیف قرار دیے جانے کی مستحق ہے۔ افسوس نے اس دور میں آرائش محفل کے لیے جو محنت کی وہ اس دور کے لحاظ سے ایک زبردست کارنامہ قرار دیے جانے کے لائق ہے۔

آرائش محفل کا چونکہ بنیادی ماخذ خلاصۃ التواریخ اور آئین اکبری ہے جو بذاتِ خود معتبر ہیں اس لیے آرائش محفل کو بھی معتبر و مستند سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس کا اسلوب بیانیہ ہے جو فی الحقیقت تاریخ نگاری کا اسلوب ہے جو سادہ واقعہ نگاری کے اہتمام اور جذبات انگیزی سے احتراز سے عبارت ہے۔ میر شیر علی افسوس نے پوری کتاب میں اسی اسلوب کی پیروی کی ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا خیال ہے کہ آرائش محفل کی نثر موجودہ زمانے کی

۱- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۴۰۔
۲- دیباچہ آرائش محفل ورق ۶ بحوالہ سابق ص ۵۴۱۔
۳- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۴۲۔
۴- ایضاً

نثر کے مماثل نظر آتی ہے۔(۱)

مجموعی طور سے آرائش محفل اردو تاریخ نگاری کے فن میں ایک گراں قدر اضافہ اور میر شیر علی افسوس کا بڑا کارنامہ ہے۔

۲- تاریخ شیر شاہی

یہ عباس خاں شروانی کی فارسی تصنیف تحفۂ اکبر شاہی کے تیسرے طبقے کا اردو ترجمہ ہے۔ تحفہ اکبر شاہی جلال الدین اکبر کی فرمائش پر عباس خاں نے لکھی تھی۔ چونکہ مصنف قریب العصر ہے اس لیے کتاب کی اہمیت معاصر ماخذ کی ہے۔ اس میں شیر شاہ سوری کی ولادت سے وفات تک کے حالات وواقعات بڑی تفصیل سے مورخانہ انداز میں قلم بند کیے گئے ہیں۔

اسے مظہر علی خاں ولا نے کیپٹن ماؤنٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۵ء میں اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کا ایک کرم خوردہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے(۲)۔ جسے ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر سید معین الحق نے ایڈٹ کر کے سلمان اکیڈمی کراچی سے شائع کیا اور یہی مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔

کتاب کے معتبر و مستند ہونے میں شبہ نہیں، البتہ مترجم کا اسلوب نگارش عام فہم نہیں ہے۔ لفظی ترجمہ کیا گیا ہے جس سے بعض مقامات پر عبارت میں ثقالت اور تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "گروہ مغلوں کا جو بادشاہ کے لشکر سے جدا ہو کر کابل کی طرف کو جاتا تھا خواص خاں کو نظر آیا لیکن طاقت جو لڑائی کی نہ رکھتا تھا، نقارہ نشان چھوڑ کر بھاگا خواص خاں نے نشان و نقارہ لیا اور اس منزل سے لشکر روہیلوں کا پھر کر ملازمت میں شیر خاں کی آیا۔ شیر خاں ایک مدت خوشاب میں رہا کہ اسمٰعیل خاں اور فتح خاں اور غازی خاں بلوچ ملازمت میں شیر خاں نے بلوچوں کو فرمایا کہ گھوڑے داغ کو پہنچاؤ، اسمٰعیل خاں نے عرض کیا کہ اور لوگ گھوڑوں کو داغ کریں گے، میں اپنے تئیں داغ کروں گا، شیر خاں خوش ہوا اور اسمٰعیل خاں کو داغ معاف کیا اور ملک سندھ کا اس کے واسطے مقرر ہوا

۱- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۳۴۶۔ ۲- ایضاً ص ۳۱۱۔

دوسرے اور سرداروں کو کہ جن کا مذکور ہوا ہے اور دو پٹھان ملازمت میں شیر خاں کے ہمراہ آئے۔ (تاریخ شیر شاہی ص ۱۰۸)

اس ثقالت کے باوجود یہ کتاب اردو تاریخ نویسی میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

۳- تاریخ آسام

یہ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تصنیف تاریخ آشام (آسام) کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے اردو کا جامہ بہادر علی حسینی نے پہنایا ہے اس کا مخطوطہ ۱۳۹ اوراق پر مشتمل ہے، یہ مخطوطہ خوش خط تو ہے لیکن خستہ اور قدرے کرم خوردہ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے (۱)۔ سید مقیت الحسن نے لکھا ہے کہ یہ ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوا۔ (۲)

یہ اورنگ زیب عالمگیر کے میر جملہ نواب عمدۃ الملک میر محمد سعید کی اس مہم کی مفصل تاریخ ہے جس کا آغاز ۱۶۶۲ء میں ہوا اور جو آسام کی فتح پر ختم ہوئی تھی۔ شہاب الدین طالش اس مہم میں نواب عمدۃ الملک کے ساتھ شریک تھا اس لیے اس نے اس کی پوری تفصیل آسام کی تاریخ کے ساتھ قلم بند کی ہے یہ ایک مقدمہ اور دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں لشکر کے کوچ کا ذکر ہے اور ان اسباب کی تفصیل بھی ہے جن کی بنا پر یہ مہم چھیڑنی پڑی۔ پہلے مقالے میں لشکر کی بہار روانگی، راجہ بیم نرائن کی شکست اور فتح کی روداد ہے۔ ضمناً بہار کا جغرافیہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے الفاظ میں "وہاں کی آب و ہوا، پھلوں، پھولوں اور پیڑ پودوں وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ طرز معاشرت، رسم ورواج اور رہن سہن کا بھی علم ہوتا ہے۔ (۳)

دوسرے مقالے میں آسام کے لیے کوچ اور دوسرے ضمنی سیاسی واقعات لکھے گئے ہیں، ان تمام منصوبوں، حکمت عملیوں کا ذکر ہے جن سے آسام کی فتح میں کامیابی ملی۔ اس مہم کے تمام چھوٹے بڑے واقعات مصنف نے قلم بند کر دیئے ہیں۔ اسی مقالے میں آسام کا جغرافیہ بھی قلم بند کیا گیا ہے جس میں اس کے حدود اربعہ، آب و ہوا، دریا، پھلوں، پھولوں اور باغات وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ آخر میں آسامیوں کی خصوصیات ان کے طرز

۱- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۴۷۔ ۲- کلکتہ کے قدیم مطابع اور ان کی مطبوعات ص ۱۴۴۔
۳- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۴۹۔

معاشرت، رسم و رواج اور بعض سیاسی واقعات کا ذکر ہے، اس طرح اس کتاب میں اس عہد کے آسام کی بیشتر تاریخ کی مرقع آرائی ہو گئی ہے۔

تاریخ آسام کئی امتیازات کی حامل ہے۔ اس کی صحت و صداقت معتبر اور یقینی ہے کیونکہ اس کا مصنف خود اس مہم میں شریک تھا اور اس کی یہ روداد مکمل طور پر چشم دید ہے۔ سید محمد قادری لکھتے ہیں:

> "شہاب الدین طالش خود اس مہم میں شریک تھا اس نے جو حالات و واقعات لکھے ہیں وہ اس کے چشم دید ہیں اور اس لحاظ سے نہایت معتبر و مستند کہے جا سکتے ہیں"۔(۱)

اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں واقعات کے اسباب و علل بھی بیان کیے گئے ہیں اور بہادر علی حسینی کا اسلوب نگارش اپنے عہد کے مطابق سادہ اور عام فہم ہے کہیں کہیں تعقید اور گنجلک عبارتیں بھی آ گئی ہیں مگر یہ خامی بہت کم ہے۔

"تاریخ آسام" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آسام کی سیاسی تاریخ کے ساتھ اس کی تمدنی اور معاشرتی تاریخ بھی لکھی گئی ہے۔

۴-واقعات اکبر

یہ ابوالفضل کی مشہور تصنیف اکبر نامہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنف خلیل علی خاں اشک نے کپتان ولیم ٹیلر کی خواہش پر ۱۸۰۹ء میں اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی، اس کا ۴۸۱ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے۔(۲)

یہ کتاب اگرچہ اکبر نامہ کا ترجمہ ہے تاہم مترجم خلیل علی خاں اشک نے قطع و برید سے بھی کام لیا ہے(۳)۔ حالانکہ مترجم نے اصل متن کے بہت قریب رہنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ترجمہ بہت مغلق اور پیچیدہ ہو گیا ہے، روانی و سلاست نہیں پائی جاتی۔ لیکن مترجم نے کتاب کے جس حصے میں آزادانہ ترجمہ کیا ہے وہ ان کے سادہ اور عام فہم اسلوب کو ظاہر کرتا ہے۔ اردو تاریخ نویسی میں یہ ترجمہ ایک اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ارباب نثر اردو ص ۱۱۴ ۔ ۲- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۲۰ ۵۔

۳- واقعات اکبر ورق ۲-۳ بحوالہ سابق۔

۵- تاریخ نادری

یہ محمد مہدی بن محمد نصیر استر ابادی کی فارسی تصنیف تاریخ نادری کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے فورٹ ولیم کالج کے اہم معنف سید حیدر بخش حیدری نے ۱۸۰۹ء میں ولیم ٹیلر کی فرمائش پر اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس کا خوش خط قلمی نسخہ جو ۴۵۹ صفحات پر مشتمل ہے، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں محفوظ ہے۔(۱)

اس میں نادر شاہ اور اس کے عہد کے ایران کی مفصل تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ پہلے نادر شاہ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے، پھر نادر شاہ سے پہلے کے ایران اور اس کے اطراف کی طوائف الملکوکی کی تاریخ پس منظر کے طور پر پیش کی گئی ہے تاکہ نادر شاہ نے ایران کی ترقی کے لیے جو کاوشیں کیں ان کی اہمیت واضح ہو سکے۔

یہ کتاب ۱۱۳ واقعات پر مشتمل ہے جن سے اس عہد کے بیشتر حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اصلاً یہ نادر شاہ کی سوانح عمری قرار دیے جانے کے لائق ہے۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر عبیدہ بیگم لکھتی ہیں:

> "تاریخ نادری نادر شاہ کے حالات اور اس عہد کے ایران کی بہت مفصل اور ضخیم تاریخ ہے۔ اس میں نادر شاہ کی پیدائش، عقد، اولاد، تخت نشینی، جہانبانی، مبارزات، مہموں اور عادات و اطوار کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ تاریخ نادری سے اس زمانے کے ایران کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس سے علم ہوتا ہے کہ ایران میں سکون و اطمینان کا فقدان تھا۔ حکومت اور اقتدار کے لیے سیاسی کشاکش عروج پر تھی، ارباب حل و عقد سازشوں اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔(۲)

تاریخ نادری کا اصل مصنف محمد مہدی چونکہ نادر شاہ کا وقائع نویس تھا اس لیے اس کے بیانات کو شک و شبہ سے نہیں دیکھنا چاہیے، لیکن اس کی جانبداری بالکل عیاں ہے۔ اس نے نادر شاہ کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور صرف خوبیاں ہی خوبیاں گنوائی ہیں، خامیوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور اگر نادر شاہ کے ظلم و جبر کے واقعات لکھے بھی ہیں تو اس انداز سے کہ اس سے نادر شاہ کے طوفانِ ظلم و جبر کو سند جواز ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

۱- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۲۴۔ ۲- ایضاً ص ۵۲۶۔

اردو ترجمہ میں حیدری کا اسلوب نگارش پیچیدہ اور مغلق ہے، انھوں نے زبان و بیان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ جوں کا توں لفظی ترجمہ کر دیا ہے جس سے اردو کے بجائے فارسی کا دھوکہ ہوتا ہے۔(۱)

اس کے باوجود یہ کتاب اپنے عہد کی اہم تاریخ ہے۔ سید محمد قادری نے درست لکھا ہے کہ "یہ کتاب حیدری کا نہایت ہی قابل قدر کارنامہ ہے، اردو زبان کا دامن اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی ایسی علمی اور اہم کتابوں سے بہت کچھ خالی ہے"۔(۲)

۶- جہانگیر شاہی

یہ فارسی تاریخ اقبال نامہ جہانگیری کا اردو ترجمہ ہے جو مظہر علی خاں وِلاؔ کے قلم سے ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوا۔ اس میں جہانگیر کے بائیس سالہ دورِ حکومت کی تاریخ ہے۔ مظہر علی خاں ولا کا اسلوب نگارش مورخانہ ہے، البتہ کہیں کہیں سادہ عام فہم اسلوب کے بجائے انشاء پردازی اور رنگین بیانی بھی در آئی ہے۔ ولا نے رزم و بزم دونوں کا بہت عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی ایک خوبی جزئیات نگاری ہے۔ مترجم نے چھوٹی بڑی ہر طرح کی چیزیں ہو بہو پیش کر دی ہیں۔

۷- اقبال نامہ

یہ منشی غلام حسین کی فارسی تصنیف سیر المتاخرین کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ ہے جسے سید بخشش علی فیض آبادی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ اب تک اشاعتِ عام سے محروم ہے۔ اس کا مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے جو خستہ اور کرم خوردہ ہے۔ اسے سید بخشش علی نے ۳۰/اپریل ۱۸۲۵ء میں کمپنی سرکار میں داخل کیا تھا ظاہر ہے کہ یہ اس سے پہلے مکمل ہوا ہوگا۔

اس کتاب کا آغاز سراج الدولہ کے احوال سے ہوا ہے اور اس کے بعد سیاسی و جنگی واقعات اور اس کی شہادت کے واقعات بیان ہوئے ہیں، نیز انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی اور فہم و ذکا کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔ میر جعفر کی غداری اور مسند نشینی کا حال بھی قلم بند کیا ہے، میر قاسم پر انگریزوں کی فتح، شجاع الدولہ کی انگریزوں سے جنگ و صلح، بنگال پر نجم الدولہ کی مسند

۱- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۲۹۔ ۲- ارباب نثر اردو ص ۱۷۔

نشینی، انگریزوں کی مداخلت، نجم الدولہ کی موت اور سیف الدولہ کی مسند نشینی اور اس کی وفات وغیرہ کا احوال بہت تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔

بنگال کی تاریخ پر یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں بعض خامیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً اس میں انگریزوں کی شجاعت و بہادری اور ان کے عدل و انصاف کے بہت سے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی مدح میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی ہے لیکن ظاہر ہے طاقتور آقاؤں کی موجودگی میں یہ خلاف دستور بھی نہیں۔

فنِ تاریخ نگاری کے لحاظ سے اس میں کئی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً تاریخ و تہذیب کے مختلف النوع واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم لکھتی ہیں:

> "اقبال نامہ کے تاریخی واقعات میں تسلسل ہے۔ اہم تاریخی ہستیوں کے ذکر کے علاوہ درمیان میں جو بھی چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوئے اور جو تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں ان سب کا ذکر موجود ہے۔ سیاسی اور جنگی کارروائیوں، مبارزات اور سیاسی چشمکوں وغیرہ کا حال بہت دلچسپ اور آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ نوابوں کی سیرتوں اور عادات واطوار پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔(۱)

اقبال نامہ کا اسلوب نگارش خالص مورخانہ ہے۔ اس میں انشاء پردازی اور رنگین بیانی سے قطعی کام نہیں لیا گیا، اس لحاظ سے یہ تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے۔

۸- شاہ نامہ ہندی

یہ کتاب توکل بیگ کی فارسی تصنیف شمشیر خانی کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم محمد علی فورٹ ولیم کالج سے وابستہ نہیں تھے بلکہ یہ ترجمہ بقول انہی کے "انگریز بہادر کی سرکار معدلت آثار سے فیضیاب ہونے کے لیے کیا تھا"۔ محمد علی کا یہ کارنامہ اب تک زیور طباعت سے محروم ہے۔ اس کا قلمی نسخہ جو ۳۸۱ اوراق پر مشتمل ہے، ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے۔(۲)

شاہنامہ فردوسی محتاج تعارف نہیں۔ اس نے ایران کو زندہ کیا۔ اس کے اردو ترجمہ واختصار نے وہ مقبولیت حاصل نہیں کی جو اصل کتاب کو ملی، مگر یہ اختصار شاہ نامہ فردوسی کے

۱- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۵۷۔ ۲- ایضاً ص ۵۵۳۔

مقابلہ میں تاریخی نوعیت سے زیادہ جامع ہے، اس سے ایران کے شاہان سلف کے مختلف قسم کے حالات کا علم ہوتا ہے اور یہ خوبیاں محمد علی کے اردو ترجمہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

شاہنامہ ہندی کا اسلوب سادہ سلیس اور رواں ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"سکندر نے خضر سے کہا، میرے پاس دو لعل ہیں ایک کی یہ خاصیت ہے کہ سانپ بچھو اور جو کوئی جانور کاٹنے والا ہوئے اس لعل کی دہشت سے آدمی کے گرد نہیں آتا اور دوسرا لعل شب چراغ ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ چراغ کی طرح روشنی دیتا ہے۔ ایک لعل میرے پاس رہے ایک تیرے پاس رہے۔ خضر لعل شب کو لیے ہوئے سکندر کے آگے آگے جاتے تھے، دو رات دن راہ چلے، تیسرے دن دوراہے میں پڑے خضر نے ہر چند پکارا سکندر کے لشکر نے نہ سنا"۔(۱)

شاہنامہ ہندی کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کا اسلوب تحریر مورخانہ ہے مگر اس میں تاریخ نویسی کا فن ترقی کرتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ مثلاً جنگوں کے واقعات تو معرکہ آرائیوں کے اسلوب میں لکھے گئے ہیں، لیکن تہذیب و ثقافت کے بیان میں مترجم کی زبان جدا ہو جاتی ہے۔ شاہنامہ ہندی کے نام کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔

۹- تاریخ بہمنی

یہ تاریخ فرشتہ کے اس باب کا اردو ترجمہ ہے جس میں بہمنی سلاطین کا ذکر ہے۔ یہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا اس کی مزید تفصیلات بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔

فورٹ ولیم کالج کا خاتمہ

فورٹ ولیم کالج کلکتہ اگرچہ قانونی طور پر ۱۸۵۴ء میں ختم کیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی علمی سرگرمیاں ۱۸۳۰ء سے پہلے ہی سرد پڑ چکی تھیں۔ اس مختصر سی مدت میں اس نے اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی اور خاص طور سے تاریخ کا ایک وسیع علمی سرمایہ مہیا کیا۔

۱- شاہنامہ ہندی، ورق ۳۸۰ بحوالہ سابق ص ۵۵۴۔

مرحوم دہلی کالج کی تاریخی خدمات

انیسویں صدی عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ جس وقت اپنی علمی وادبی خدمات کے آخری دور میں تھا اور اس کی رونق ماند پڑ رہی تھی اسی زمانہ میں دہلی میں دہلی کالج کے ذریعہ علمی وادبی کاموں کا آغاز ہوا، گویا کلکتہ کی علمی رونق دلی میں منتقل ہو گئی۔

دہلی کالج ابتداً ایک مدرسہ تھا جسے نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی نے ۱۷۹۲ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں اسے انگریزوں نے دہلی کالج میں اس مقصد سے تبدیل کیا کہ ہندوستانیوں کو اردو زبان کے ذریعہ جدید علوم یعنی ادب اور سائنس کی تعلیم دی جائے(۱)۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے کالج کی طرف بڑی توجہ دی اور کالج نے آہستہ آہستہ بڑی ترقی کی۔ جدید علوم وفنون کی تعلیم وتربیت کے ساتھ کتابوں کے ترجمہ وتالیف کے لیے ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ کتابوں کی طبع واشاعت کے لیے ایک مطبع، مطبع العلوم قائم ہوا۔ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف اور ترجمہ کے لیے قدیم علوم کے ماہرین کے ساتھ جدید علوم وفنون کے ماہرین کا کالج میں تقرر کیا گیا۔ غرض مذکورہ سعی وکوشش سے یہ کالج جدید علم وفن کا مرکز قرار پایا۔(۲)

ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے علم وفن کی بڑی خدمت کی اور تقریباً ۱۲۸ کتابیں وابستگان کالج کے ذریعہ ترجمہ وتالیف ہو کر شائع کی گئیں جن میں مختلف موضوعات کی نصابی کتابیں شامل ہیں۔ چونکہ جدید علوم میں تاریخ کو بھی شامل کیا گیا تھا اس لیے دوسرے علوم مثلاً سائنس وریاضی کی طرح تاریخ کی بھی متعدد کتابیں یہاں لکھی اور ترجمہ کی گئیں۔ دہلی کالج کی تاریخی تصانیف کا یہاں ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱- واقعات ہند

یہ دہلی کالج کے اہم مصنف مولوی کریم الدین صاحب کا کارنامہ ہے۔ اسے انھوں نے کپتان فلر کے حکم سے اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ انگریزی کی کئی کتابوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں ہندوستان کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ ۱۸۶۴ء میں سرکاری مطبع لاہور سے شائع ہوئی۔(۳)

۱- بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم دہلی کالج ص ۵۴۔ ۲- تفصیل کے لیے دیکھیے مولوی عبدالحق کی کتاب اور دلی کالج میگزین کا قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ھ۔ ۳- قدیم دلی کالج ص ۱۲۷-۱۲۸۔

یہ کتاب راقم الحروف کی نظر سے گذری اور نہ یہ علم ہی ہو سکا کہ اس کا مخطوطہ یا مطبوعہ نسخہ کہاں ہے۔

۲- تواریخ انگلستان

یہ گولڈ اسمتھ کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ دلی کالج کے کئی مدرسین کی مشترکہ کوششوں سے یہ اردو میں ترجمہ کی گئی اور ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس ترجمہ کی اہمیت اس لحاظ سے سوسائٹی کی دوسری تصانیف سے زیادہ ہے کہ اس میں اصطلاحات کے بھی ترجمے کیے گئے ہیں۔ اردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، اس کا اسلوب نگارش تاریخی نثر جیسا محسوس ہوتا ہے۔(۱)

۳- تاریخ ابوالفداء

یہ مشہور اسلامی مؤرخ ابوالفداء کی تاریخ کی پہلی، دوسری، چوتھی اور پانچویں جلد کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے بھی مولوی کریم الدین صاحب نے اردو میں منتقل کیا۔ ۱۸۴۷ء میں اشرف علی کے اہتمام میں مطبع، مطبع العلوم سے شائع ہوئی۔ ترجمہ اصل کتاب کا مرہون منت ہے، البتہ اس کی زبان آسان، عام فہم اور تاریخی نثر جیسی ہے۔(۲)

۴- رسوم ہند

یہ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین کی تصنیف ہے۔ ابتدائی نصف حصہ کالج کے دوسرے اہم مدرس ماسٹر پیارے لال کے قلم سے ہے۔ اس کتاب کا ایک اول و آخر کرم خوردہ نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس میں ہندوستان خصوصاً ہندوؤں کی مختلف ذاتوں کا بیان ہے۔ زبان و بیان علمی ہے، ناولوں اور داستانوں کا اثر اس میں نہیں پایا جاتا۔

۵- تاریخ ایران

یہ کوندر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے ماسٹر حسینی نے اردو کا جامہ پہنایا، اس کے

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے دلی کالج میگزین کا قدیم دلی کالج نمبر مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ۱۹۵۳ء ص ۱۳۲-۱۳۳۔

۲- ایضاً ص ۷۲ و تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ۸ اردو ادب حصہ سوم ص ۹۶۔

ترجمہ میں نور محمد نے بھی حصہ لیا۔

۶-تزکِ تیموری

اسے مولوی سبحان بخش نے اردو میں ترجمہ کیا۔

۷-ابنِ خلکان

یہ کتاب مشہور اسلامی مورخ ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان کے بعض حصوں کا ترجمہ ہے، اس سے زیادہ اس کی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

۸-دربار قیصری

یہ بھی کسی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے ماسٹر پیارے لال آشوب نے اردو میں منتقل کیا۔

۹-تاریخِ بنگال

اسے مولوی سبحان بخش نے اردو میں منتقل کیا۔

۱۰-تاریخِ آگرہ

یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی، صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اسے مولوی کریم الدین صاحب نے قلم بند کیا تھا۔

۱۱-قصصِ ہند

یہ کتاب ترجمہ نہیں بلکہ ماسٹر پیارے لال آشوب کی طبع زاد تصنیف ہے اور تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں تاریخ ہند کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی تاریخ کی متعدد کتابیں ترجمہ کی گئیں، جن کی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱-تاریخ ہند (زمانۂ قدیم سے زمانۂ حال تک)(۱) ۲-تاریخ اسلام ۳-تاریخ یونان

۱-اس کتاب کا ایک نسخہ بلرام پور کالج کی لائبریری میں موجود ہے جو ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی صاحب کی نظر سے گذرا ہے۔ یہ اصلاً جان کلارک مارسمن کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی۔ تواریخ ریسلاس) حاشیہ ص۵۹۔

۴- تاریخِ روما ۵- تاریخِ مغلیہ (تیمور سے شاہ عالم تک) ۶- تاریخ کشمیر ۷- مختصر خاکہ تاریخ عالم ۸- حالاتِ ہندوستان ۹- تاریخ مسعودی ۱۰- تاریخ چارلس وغیرہ۔(۱)

چونکہ یہ کتابیں نصابی ضرورت کے پیش نظر لکھی اور ترجمہ کی گئیں اس لیے قدرتاً ان کا اسلوب عام فہم ہے۔ ان میں رنگین بیانی نہیں پائی جاتی، البتہ فورٹ ولیم کالج کے مقابلے میں ان تاریخی کتابوں میں داستانوں اور افسانوں کے برخلاف علمی زبان کا استعمال زیادہ ہوا ہے جو ظاہر ہے اردو زبان کی بتدریج ترقی کا نتیجہ ہے۔ یہ کتابیں تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے اپنے اصل متن کی مرہون منت ہیں اور جو کتابیں طبع زاد ہیں ان میں بھی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی واقعہ غلط درج نہ ہو جائے۔ یہ کتابیں اگر دستیاب ہوتیں تو ان کا تحقیقی جائزہ لے کر دیکھا جا سکتا تھا کہ معیارِ تاریخ پر وہ کتنی پوری اترتی ہیں۔

دلّی کالج کے وابستگان میں ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاء اللہ نے فنِ تاریخ کی بڑی خدمت کی، خصوصاً منشی ذکاء اللہ تو ایک بڑے مؤرخ کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ تاریخ ہندوستان ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہاں مختصراً دونوں کی تاریخی خدمات کا ایک اجمالی مرقع پیش کیا جاتا ہے۔

۱- ماسٹر رام چندر

ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے ایک اہم استاد اور اردو زبان کے بڑے خدمت گذار تھے۔ انھوں نے علم و فن خصوصاً فنِ تاریخ کی بڑی خدمت انجام دی۔ وہ اگرچہ کسی مستقل تاریخی کتاب کے مصنف نہیں ہیں، تاہم ان کے تاریخی مضامین کی حیثیت کسی تصنیف سے کم نہیں۔ ان کے رسالہ فوائد الناظرین (جو پہلے ماہنامہ تھا پھر پندرہ روزہ ہو گیا تھا) کے ہر شمارہ میں تاریخی مضامین خود ماسٹر رام چندر کے قلم سے ہوتے تھے، ان میں خصوصیت سے سلاطین ہند اور شاہانِ مغلیہ کے حالات ہوتے تھے۔ ان مضامین نے اس دور میں تاریخ کا مذاق عام کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ایک مضمون میں انھوں نے علمِ تاریخ کے فوائد بھی بیان کیے۔(۲)

ماسٹر رام چندر نے تاریخی مضامین میں تاریخی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس میں نہ رنگین بیانی ہے اور نہ زورِ تحریر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ممتاز منگلوری نے لکھا ہے

۱- مرحوم دہلی کالج ص ۱۲-۱۲۸۔ ۲- صدیق الرحمن قدوائی ماسٹر رام چندر ص ۱۵۱۔

کہ "ترجمہ و تاریخ میں ماسٹر رام چندر کو منشی ذکاء اللہ پر تقدم حاصل ہے۔(۱)

۲- منشی ذکاء اللہ

منشی ذکاء اللہ دلی کالج کے نامور فرزند ہیں، انھوں نے علم و فن کی بڑی خدمت کی۔ یہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی کتابوں کا تعلق مختلف موضوعات مثلاً مذہب، تاریخ، جغرافیہ اور حساب وغیرہ سے ہے، مگر ان کا اصل میدان فن تاریخ ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں کی تعداد سترہ ہے، ان میں جیسا کہ اوپر آچکا ہے، تاریخ ہندوستان جو پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ان کی تصنیف آج ہندوستان کی تاریخ کا بڑا معتبر سرمایہ ہے۔ بحیثیت مؤرخ ان کی زبان تاریخی اسلوب کی حامل ہے اور اصولِ تاریخ نویسی کا بھی انھوں نے بڑا خیال رکھا ہے۔

غرض یہ کہ اردو میں تاریخ نویسی کی جو روایت رستم علی بجنوری کے ذریعہ شروع ہوئی تھی، اسے فورٹ ولیم کالج کے بعد سب سے زیادہ دلی کالج میں فروغ حاصل ہوا اور اس کے مصنفین نے اس روایت کو مزید ترقی دی۔

اس دور کی چند انفرادی تاریخی کاوشیں

انیسویں صدی میں ملک کے دوسرے علاقوں کے اہلِ قلم نے بھی انفرادی طور پر تاریخ پر توجہ کی اور اردو خزانے میں تاریخی ادب کا اضافہ کر کے اس کو مزید پروان چڑھایا۔ یہاں معلوم انفرادی تاریخی کوششوں کا ایک تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱- تاریخ فیروز شاہی

یہ مشہور و معروف کتاب محتاجِ تعارف نہیں۔ ضیاء الدین برنی کا یہ زندہ جاوید کارنامہ ہے، اردو میں اب تک اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ زیر نظر ترجمہ و تلخیص سر ہنری لوئس کی خواہش پر وارث علی بن شیخ بہادر کی قلم سے ہے جو باعتبار زمانہ سب سے قدیم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ اسے قطعی طور پر اٹھارہویں صدی عیسوی کی تصنیف قرار نہیں دیا جاسکتا۔(۲)۔ یہ ترجمہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرا۔ ڈاکٹر جاوید علی خاں نے

۱- تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند ج ۸، اردو ادب سوم ص ۹۳-۹۴۔

۲- تاریخ ادب اردو جلد دوم ص ۱۰۴۷۔

لکھا ہے کہ ترجمہ آسان زبان میں ہے، مگر اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔(۱)

۲- تاریخِ سرنگاپٹم

یہ فارسی کتاب تاریخِ حیدری کا اردو ترجمہ ہے جسے منشی محمد قاسم نے کرنل ماکھی کی فرمائش پر اردو کا جامہ پہنایا۔ اس ترجمہ کو حیدر آغا نے ۱۸۰۱ء میں مرتب کیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ سرنگاپٹم کی تاریخ ہے۔ اس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہید کے حالات و کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ حیدری ایک معیاری کتاب ہے مگر مصنف نے قدرے جانبداری سے کام لیتے ہوئے حیدر علی اور ٹیپو کا تذکرہ بڑے آب و تاب اور تقدس کے ساتھ کیا ہے اور مخالفین کے ذکر میں کوتاہ قلمی سے کام لیا ہے۔

ترجمہ کا اسلوبِ نگارش قدرے نامانوس ہے، زبان دکنی ہے اور کنڑ زبان کے بعض الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔(۲)

۳- کیفیات اسمہائے راجگان و بادشاہانِ دہلی

یہ میر ہاشم علی حسینی کی طبع زاد تصنیف ہے۔ اسے انھوں نے ۱۸۰۲ء میں قلم بند کیا۔ اس میں تومان راجپوت سے لے کر مغل حکمران اکبر شاہ ثانی تک یعنی مصنف کے عہد تک کے حالات و واقعات ہیں۔ یہ انیسویں صدی کی ابتدا میں لکھی جانے والی ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں میر ہاشم علی نے سیاسی حالات کے ساتھ معاشرتی اور جغرافیائی حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ مختلف شہروں کے درمیان کی مسافت لاہور، کابل، قندھار، غزنی، کشمیر، ملتان، ٹھٹھ، گجرات اور اجمیر وغیرہ کی سرحدوں کا بھی تذکرہ ہے۔ شہر کے حالات اور ان کے قدیم ناموں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

حکمرانوں کے علاوہ شہزادوں، امراء و رؤساء کے القاب و خطابات اور ان کے مختصر حالاتِ زندگی کو بھی تحریر کیا ہے۔ بعض حکمرانوں کے سکوں کے بارے میں معلومات درج کی گئی ہیں۔ ملکی سکوں کے علاوہ استنبول، عراق، خراسان، بلخ، بخارا کے سکوں کا بھی ذکر ہے۔

۱- Beginnings of Historical Writings in Urdu, Journal of the Pakistan Historical society January 1994Vol. II P.30-31.

۲- بحوالہ بالا۔

غرض یہ کہ یہ کتاب سیاسی حالات وواقعات کے ساتھ تہذیبی وتمدنی اور معاشرتی حالات بھی بہم پہنچاتی ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ کی ایک اہم کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ زبان دکنی اردو جیسی ہے۔

۴- عبرت نامہ

یہ مولوی خیر الدین صاحب کی تصنیف ہے، ۱۸۰۶ء میں مکمل ہوئی۔ یہ تیمور سے شاہ عالم تک کی تاریخ ہے۔ ابتدائی پچیس صفحات میں تیمور سے احمد شاہ تک کی تاریخ ہے۔ بقیہ کتاب عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کے حالات میں ہے۔ اس دور کے اہم واقعات کے علاوہ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی مؤرخ نے بیان کیے ہیں۔ آخر میں غلام قادر خاں کی سفاکیوں کی داستان ہے۔ یہ کتاب پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔(۱)

۵- عماد السعادت

یہ سید غلام نقوی کی تصنیف ہے، ۱۸۰۸ء میں کرنل بیلی کی فرمائش پر لکھی۔ اس میں نواب علی خاں تک کے اودھ کے حالات و واقعات ہیں اور درّانیوں، افغانیوں، مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کا بھی ذکر ہے۔ غلام علی نقوی کی ایک اور کتاب "نگار نامۂ ہندی" بھی بتائی جاتی ہے جس میں پانی پت کی اس جنگ کی جو بابر اور ابراہیم لودی کے درمیان ہوئی تھی، تفصیل ہے اور ضمناً افغانوں کے تنازعات بھی بیان ہوئے ہیں۔(۲)

۶- تاریخ عروجِ اسلام

یہ کسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، ۱۸۱۳ء میں مکمل ہوا۔ سید زوار حسین نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ۳۶ جلدوں میں ہے(۳)۔ اس کی مزید تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

۸،۷- تفریح العمارات، احوال شہر اکبر آباد

یہ دونوں کتابیں آگرہ کے مجسٹریٹ کلکٹر اور آگرہ کالج کے سپرنٹنڈنٹ جیمس اسٹیفن لو سنگٹن کی ہدایت پر ۱۸۲۵ء میں آگرہ کالج کے دو طالب علموں نے لکھی۔ اس میں آگرہ کی تاریخی عمارتوں، مسجدوں، مقبروں اور باغوں وغیرہ کا احوال ہے۔(۴)

۱- اودھ کے تاریخ نگار ص ۲۵۹۔ ۲- ایضاً ص ۱۳۶۔ ۳- مصنفین اردو ص ۲۰۸۔
۴- شریف حسین قاسمی، مقدمہ سیر المنازل ص ۹۔

۹- تاریخِ ممالکِ چین

یہ کتاب انیسویں صدی کی ایک اہم تصنیف ہے اور ایک انگریز جیمز کارکرن کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۴۲ء میں لکھی گئی یہ کتاب بڑی تقطیع میں دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد ۷۱۶ صفحات کی ہے۔ اس میں تین دفتر (باب) اور ۳۳ ابواب (فصلیں) ہیں اور ۴۴ صفحے کا اشاریہ ہے جو انگلش میں ہے۔ دوسری جلد ۴۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دو دفتر (باب) اور ۳۲ ابواب (فصلیں) ہیں۔ اس میں طوفانِ نوحؑ کے بعد سے ۱۸۴۲ء یعنی مصنف کے عہد تک کے چین کے حالات ہیں۔ یہ دونوں جلدیں مطبع پادری طامس صاحب کلکتہ سے علی الترتیب ۱۸۴۲ء-۱۸۵۲ء میں شائع ہوئیں۔

مصنف نے چین اور اس کی مختلف ریاستوں کی سیاسی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور جغرافیائی تاریخ لکھی ہے۔ چین کے مختلف ادوار اور شاہانِ چین کے مختلف خانوادوں کا تفصیلی تذکرہ اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیلی تاریخ ہے۔ تاریخ نویسی کے لحاظ سے یہ کتاب بڑی خوبیوں کی حامل ہے۔ اس میں چین کے ہر طرح کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ چین کی تاریخ پر اتنی مفصل کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی، یہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

میر حسن نے اسے انگریزی کتاب کا ترجمہ قرار دیا ہے(۱)۔ مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اصل اردو کتاب میں مترجم کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ جیمز کارکرن کی انگریزی تصنیف ہی کا کہیں ذکر ہے۔ خود میر حسن نے بھی انگریزی کتاب کا نام نہیں لکھا ہے۔

۱۰- فتح گڑھ نامہ

فروری ۱۸۴۶ء میں کالے رائے ڈپٹی کلکٹر ضلع فرخ آباد نے تواریخ ضلع فرخ آباد لکھی جو فتح گڑھ نامہ کے نام سے معروف ہے۔ اسے ۱۸۴۹ء میں محمد حسین نے مطبع اودھ اخبار دہلی سے پنڈت موتی لعل کی تصحیح و مقابلہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے کالے رائے لکھتے ہیں:

۱- مغربی تصانیف کے اردو تراجم ص ۵۱۔

"اس عرصہ میں بسبب کثرت کام سرکاری کے اور مصروف رہنے امور متعلقہ ترمیم بندوبست وغیرہ از بس عدیم الفرصتی مجھ کو رہی، مگر اس تقریب دورہ و بندوبست میں ہر ایک پرگنہ و دیہہ متعلقہ اس ضلع کو دیکھا، جو کچھ حال میرے معائنہ اور دریافت میں آیا اور بعض مراتب متعلقہ انتظام ضلع کے ایسے تھے کہ ان کے قلمبند رہنے سے امور سرکار میں باعث مدد تھا، ان کو اپنی یادداشت کے واسطے قلمبند کرتا گیا اور میرے والد بزرگوار کو زائل کہ از بس صاحب علم و شائق تواریخ ہیں ان کی فرمائش مجھ پر واسطے تحریر حال اس ضلع کے ہوئی تو یکایک میری طبیعت اس بات پر راغب ہوئی کہ اگر یہ سب کوائف بطور کتاب ترتیب ہو جاوے اس سے فائدہ تام حاصل ہو۔ خصوصاً جس کسی کو اس ضلع سے تعلق ہے اس کے بہت کار آمد ہو سکتا ہے۔(۱)۔

یہ کتاب چار ابواب اور ۴۸ دفعات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں فرخ آباد کا مفصل جغرافیہ لکھا ہے۔ اتنی تفصیل سے غالباً کسی اور کتاب میں فرخ آباد کا جغرافیہ مذکور نہیں۔ دوسرے باب میں عمل دارانِ فرخ آباد کا ذکر ہے، اس میں ہندو اور راٹھور عملداروں کے علاوہ قنوج کے راجاؤں، نوابوں اور برطانوی عہد کے کلکٹروں کے حالات اور ان کے عہد کی تاریخ ہے۔ تیسرے باب میں فرخ آباد کے قصبات و مواضعات اور پرگنوں کی تاریخ ہے، اس میں ان کی آبادیاں، رقبے، نام اور ان کی وجہ تسمیہ وغیرہ کی تفصیلات اور ان کے نقشے درج ہیں۔ چوتھے اور آخری باب میں فرخ آباد کے مختلف محکموں کا ذکر ہے۔ سرکاری انتظامات کی تفصیل اور کاشت کاری وغیرہ کے طریقے اور ان کے انتظامات کا بھی ذکر ہے، آخر میں فرخ آباد کے ان متفرق اور عجیب و غریب واقعات کا ذکر ہے جو عہدِ ماضی میں وقوع پذیر ہوئے۔

بڑی تقطیع پر ۲۰۸ صفحات کی یہ کتاب انیسویں صدی کے نصف اول کے آخر میں اردو میں لکھی جانے والی تاریخ کی اہم کتاب اس لیے قرار دی جا سکتی ہے کہ اس میں جس قدر تاریخی تفصیلات اور ایک ایک جزیے کا ذکر ہے وہ بے مثال ہے۔ تاریخ میں جن امور کی ضرورت و اہمیت کا ذکر بیسویں صدی میں محسوس ہوا وہ سب اس میں موجود ہیں۔ مثلاً سیاسی، تہذیبی، تمدنی تاریخ کے علاوہ جغرافیائی کوائف اور معاشرتی احوال بھی ہیں نیز فرخ آباد کے

۱۔ فتح گڑھ نامہ تمہید ص د۔

مواضعات، قصبات اور پرگنہ جات، رہن سہن، گفتگو، زبان، لباس وغیرہ کا تفصیل سے ذکر ہے، ان کے نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ مدارس اور اسکولوں کا بھی ذکر ہے، غرض تاریخ کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔

اس کے معتبر و مستند ہونے میں اس لیے شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مصنف اسی ضلع کا کلکٹر تھا اور اس نے اپنے اثر و رسوخ سے سارے مآخذ و دستاویزات کا بچشم خود مطالعہ و مشاہدہ کر کے یہ مفصل کتاب لکھی۔ اس کا اسلوب تحریر تاریخی نثر جیسا ہے۔ ایک اقتباس جس میں دریائے رام گنگا کا ذکر ہے ملاحظہ ہو:

> "پرگنہ امرت پور میں ہو کر ملک شاہ اودھ میں نکلی ہے۔ اس دریا پر اکثر عبور کشتی سے ہے اور ایام برسات میں اس دریا کی طغیانی اس کثرت سے ہوتی ہے کہ زمین اکثر دریا برد ہو جاتی ہے اور اس کی ترائی میں زراعت خوب ہوتی ہے، اور آب پاشی کا یہی فائدہ ہے اور یہ دریا کوہستان سے ضلع بجنور، مراد آباد و بریلی و شاہجہاں پور میں بہتا ہوا آیا ہے فقط اور اس ضلع میں اس دریا پر کشتیوں کا پل دو جگہ ہے ایک امباپور دوسرا بجنوریا مابین باقی سب گذر پر ایک ایک دو کشتی ہے اور دو گھاٹ کہ جس پر پل ہی میر بحری ہے۔(۱)

۱۱-زبدۃ التواریخ

یہ عالم علی کی تصنیف ہے، اسے انھوں نے ۱۲۷۰ھ / ۵۴-۱۸۵۳ء میں مکمل کیا اور مطبع نجم السعادۃ محلہ حیدری باغ کلکتہ میں طبع ہوئی۔ اس میں بکرمادتیہ قدیم ہندو عہد سے لے کر ۱۸۵۰ء تک کی تاریخ مختصراً لکھی گئی ہے، تاریخ کے موضوع پر یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے کتب خانہ میں موجود ہے، زبان و بیان اور اسلوبِ تحریر سادہ اور مورخانہ ہے، تاریخ نویسی میں یہ کتاب بھی ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

۱۲-یادگارِ بہادری

یہ کتاب لالہ بہادر سنگھ کے قلم سے ہے، ۱۸۷۹ء میں لکھی گئی۔ اس میں بقول انور حسین اکبرپوری تمام دنیا کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے، ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی (۲)۔ اس کی

۱- فتح گڑھ نامہ ص ۲۶۔ ۲- اودھ کے تاریخ نگار ص ۲۳۹۔

مزید تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب اور تاریخ

۱۸۵۷ء میں ملک کی آزادی کی پہلی جدوجہد اس صدی کے ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے جسے غدر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس جدوجہد آزادی کے متعلق اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، مثلاً فضل حق خیر آبادی کی باغی ہندوستان اور پنڈت سندر لال کی کتاب سن ستاون وغیرہ اس سلسلہ کی اہم ترین کتاب سر سید احمد خاں کی اسباب بغاوت ہند ہے۔

اس انقلاب کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ انگریزوں نے ملک پر مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد سبق پڑھانا شروع کیا کہ ہم ہی حکمرانی کے لائق ہیں اور اس سے پہلے جتنے حکمراں ہوئے ہیں وہ سب ظالم و جابر تھے۔ ان کے اس رویے نے ہندوستانی مفکرین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگریزوں کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید میں قلم اٹھائیں۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد متعدد ایسے مؤرخین پیدا ہوئے جنھوں نے انگریزوں کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید کی اور اصل حقیقت لوگوں پر آشکارا کی۔ ان مصنفین میں علامہ شبلی کا نام سب سے زیادہ روشن ہے۔

منشی نول کشور اور ان کی تواریخِ نادر العصر

اسی صدی میں اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں منشی نول کشور نے اپنا مطبع قائم کیا جس نے اپنی بے مثال مذہبی و علمی مطبوعات کے ذریعہ شہرتِ دوام حاصل کی۔ تاریخ کے موضوع پر بھی اس نے متعدد (نصابی و غیر نصابی) اہم کتابیں شائع کیں، خود منشی نول کشور نے تواریخِ نادر العصر لکھی جو ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تفصیل سے لکھنؤ کے نوابوں کے عہد کی تاریخ بیان کی گئی ہے، شاہانِ اودھ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ان کی تہذیبی و تمدنی تاریخ بھی اس میں آگئی ہے۔ آخر میں باشندگان لکھنؤ کا تذکرہ ہے، اودھ کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ پہلی اشاعت کے بعد یہ کتاب کمیاب تھی، جناب عابد رضا بیدار صاحب نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے ۱۹۹۰ء میں اسے دوبارہ شائع کر کے تاریخ کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

۱۳- تاریخ سوانحات سلاطین اودھ

تاریخ کی یہ اہم کتاب سید کمال الدین حیدر کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۷۹ء میں مطبع نول کشور سے مہاراجہ سر دگیجے سنگھ کے اہتمام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ دوسرے ایڈیشن میں دوسری جلد قیصر التواریخ کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شاہانِ اودھ کی مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ اپنے موضوع پر یہ پہلی اور بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ گرامی قدر ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی نے درست لکھا ہے کہ اودھ کی تاریخ لکھتے وقت کوئی مورخ اس کاوش کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔(۱)

تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اہم ہے، مہاراجہ سر دگیجے سنگھ نے اس کے صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے (۲)۔ خود سید کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ:

> "... چنانچہ عنوانِ کتاب موافق دستورِ انگریزی کیا ہے، کسی کی خوشامد یا تعریف زائد نہیں جیسا بعض مورخین زمانہ کرتے ہیں محض حقیقت حال مثل اخبار اپنی رسائی تحقیق سے لکھا ہے۔(۳)

سید کمال الدین حیدر کا اسلوب نگارش علمی و ادبی ہے البتہ بعض مقامات پر قدیم اردو کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ مجموعی طور سے یہ کتاب اردو کی بہترین اور سب سے زیادہ معیاری تاریخ ہے۔

انیسویں صدی کے نصف اول کی ان انفرادی کوششوں نے تاریخ نگاری کے رجحانات اور معیار کو بلند کرنے کی جہت میں بڑی خدمات انجام دیں اور تاریخ نگاری کو بلند مقام تک پہنچانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

سر سید احمد خاں کی خدماتِ تاریخ

اسی صدی میں سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نے تاریخ کی طرف خاص توجہ دی اور کئی اہم اور گراں مایہ کتابیں قلمبند کیں اور تاریخ کی تین اہم کتابوں کو ایڈٹ بھی کیا اس دور میں انفرادی حیثیت سے یقیناً یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے نہ صرف تاریخ نگاری کی

۱- تواریخ (ریبلاس) ص ۵۹۔ ۲- تقریظ از مہاراجہ سر دگیجے سنگھ بہادر سوانحات اودھ جلد اول ص ۲-۴۔

۳- ایضاً ص ۱۶ (طبع دوم ۱۸۹۶ء)۔

روایت کو آگے بڑھایا بلکہ اسے جدید فکر و نظر اور اسلوب و آہنگ سے بھی روشناس کرایا۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد علمی و تاریخی کتابوں کی تالیف و ترجمہ اور ان کی اشاعت تھا۔ سر سید احمد خاں کو تاریخ سے ابتدا ہی سے بڑی دلچسپی تھی خاص طور سے ہندوستان کی تاریخ سے۔ موجِ کوثر کے مصنف شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> "... تاریخی اور مذہبی مباحث سے انھیں خاص طور پر دلچسپی تھی اور ان کی اکثر مشہور کتابیں انہی مضامین کے متعلق ہیں۔ اسلامی ہندوستان کی اہم ترین تاریخی کتب کی اشاعت اور بادشاہانِ دہلی کے آثار باقیہ کی یادداشت اور بقا کے لیے جو کوششیں انھوں نے کیں شاید ہی کسی اور فرد واحد سے بن آئی ہوں۔ بلکہ شاید ہی کسی اور کو اس کی ضرورت کا پورا احساس ہوا ہوا"۔(۱)

تاریخ سے ان کی یہ دلچسپی آخر عمر تک باقی رہی مگر ان کے دوسرے علمی و تعلیمی اور اصلاحی کاموں کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے اپنی تاریخی کاوشوں سے تاریخ کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا۔

فن تاریخ نویسی پر سر سید احمد خاں کی نظر بڑی گہری تھی وہ اس کی باریکیوں سے واقف اور اس کے نباض تھے، جیسا کہ المامون میں ان کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے لائق مصنف نے اس بات کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بھی بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا اور نہ بھونڈے پن کو بھونڈا اور در حقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے"۔(۲)

اس اقتباس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سر سید تاریخ نویسی میں صداقت، اعتدال و توازن اور سادگی و دلآویزی کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ تحقیق و تدقیق اور غیر جانبداری کو بھی تاریخ نویسی کا لازمی جز تصور کرتے تھے۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور کی ابتداء میں

۱- شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر ص ۸۲-۸۳ تاج کمپنی دہلی ۱۹۹۹ء۔
۲- المامون دیباچہ ص ۳، دارا لمصنفین ایڈیشن ۱۹۹۲ء۔

لکھتے ہیں:

"الٰہی مجھے توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو اور صحیح بات
لکھنے کی ہدایت کر کیونکہ طرفداری کی تاریخ لکھنا ایسی بے ایمانی کی بات ہے
کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا وبال قیامت تک مصنف کے گردن پر
ہوتا ہے"۔(۱)

سرسید کے نزدیک تاریخ نویسی کا ایک خاص اسلوب ہے جس کا پاس و لحاظ ضروری ہے۔ کیونکہ سرسید کے الفاظ میں "تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے"(۲)۔ اس بناء پر سرسید نے لارڈ میکالے کو ناپسند اور علامہ شبلی کی تعریف و توصیف کی ہے۔(۳)

سرسید کے نزدیک واقعات تاریخ میں اسباب و علل کی تلاش مورخ کا ایک اہم کام ہے اور اہم واقعات کے ساتھ جزئیات معاشرت کی تفصیل پیش کرنا بھی مورخ کا اہم فریضہ ہے اور اسی خصوصیت پر انھوں نے المامون کی تعریف کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"تاریخانہ واقعات لکھنے چنداں مشکل نہ تھے مگر وہ باتیں جن کے
لکھنے کا اس زمانہ کے مورخوں کو بہت کم خیال تھا یا ان کی قدر نہیں کرتے تھے
اور اس زمانہ میں انھیں کی تلاش اور انھیں کی قدر کی جاتی ہے تلاش کرنی
مشکل تھی۔ مولانا نے اس میں پوری یا جہاں تک ممکن تھی کامیابی حاصل کی
ہے۔ پہلے حصہ میں انھوں نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی اور
اختصار سے دکھایا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیونکر اور کیوں خاندان بنی امیہؔ کو
برباد کر کے عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے جس سے امین
اس کا بھائی مقتول اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہٗ
بن گیا"۔(۴)

تاریخ نویسی کی ان بنیادی باتوں کا سرسید نے اپنی تاریخی کتابوں میں بڑی حد تک خیال بھی رکھا ہے۔ ان کا اسلوب نگارش بنیادی طور پر سادہ اور تاریخ کے لیے موزوں ہے۔

۱-سرسید احمد خان۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور ص ا کراچی ۱۹۶۲ء۔ ۲- المامون دیباچہ ص ۳۔
۳-ایضاً ۴-المامون ص ۲۔

اس طرح انھوں نے اعتدال و توازن اور غیر جانبداری سے بھی کام لیا ہے۔ تحقیق و تدقیق اور صداقت بھی ان کی تحریروں میں بھرپور پائی جاتی ہے۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور کی اس عبارت سے بھی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے بہت سا اس میں میری آنکھوں کا دیکھا اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا ہے اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت ہی سچ لکھا ہے"۔(۱)

تاریخ پر سرسید احمد خاں کی اس قدر وسیع و عمیق نظر کے باوجود ڈاکٹر سید عبداللہ ان کی تاریخی بصیرت کے پوری طرح قائل نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سرسید تاریخ کی تعمیری اہمیت اور افادیت پر پورا پورا یقین نہ رکھتے تھے(۲)۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ رائے سرسید کی اس تحریر کی بنیاد پر قائم کی ہے کہ:

"بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے اگر خود کچھ نہ ہوں اور کچھ کریں تو استخواں جد فروش کے سوا کچھ نہیں اور اگر اپنے میں ویسا ہونے کا چسکا ہو تو پھر امرت ہے"۔(۳)

اور اس کے ثبوت میں انھوں نے سرسید کی اس کوشش کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے علامہ شبلی کو الفاروق نہ لکھنے کے لیے کی تھی(۴)۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے کلّی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تاریخ سے ان کی دلچسپی برابر قائم رہی۔ تاریخی کتابیں مثلاً آثار الصنادید، تاریخ بجنور، تاریخ سرکشی ضلع بجنور وغیرہ لکھیں۔ ان کے علاوہ تاریخ ہندوستان کی بنیادی کتب مثلاً تاریخ فیروز شاہی، آئینِ اکبری اور تزکِ جہانگیری کو ایڈٹ کیا۔ گبن کی کتاب زوال سلطنت روم اور ایلیٹ کی تاریخ ہند اور بعض دوسرے مؤرخین کی کتابوں کا ترجمہ کرا کے شائع کیا اور آخر عمر میں صیغہ اغلاط تاریخی قائم کیا ان کی ان کوششوں سے پورے طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ اختر وقار عظیم نے بھی ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نکلتی

۱- تاریخ سرکشی ضلع بجنور ص ۱۳۲۔

۲- ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۴۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء۔

۳- المامون دیباچہ ص ا۔ ۴- سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۴۴۔

ہے۔ میری دانست میں سر سید تاریخ کی افادیت کے بڑی شدت سے قائل تھے اور اس حد تک قائل تھے کہ انھوں نے دشمنوں کے چلائے ہوئے تیر کو روکنے کے لیے دوسری چیزوں کے ساتھ تاریخ کو بھی اپنی ڈھال بنایا۔ اس سلسلہ میں خطبات احمدیہ اور اسباب بغاوت ہند کی مثال دی جا سکتی ہے۔ پہلی تصنیف ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کے جواب میں لکھی گئی اور دوسری میں تحقیق اور تاریخی حقائق کے صحیح بیان سے سر سید نے ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق مسلمانوں پر لگائے گئے الزامات کا جواب دیا۔ اگر سر سید تاریخ کی افادیت اور اہمیت کے قائل نہ ہوتے تو اسے سپر نہ بناتے۔(۱)

سر سید احمد خاں نے اولاً فارسی میں تاریخ نویسی پر توجہ دی اور سب سے پہلے ۱۸۴۰ء میں جام جم لکھی جس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک کے تینتالیس مغل بادشاہوں کے مختصر حالات ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں تاریخ نویسی پر توجہ دی جو ان کے دوسرے تعلیمی واصلاحی اور علمی وادبی کارناموں کے مانند اس لحاظ سے اہم ہے کہ اردو تاریخ نویسی کے بدلتے ہوئے رجحانات کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ یہاں ان کی تاریخی کاوشوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اردو تاریخ نویسی کے ارتقاء میں ان کی خدمات اور ان کے کردار کا اندازہ ہو سکے۔

آثار الصنادید

یہ تاریخ و آثار کے موضوع پر انتہائی معرکہ آرا تصنیف ہے اور تقریباً ڈیڑھ سو برس سے تاریخ اور دلّی کے آثار قدیمہ کے مطالعے کے بنیادی مآخذ میں شامل ہے۔

اسے سر سید نے ۱۸۴۷ء میں مکمل کیا اور اسی سال یہ مطبع مسیر الاخبار دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ چار ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ان عمارتوں کا بیان ہے جو دہلی سے باہر تھیں۔ اس میں ۱۳۰ عمارتوں کا ذکر ہے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کی تاریخی عمارتوں کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ ان کے کتبے اور نقشے بھی دیئے ہیں۔ دوسرے باب میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کا بیان ہے۔ یہ باب ۳۲ عمارتوں کے احوال اور ان کے کتبوں اور

۱۔ اختر وقار عظیم مجلہ برگ گل (سر سید نمبر) ص ۹۷ اردو کالج کراچی ۶۹-۱۹۶۸ء۔

نقشوں پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں ان عمارتوں، حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باؤلیوں اور کنوؤں کا احوال ہے جو خاص دلّی میں تھیں۔ چوتھے اور آخری باب میں پہلے مختصراً دہلی کے تاریخی و جغرافیائی حالات ہیں پھر دہلی کے ایک سو بیس ان مشائخ، علماء، فقراء، اطباء، حفاظ، شعراء، خوشنویسوں، مصوروں اور موسیقاروں کے حالات ہیں جو سرسید سے کچھ پہلے یا ان کے زمانہ میں موجود تھے۔ آثار الصنادید پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں:

> ''اوّل کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے اور پچھلے باب سے دلّی کا اخیر جھمگڑا آنکھوں کے روبرو آجاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ اہل علم اور اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے''۔(۱)

سرسید نے اس کتاب کی تیاری میں انتہائی محنت و دلچسپی سے کام لیا ہے۔ ملازمت کی مصروفیات کے باوجود تعطیل کے دنوں میں وہ یہ کام انجام دیتے رہے۔ چھٹیوں میں وہ اپنے دوست امام بخش صہبائی کے ساتھ دہلی سے باہر نکل جاتے اور عمارتوں کی تحقیق و تفتیش اور پیمائش وغیرہ کرتے، ان کے کتبے نقل کرتے اور ان سے معلومات اخذ کرتے۔ انھوں نے اس کام میں کس قدر دلچسپی اور محنت سے کام لیا اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے وہ فرماتے ہیں:

> ''قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا''۔(۲)

سرسید کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی چنانچہ ۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع سلطان دہلی سے شائع ہوا مگر اس میں سرسید نے بڑی ترمیم و تنسیخ کی یہاں تک کہ آخری باب

۱- مولانا حالی، حیات جاوید ص ۳۹ طبع دوم ۱۹۰۳ء ۲- حیات جاوید ص ۳۷-۳۸۔

جو دلّی کی مختصر تاریخ اور اس کے مشاہیر کے حالات پر مشتمل تھا سرے سے نکال دیا۔ پہلے ایڈیشن کی زبان ثقیل تھی اس کو عام فہم اور سادہ و سلیس بنایا۔ اسی زمانہ میں مسٹر رابرٹس نے اس کا انگریزی ترجمہ شروع کیا مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔ البتہ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جو خاص طور سے یورپ میں بڑا مقبول ہوا اور اس تحقیقی کام کی بنا پر سر سید کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔(۱)

بعد میں بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ سید معین الحق نے اسے ایڈٹ کر کے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے شائع کیا۔ ایک ایڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ ڈاکٹر خلیق انجم نے تین جلدوں میں مرتب کر کے انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا ہے اس میں آخری باب بھی شامل ہے اور مرتب کا قیمتی اور معلومات افزا مقدمہ بھی۔

تاریخ اور آثار کے سلسلہ میں سر سید کا یہ کام اتنا بلند اور وقیع ہے کہ اس کے علاوہ تاریخ کے موضوع پر کوئی اور کام نہ بھی کرتے تو ان کی مورخانہ عظمت میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہ ہوتی۔

سلسلۃ الملوک

اُنہتر صفحات پر مشتمل یہ مختصر رسالہ ۱۸۵۲ء میں شرف المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اصلاً دلّی کے اُن راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست ہے جنھوں نے گذشتہ پانچ ہزار سال تک دلّی پر حکومت کی۔ اس فہرست میں راجہ یدھشٹر سے ملکہ وکٹوریہ تک کی فہرست ہے۔ یہ اگرچہ ایک مختصر رسالہ ہے تاہم اس سے پانچ ہزار سال کے دلّی کے حکمرانوں کی مجموعی فہرست ایک نظر میں سامنے آجاتی ہے اور ان حکمرانوں کے نام مع ولدیت سنہ جلوس، دارالسلطنت اور ان کے عہد حکمرانی وغیرہ کا نقشہ یکجا دیکھا جا سکتا ہے۔ سلسلۃ الملوک کو بعد میں آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن میں قدرے اصلاح و اضافہ کے ساتھ شامل کر دیا گیا اب یہ مقالات سر سید حصہ ششم میں شامل ہے۔(۲)

تاریخ بجنور

تاریخ کے موضوع پر سر سید کا یہ دوسرا بڑا کارنامہ تھا جسے سر سید نے ضلع بجنور کی

۱- حیات جاوید ص ۳۹۔ ۲- اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا ہے۔

صدر امینی کے زمانے میں انجام دیا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں ضلع بجنور کی مکمل تاریخ تھی تکمیل کے بعد مطالعہ کے لیے صدر بورڈ آگرہ بھیجی گئی تھی مگر اسی زمانہ میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا یہ کتاب اسی کی نذر ہو گئی اور دنیا سر سید کے ایک اہم کام سے محروم ہو گئی۔(۱)

تصحیح آئینِ اکبری

اس کے بعد سر سید نے دلی کے ایک تاجر حاجی قطب الدین کی فرمائش پر ابوالفضل کی آئینِ اکبری کی تصحیح شروع کی اس کے متعدد نسخوں کو جمع کر کے مقابلہ و موازنہ کیا، کتابت کی غلطیاں درست کیں۔ عربی، فارسی، ترکی، اردو، ہندی و سنسکرت کے غریب الفاظ اور اس زمانہ کی اصطلاحات کی تشریح کی۔ اوزان و نقود کی اپنے زمانہ کی اوزان و نقود سے مطابقت دکھلائی خالی جدولوں کو پُر کیا، بعض جدولوں میں خود مصنف سے غلطیاں ہو گئی تھیں انھیں بھی درست کیا، بعض جدولوں کا اضافہ بھی کیا، سکّوں کی تفصیل میں حاشیے لکھے، اکبری سکّوں کی تصویریں دیں، ٹکسالی، ترازوئے آبی، اکبر کی آتش پرستی وغیرہ کی تصویریں مصوروں سے بنوا کر شامل کیں(۲)۔ غرض ترتیب و تہذیب کا پورا حق ادا کیا اور نہایت صحیح نسخہ مرتب کر کے طباعت کے لیے دیا۔ چنانچہ ۵۶-۱۸۵۵ء میں اس کی پہلی اور تیسری جلد مطبع اسماعیلی سے شائع ہوئی اس کی دوسری جلد بھی مرتب کی تھی اور ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا تھا مگر افسوس یہ متاعِ بے بہا ۱۸۵۷ء کی مصیبت کی نذر ہو گئی۔ آئینِ اکبری کی ترتیب و تحقیق میں سر سید نے جس قدر کاوش واہتمام کیا تھا اس کی تمام تفصیل مولانا حالی نے حیات جاوید میں بیان کی ہے۔(۳)

سر سید کی اس خدمت سے تاریخی کتابوں سے دلچسپی میں یقیناً اضافہ اور اس سے تاریخ نویسی کے ذوق و رجحان کو بھی تقویت ملی۔ متنی تحقیق و تدوین کا اردو میں غالباً یہ پہلا کام تھا اس لحاظ سے سر سید کی ایک بڑے اور دیدہ ور محقق کی بھی حیثیت ہو جاتی ہے۔

تاریخ سرکشیِ ضلع بجنور

اس میں سر سید نے غدر کے زمانہ کے وہ حالات جو ضلع بجنور میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء کے درمیان پیش آئے، بے رو رعایت اور بے کم و کاست لکھے ہیں۔ ۱۸۵۷ء

۱- حیات جاوید ص ۴۱۰۔ ۲- ایضاً ص ۴۳-۴۴۔ ۳- ایضاً

کے ہنگامہ خیز دور کے صرف ایک پہلو کی یہ تاریخ ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ سن ستاون کے واقعات کا ایک مستند مآخذ ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۸۵۸ء میں مفصلیات پریس آگرہ سے شائع ہوئی تھی ڈاکٹر سید معین الحق نے تحقیق و تحشیہ کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں اس کا جدید ایڈیشن سلمان اکیڈمی کراچی سے شائع کیا۔

اسباب بغاوت ہند

یہ سر سید کی بڑی مشہور اور سن ستاون کے واقعات کی سب سے اہم کتاب ہے۔ اس میں سر سید نے ثابت کیا ہے کہ مذکورہ بغاوت کے اسباب میں وہ غلطیاں بھی تھیں جو انگریز افسروں سے سرزد ہوئیں۔ انھوں نے مضبوط اور طاقتور دلائل سے واضح کیا کہ اس خون آشام واقعہ کی ذمہ داریاں خود انگریزوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

پہلی جنگ آزادی کے موضوع پر یہ ایک اہم کاوش اور سر سید کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس موضوع پر ۱۸۵۷ء میں قلم اٹھانا آسان نہ تھا اور مزید یہ کہ اس میں انگریزوں کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی جائے۔ تاہم سر سید نے دلیری اور ہمت و جرأت کے ساتھ قلم اٹھایا اور انگریز حکمرانوں پر ان کی غلطیاں واضح کیں گو بعض افسران نے برہمی کا بھی اظہار کیا تاہم عموماً یہ کتاب پسند کی گئی اور اس کی بنیاد پر بعض اصلاحیں بھی عمل میں آئیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۵۹ء میں آگرہ سے شائع ہوئی اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کو بھی سر سید نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ۱۸۶۲ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب دراصل اسی سوسائٹی کی فرمائش پر مرتب کی گئی تھی۔ اس پر سر سید نے ایک شاندار مقدمہ بھی لکھا تھا مگر معلوم نہیں کن وجوہ سے وہ شائع نہ ہو سکا۔

تصحیح تزکِ جہانگیری

جہانگیر کی اس کتاب کو بھی سر سید نے مرتب کر کے ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ سے

شائع کیا۔ سر سید کے ان تمام تصنیفی اور تدوینی تگ و دو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کو عام کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ تاریخ اور تاریخ نویسی کے مذاق کو عام کرنے میں ان کی ان کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی

فنِ تاریخ سے ان کے شغف و تعلق کا اندازہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس نے خاص طور پر فنِ تاریخ کی بڑی خدمت کی۔ اس کے ذریعہ متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور متعدد مغربی تاریخوں کے اردو ترجمے شائع ہوئے۔ اس کی چند تاریخی مطبوعات یہ ہیں:

۱- تاریخ یونان قدیم (تین جلدیں) (رولن)، ۲- تاریخ مصر قدیم (رولن)، ۳- تاریخ چین (رلونڈ ریکوس)، ۴- تاریخ ہندوستان (الفنسٹن)، ۵- تاریخ ایران (سر جان ملکم)، (۶) تزکِ جہانگیری، (۷) دیباچہ تاریخ فیروز شاہی (سر سید) وغیرہ۔

صیغۂ اغلاط تاریخ کی تصحیح

۱۸۹۲ء میں سر سید نے صیغۂ اغلاط تاریخی کی تصحیح قائم کیا اور علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری بنایا اور ان کے تمام مضامین اس میں داخل کیے (۱)۔ اس صیغہ کا مقصد مؤرخین کی غلط بیانیوں کی تصحیح اور ان کا جواب لکھنا تھا۔ یہ کام انھوں نے اپنی وفات سے ۶ برس قبل شروع کیا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سر سید نے تاریخ کو آخر تک اپنی توجہ کا خاص مرکز بنائے رکھا۔

غرض سر سید نے فنِ تاریخ کی ہر طرح سے بڑی خدمت کی، اس کے فروغ و ارتقا میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انفرادی حیثیت سے انھوں نے تاریخ کی جو خدمت انجام دی وہ ان کے عہد میں کسی اور شخص سے نہ ہو سکی۔

عہد شبلی سے پہلے کی تاریخ نگاری کا تنقیدی جائزہ

ہماری اب تک کی بحث سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ شبلی سے قبل تاریخی کتابوں کا سرمایہ محدود و مختصر ہے۔ اردو کی پہلی تاریخی کتاب رستم علی بجنوری کی قصہ و احوال

۱- سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۱۶۱، اعظم گڑھ۔

روہیلہ ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کی تاریخی تصنیفات جن کا غالب حصہ ترجموں پر مشتمل ہے صرف دو کتابیں حسنِ اختلاط اور انتخاب سلطانیہ کو مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔ مرحوم دہلی کالج کا تاریخی سرمایہ بھی بجز قصص ہند کے، ترجموں کا ہی مرہونِ منت ہے۔ اس طرح یہ دعویٰ غلط نہیں سمجھا جا سکتا کہ علامہ شبلی سے پہلے کا تاریخ کا جو سرمایہ موجود ہے وہ طبع زاد کم اور ترجموں پر زیادہ مشتمل ہے۔

تاریخ کی جو کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں وہ زیادہ تر فارسی اور انگریزی میں تھیں اس لیے ان تاریخوں پر فارسی اور انگریزی ادب اور فارسی و انگریزی تاریخ نویسی کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ گو فورٹ ولیم کالج کی نثر عموماً سادہ اور عام فہم ہے مگر اس پر بھی بہر حال فارسی و انگریزی کے اثرات نمایاں ہیں۔

اردو میں جن لوگوں نے تاریخ پر کتابیں لکھیں یا ترجمہ کیں ان میں سوائے سر سید کے کسی کے پیشِ نظر باقاعدہ تاریخ نویسی کے اصول نہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے انھیں محض واقعات کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی نہایت اہم اور قابلِ لحاظ ہے کہ اس دور کی بیشتر کتابوں کی تصنیف کا مقصد تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری نہیں تھا بلکہ نصابی کتابوں کی تکمیل اور انگریز حکمرانوں سے داد و دہش کی تمنا کا جذبہ شامل تھا۔ اس لیے ان میں نثر کی سادگی و سلاست اور شستگی و برجستگی تو پائی جاتی ہے مگر تاریخ نویسی کے اصول آزادانہ مطالعہ اور اس کے نتائج کا بے باک اظہار وضاحت کے ساتھ نہیں پایا جاتا اور اس کے لیے ان تاریخ نگاروں کو الزام اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ یہ اس کا ابتدائی دور تھا۔

علامہ شبلی سے قبل سر سید احمد خاں کی تحریریں ایسی ہیں جن میں تاریخ نویسی کے اصول و معیار کا وجود نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں کو ظاہر ہے علامہ شبلی کی تاریخ نویسی کے برابر تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن نقشِ اول کی جو اہمیت ہے اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصۂ بحث

اس جائزے سے یہ خلاصۂ بحث سامنے آتا ہے کہ اردو تاریخ نویسی کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں ہوئی اور عہد شبلی تک تاریخ نویسی کا سفر طبع زاد کتابوں کے

مقابلہ میں ترجموں سے زیادہ ہوا۔ گو سیکڑوں کتابیں لکھیں اور ترجمہ کی گئیں مگر ان میں فنی اور اصولی عناصر پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے یہ ابتدائی تاریخی سرمایہ اپنی سادہ و سلیس نثر کے لیے ممتاز ہے۔ جزئیات نگاری اور ربط و تسلسل بھی موجود ہے اور شاید یہ اس دور میں داستانوں کے فروغ اور چلن کے زیر اثر ممکن ہوا۔ البتہ معیار تحقیق و تدقیق فطری طور پر اتنا بلند پایہ نہیں جو بعد کی تاریخوں میں نظر آتا ہے۔

علامہ شبلی کی اولیات میں اس خوبی کو بھی شامل ہونا تھا کہ انھوں نے فنی و معیاری اصول صرف قائم ہی نہیں کیے بلکہ ان کو برت کر اردو تاریخ نویسی کو ترقی یافتہ زبانوں کے تاریخی سرمایہ کے ہم پلہ بنادیا۔ مہدی افادی نے ان کو یونہی تاریخ کا معلم اول قرار نہیں دیا تھا۔

باب دوم

علامہ شبلی کے تاریخی کارنامے

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) عبقری اور جامع العلوم شخص تھے۔ وہ ادیب تھے، انشاء پرداز تھے، شاعر تھے، خطیب تھے، محقق تھے، نقاد تھے، معلم تھے، متکلم تھے، فلسفی تھے، مفکر تھے، مصلح تھے، ماہر تعلیم تھے، سیاست و تدبیر مدن کے رمز شناس بھی تھے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "نئے زمانے کے اقتضاءات اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی تھے" (۱)۔ غرض وہ اپنے عہد کے ایسے باکمال شخص تھے جن میں علم و فضل کے اوصاف و کمالات بیک وقت جمع ہو گئے تھے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے ان کی جامعیت کو اپنے مخصوص طرزِ تحریر میں اس طرح پیش کیا ہے:

> "یونان کے عہد عتیق کے کسی ماہر سنگ تراش سے کہا جاتا کہ وہ کوئی ایسا مجسمہ بنائے جس کو دیکھ کر علم، فن، فضل، تحقیق، جستجو، ادب شعریت، دیدہ وری اور خوش فکری کی ساری کیفیات سامنے آجائیں تو وہ مولانا شبلی نعمانی ہی کا مجسمہ بن جاتا"۔ (۲)

علامہ شبلی نے ہندوستان کے جن یگانۂ روزگار علماء و فضلاء سے حصول علم اور اکتساب فیض کیا ان میں مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا ارشاد حسین رامپوری، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری جیسے نامورانِ علم و فن اور اربابِ فضل و کمال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا فاروق چریاکوٹی معقولات کے زبردست عالم اور فارسی زبان کے بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔ مولانا ارشاد حسین رامپوری فقہ حنفی میں بے نظیر تھے، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کو فن حدیث میں کمال حاصل تھا اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری بقول مولانا سید سلیمان ندوی "اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو (۳)۔ غرض یہ علماء خاص اپنے علوم میں نابغۂ عصر تھے علامہ شبلی نے

۱-حیات شبلی ص ۱۰۔ ۲-مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۲۔ ۳-حیات شبلی ص ۸۰۔

ان سے بھرپور استفادہ کیا اور خود بھی نادرۂ روزگار ہوئے۔

علامہ شبلی نے تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی علمی زندگی کی ابتداء درس و تدریس، شعر و شاعری اور فقہی بحث و مناظرہ سے کی۔ تصنیف و تالیف کا آغاز بھی نوعمری سے ہوا، ابتدائی تصانیف اس زمانہ کے مذاق عام کے مطابق مناظرانہ انداز کی ہیں۔ مثلاً رسالہ ظل الغمام فی مسئلہ القرأۃ خلف الامام (مطبوعہ ۱۲۹۲ھ) اور رسالہ اسکات المعتدی علی انصاف المقتدی (مطبوعہ ۱۲۹۴ھ) وغیرہ۔

اعظم گڑھ اور بستی میں وکالت اور علمی مشاغل کی مصروفیات کے بعد علامہ شبلی ۱۸۸۳ء میں بحیثیت اسسٹنٹ عربک پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو یہاں ایک نئی دنیا سے متعارف ہوئے۔ سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ء) کی قربت پروفیسر آرنلڈ (T. W. ORNALD) کی صحبت اور سر سید کے کتب خانہ اور کالج کے ماحول نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ یہاں ان کے غور و فکر، تصنیف و تالیف اور شعر شاعری کا محور بدل گیا اور مغربی علوم و فنون، جدید علمائے یورپ کے آراء و خیالات، مستشرقین یورپ کی علمی تحقیقات اور ان کے طرزِ تحقیق سے واقف ہوئے۔ غرض ان کے اندر علی گڑھ میں اس نئے طرز فکر کی ابتداء ہوئی جس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ لکھا کہ:

> جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سر سید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔(۱)

اس کے بعد علامہ شبلی مدۃ العمر طلب علم، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تنقید میں مصروف رہے اور مختلف موضوعات پر داد تحقیق دیتے رہے۔ ان کا گہربار قلم جس موضوع پر چلا اسے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا۔ عجم کی مدح کی تو پروفیسر براؤن (E. G. BROWNE) کی تحقیقات فارسی اور محمد حسین آزاد (۱۸۳۷ء-۱۹۱۰ء) کی سخندان فارس ماند پڑ گئیں اور فارسی شعر و ادب کا ایسا غلغلہ بلند ہوا کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک شعراُلعجم ہی کا تذکرہ زبانوں پر تھا۔ عباسیوں کی داستان المامون کی شکل میں سنائی تو ان کی شان

۱- حیات شبلی ص ۱۳۶

و شوکت اور عظمت و سطوت کو اس طرح نمایاں کیا کہ آج بھی بچہ بچہ کی زبان پر ان کے کارناموں کا قصہ ہے۔ فاروق اعظمؓ کے کوکبہ جلال کو دنیا کے سامنے پیش کیا تو کسی کو کسی اور جلوہ کی تشنگی باقی نہ رہی۔ ناموران اسلام کے عظیم الشان کارناموں کو بیان کیا تو ناموران یورپ کے قصے بادر ہوا ہو گئے۔ یورپ کی چیرہ دستیوں اور داستان سازیوں اور عالمگیر پر ان کے عائد کردہ الزامات کے مقابلہ میں قلم اٹھایا تو صاف ثابت کیا کہ

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندوکش تھا، ظالم تھا ستمگر تھا

موازنہ انیس و دبیر لکھی اور انیس کے مضامین نو کے انبار کو اسطرح پیش کیا کہ انیس کے شعری محاسن اور اس کی فصاحت و بلاغت کا سکہ ہمیشہ کے لیے اقلیم اردو میں رائج کر دیا۔ کلام و عقائد کے موضوع کو موضوع بحث بنایا تو اس قدیم علم میں نئی روح پھونک کر اسے اسلامیات کے جدید اور قابل عمل علم کا درجہ دے دیا اور جب خاتمہ بالخیر کی بشارت توفیق ایزدی نے مقدر کی تو وہ بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور ایسی مہتم بالشان اور عدیم المثال سیرت کی تالیف کی جس کی نظیر آج بھی اردو کیا دنیا کی کسی بھی زبان میں ملنی مشکل ہے۔ غرض حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔

علامہ شبلی کو اگرچہ فطرت نے گوناگوں اوصاف سے متصف کیا تھا جس کی وجہ سے وہ علوم اسلامیہ کے منفرد عالم و محقق ہوئے لیکن در حقیقت ان کا اصل میدان فن تاریخ تھا(۱)۔ وہ جب علی گڑھ پہنچے اور تصنیف و تالیف کے نئے طرز کی ابتداء کی تو اپنا موضوع تاریخ قرار دیا(۲)، اور پھر زندگی کے آخری لمحے تک اسی موضوع سے سروکار رکھا۔ وہ ایک مبسوط اور جامع تاریخ اسلام لکھنا چاہتے تھے جسے بتمام و کمال وہ عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ ان کے قلم سے متعدد تاریخی کتابیں اور مقالے اور مضامین نکلے لیکن فن تاریخ میں ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں پہلی بار تاریخ نگاری کے اصول و آئین مرتب و منضبط کیے اور خود اپنی تحریروں میں ان ہی اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کا اہتمام کیا اور یہی وہ کارنامہ ہے جو اردو زبان میں تاریخ نویسی کے کسی اور مصنف سے ان کو ممتاز کرتا ہے۔ یقیناً اسی بنیاد پر مشہور ادیب و نقاد مہدی افادی نے انھیں ملک میں تاریخ کا معلم اول قرار دیا تھا(۳)۔

۱- دیباچہ مقالات شبلی ج۵، ص ا۔ ۲- علم الکلام ص ۴۔ ۳- افادات مہدی ص ۱۹۲ تا ۲۰۰۔

فن تاریخ سے تعلق وشغف کی ابتداء

علامہ شبلی کو فن تاریخ سے ابتداء سے ہی خاص تعلق تھا لیکن اس فن سے اصل دلچسپی علی گڑھ میں پیدا ہوئی یہاں سر سید احمد خاں کا کتب خانہ نادر ونایاب کتابوں اور یورپ کی جدید تصنیفات کا خزانہ تھا سر سید نے علامہ شبلی کو اس سے استفادہ کی عام اجازت دے دی تھی، خود علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں"(۱)۔

چنانچہ علامہ شبلی نے کتب بینی و مطالعہ کے اس عمدہ موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا گبن (GIBBON) کی مشہور کتاب Decline and the Fall of the Roman Empire جس کا سر سید نے اردو میں ترجمہ کرایا تھا یہیں بارہاان کے مطالعہ میں رہی۔ دراصل اسی کتب خانہ کی تاریخی کتابوں خصوصاً یورپ کی جدید تاریخوں کے مطالعہ نے علامہ شبلی کے اندر تصنیف وتالیف کا شوق پیدا کیا خود لکھتے ہیں:

> "تصانیف کا شوق ابتداً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا مل گئیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔(۲)

علی گڑھ میں سر سید کے بعد دوسری شخصیت پروفیسر آرنلڈ کی تھی جن کے علامہ شبلی سے قریبی روابط تھے انھوں نے بھی تاریخ اور یورپ کے جدید افکار وخیالات سے واقف کرانے میں اہم کردار ادا کیا اس کا ذکر تفصیل سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔(۳)

فن تاریخ سے علامہ شبلی کے ربط وتعلق اور دلچسپی میں علی گڑھ کالج کا ماحول بھی

۱-مکاتیب شبلی ج۱،ص۵۶۔ ۲- ایضاج۲،ص۲۳۵۔ ۳- مقالات شیروانی ص۱۶۹۔

یقیناً بڑا سبب بنا جہاں قدیم و جدید بلکہ مشرق و مغرب کے فضلا جمع تھے اور باہم ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر اور مستفید ہو رہے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''مولانا کو کالج آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا۔(۱)

غرض علی گڑھ کے ماحول نے علامہ شبلی کو فن تاریخ کی طرف ابتداً متوجہ کیا پھر یکے بعد دیگرے ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے جنھوں نے بالآخر علامہ شبلی کو اردو زبان میں فن تاریخ کے معلم اول کی حیثیت عطا کر دی۔

تاریخ نگاری کی جانب علامہ شبلی کی توجہ کے اصل اسباب

علامہ شبلی جب فن تاریخ کی طرف متوجہ ہوئے اور تصانیف یورپ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تو انھوں نے یورپ کے کذب و افتراء کا عجیب و غریب منظر دیکھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس وقت اسلام کی سچی علمی خدمت یہی ہے کہ یورپ نے اسلام پر جو اعتراضات اور الزامات عائد کیے ہیں ان کا انہی کے اسلوب و انداز میں رد لکھا جائے اور نہایت زور و شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔ چنانچہ وہ علمائے یورپ کے اسلام پر لگائے گئے الزامات و اعتراضات اور ان کی بے اعتدالیوں کے رد و ابطال میں مصروف ہو گئے۔

یہ مسلم ہے کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ نے اپنے سیاسی مقاصد کی برآری کے لیے فن تاریخ کے ساتھ خاص اعتنا کیا نصاب تعلیم میں اس پر خصوصی توجہ دی گئی اور اس نکتہ پر توجہ مرکوز کی گئی کہ تاریخ علمی تحقیقات کا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ یورپ نے اپنی نسلوں کے علاوہ مقبوضہ ممالک کے باشندوں کے ذہن مسموم و مشکوک کرنے کے لیے اپنی نصابی کتابوں خصوصاً تاریخ کی کتابوں کی تعلیم لازمی قرار دی اس پوری علمی تگ و دو کے پس پشت ان کے چند خاص مقاصد تھے۔

پہلا مقصد

ابتداً یورپ اپنے قومی، سیاسی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے اسلام سے متعلق دانستہ غلط بیانیوں سے کام لیتا تھا مگر جب بعد میں اسے اسلامی ممالک پر فتح حاصل ہوئی تو اپنی حکومت

۱۔ حیات شبلی ص ۱۳۹۔

کو قائم و دائم رکھنے اور اس کے حدود کو وسیع کرنے کے لیے اس نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کے سابقہ مسلم حکمرانوں کی عیب جوئی کی جائے اور ان پر ایسے رکیک اور ناروا الزامات لگائے جائیں کہ مسلمان اپنے بادشاہوں کی سیہ کاری سے نہ صرف شرمندہ ہوں بلکہ ان کے نام سے بھی بے زار ہو جائیں، اس مقصد میں کامیابی کے لیے تاریخ سے بڑھ کر کون میدان ہو سکتا تھا۔

دوسرا مقصد

ان ممالک پر جہاں یورپ کی حکمرانی تھی اور مسلمان رعایا تھے وہاں اپنی علمی فضیلت اور برتری کا احساس دلانے کے لیے یورپ کے اہل قلم اور مؤرخین نے اپنی فضیلت کے واقعات گڑھ گڑھ کر مفتوح مسلمانوں کے سامنے پیش کیے اور مسلمانوں کو ظالم و جابر، غیر مہذب اور وحشی ثابت کرنے کے لیے اسلام کے اصول و عقائد، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی علوم و فنون، سلاطین اسلام یہاں تک کہ شارع اسلام ﷺ کی ذات مقدس کو بھی ہدف تنقید و تنقیص بنایا اور اس راہ میں تدلیس و تلبیس اور ہر سیہ کاری اور ہرزہ سرائی سے گریز نہیں کیا۔

تیسرا مقصد

چنانچہ اس سے مسلمان بچے اور مسلمانوں کی نئی نسل اپنے مذہب، تاریخ اور سلاطین سے برگشتہ ہونے لگی اور فطری طور پر ان کو اپنی قابل فخر تاریخ سے نفرت و حقارت کا جذبہ پروان پانے لگا۔ مستشرقین کا خیال تھا کہ اس سے ان کے قومی افتخار کو ایسا صدمہ پہنچے گا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کو بھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ان مقاصد کے ماتحت انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو ہدف اولیں بنایا اور سیرت طیبہ پر طرح طرح کے الزامات و اعتراضات کی یورش کی اس کے بعد خلفاء راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور سلاطین اسلام کو ہر طرح مطعون کرنے کی کوشش کی سلاطین اسلام اور ان کی حکومتوں کو ظالمانہ و جابرانہ ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کا الزام روا رکھا اور اس میں کذب و افترا سے دریغ نہیں کیا اور تاریخ کے ذریعہ مسلمانوں کے علمی، دینی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اس قدر بدنما اور بدمنظر بنا کر پیش کیا کہ خود مسلمانوں کو بھی اپنی تاریخ سے

نفرت ہونے لگی۔ مسلمان طلبہ مدارس میں جب تاریخ کی کتابیں پڑھتے تو اپنے بادشاہوں کے گھناؤنے واقعات پڑھ کر شرم سے سر جھکا لیتے۔ ان کوششوں سے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کچھ مسلمان اپنے مذہب سے اپنی تاریخ سے اور اپنے بادشاہوں سے نادانستہ برگشتہ و متنفر ہو گئے اور مزید غضب یہ ہوا کہ پیروی مغرب کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا، علامہ شبلی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی، سیہ کاری کے واقعات کو اس قدر بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا کہ خود ہمیں کو یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ ہو گئے۔(۱)

یورپ کی ان تمام سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کا اثر دوسرے ایشیائی مقبوضات کی طرح ہندوستان میں بھی ہوا۔ یہاں ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی عیسائی مشنریوں نے اسلام کے خلاف نفرت و عداوت اور عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ انقلاب کے بعد جب ملک پر انگریزوں کا مکمل اختیار ہو گیا تو انھوں نے اپنی ساری قوت و توجہ اپنے اصل اغراض و مقاصد پر مرکوز کر دی۔ فرق صرف یہ ہوا کہ عیسائی مشنریوں کے عمل کے برعکس انھوں نے اپنے اغراض فاسدہ پر علمی تحقیقات کا غلاف چڑھا لیا اور بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے عقائد و خیالات اور تاریخ کے ساتھ بڑا اعتنا کیا حالانکہ اصلاً وہ در پردہ ان کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ یورپ کی ان چیرہ دستیوں اور سازشوں کو علامہ شبلی نے سمجھا اور اس میدان میں ان کو اولیت اس طرح حاصل ہوئی کہ انھوں نے یورپ اور عیسائیت کے خلاف مورخانہ قلم اٹھا کر ان کی غلط کاریوں کا پردہ فاش کیا اور ان کی بددیانتیوں اور علمی خیانتوں کا جواب نہایت محققانہ انداز میں بلکہ انھیں کے اسلوب میں دیا، اور پورے اعتماد و اعتبار کے ساتھ بتایا کہ مسلمانوں نے دنیا کے علوم و فنون کو کس طرح ترقی دی اور تہذیب انسانی کو کس بلند مقام تک پہنچایا ان کے شاگرد خاص مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "ایسے ہوشمند حریفوں کے لیے ساری دنیائے اسلام میں جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنھوں نے ان ہی کے طریقے سے انہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ

۱- مقالات شبلی ج ۴، ص ۸۴۔

اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں
کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں
کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈال دی"۔(۱)

علامہ شبلی کی تاریخ نگاری کے مقاصد

ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تاریخ کا سارا سرمایہ گذشتہ صدی تک ان زبانوں (عربی و فارسی) میں محفوظ تھا جو ماضی میں گو ہماری زبانیں تھیں لیکن اب عوامی زندگی میں اپنی اہمیت محدود کر چکی تھیں۔ جو زبان اب ہندوستان کی عام ضرورتوں کی کفیل تھی اس کا دامن قومی تاریخ کے خزانے سے خالی تھا اس لیے علامہ شبلی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وقت آ گیا ہے کہ اب اردو کا دامن قومی تاریخ سے پُر ہونا چاہیے۔

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ اردو، عربی و فارسی کو ہٹا کر ہماری قومی زبان بنی ہے اس کے باوجود وہ اس خاصہ سے محروم ہے جو قائم مقامی کی حیثیت سے اس کا ذاتی حق تھا اور ایسا اس لیے ہوا کہ علماء جو تاریخی ذخیرے کے مالک تھے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ تصنیف و تالیف ایک طرف خط و کتابت کرنا بھی عار سمجھتے رہے اور عرصہ تک صحرائے عرب اور بہارستان فارس کا خواب دیکھتے رہے۔(۲)

علامہ شبلی کو یہ بھی احساس تھا کہ نئی نسل کی خواہش اور کوشش تھی کہ اردو کو ترقی دی جائے اور اپنی ملکی زبان کو ترقی کے اعلیٰ رتبہ تک پہنچایا جائے۔ اس کوشش و خواہش سے ملک میں انشاء پردازی اور تصنیف و تالیف کی ایک لہر اٹھی لیکن چونکہ نئی نسل عربی سے بیگانہ تھی اس لیے قومی تاریخ کے اصلی خزانے اس کی آنکھوں سے پوشیدہ رہے اور وہ مجبوراً تذکروں اور ناولوں کی طرف جھک گئے اور اردو میں تاریخی سرمائے کا اضافہ نہ ہو سکا۔(۳)

اردو زبان کی اس کم مائگی اور یورپ کی چیرہ دستی نے جس کا ہم ذکر اوپر لکھ آئے ہیں علامہ شبلی کو اردو زبان میں اسلامی حکومتوں کی مفصل اور بسیط تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ مگر چونکہ یہ کام تنہا ان کے بس کا نہ تھا اس لیے اسے مختصر کر کے نامور فرمانروایان اسلام کے حالات و کارنامے اور ان کے عہد کی تاریخ تک محدود کر دیا۔ ہیروز کے انتخاب میں انھوں نے

۱۔حیات شبلی ص ۲۵۔ ۲۔ المامون ص ۷۔ ۳۔ المامون ص ۷-۸۔

نہایت غور و فکر اور تدبر سے کام لیا اور ایسے حکمرانوں کا انتخاب کیا جو واقعی عظمت حکومت و سلطنت کے لحاظ سے اپنا ہمسر اور ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان حکمرانوں کے عہد کی اگر تاریخ مکمل ہو جاتی تو پوری اسلامی تاریخ کا ایک واضح دلکش اور صاف و شفاف رُخ سامنے آجاتا۔ افسوس کہ علامہ شبلی اپنی غیر معمولی مصروفیات اور شاید زندگی کے مختصر ایام کی وجہ سے اسے پورا نہ کر سکے۔

علامہ شبلی کی تاریخ نگاری کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسلام کے اصول و عقائد اسلامی علوم فنون، تاریخ و تہذیب سلاطین اسلام اور سیرت طیبہ پر یورپ کے اہل قلم اور مؤرخین نے اپنے تعصب کی وجہ سے جو الزامات لگائے ہیں ان کا انہی کے انداز اور اسلوب پر جواب دیا جائے اور ان کے کذب و افتراء کی نہایت پُر زور انداز میں تردید کی جائے تاکہ ان کے اعتراضات و الزامات کی کم مائگی عیاں ہو اور اسلام کی سچی اور صحیح تعلیمات لوگوں پر واضح ہو جائیں، علامہ شبلی یہ بھی چاہتے تھے کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں پر جو تنقید و تنقیص کی یلغار کی جس نے نئی نسل کو اسلام سے بیزار کر دیا ہے اور وہ یورپ کی ہر اچھی بری ادا پر جان دیتے ہیں ان کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کے قابل فخر، پُر عظمت اور عظیم الشان کارناموں کو پیش کیا جائے، اور انھیں بتایا جائے کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کس طرح دوبالا کیا اور مسلمان حکمرانوں نے کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے۔

تاریخ نگاری میں علامہ شبلی کے پیشِ نظر یہ مقصد بھی تھا کہ ہندوستان کے ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب اور شکست نے ہندی مسلمانوں کو جس احساس کمتری اور زبوں حالی میں مبتلا کر دیا ہے جس سے وہ خائف اور دہشت زدہ ہیں انھیں تاریخ کے ذریعہ ان کی عظمت رفتہ یاد دلا کر ان کے دلوں سے احساس کمتری کو دور کیا جائے۔ انگریز ہندوستان میں اپنی حکومت کو باقی رکھنے اور اس کے حدود کو وسیع کرنے کے لیے اپنے مؤرخین سے ایسی تاریخیں قلمبند کرا رہے تھے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت و انتشار اور پراگندگی پیدا ہو اور دونوں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو کر آپس میں الجھے رہیں اور کبھی متحد ہو کر ان کے مقابلہ میں صف آرا نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کی برآری کے لیے انھوں نے سلاطین ہند خصوصاً اورنگزیب عالمگیر کی شخصیت اور اس کی حکومت پر زور و شور کے ساتھ الزامات کی

یورش کی۔ عالمگیر اور اس کی حکومت کو ہر طرح سے مطعون کیا اور اس کے ذریعہ دونوں قوموں میں بھرپور نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علامہ شبلی کی تاریخ نویسی کا ایک مقصد اس قومی تفریق کو ختم کرنا بھی تھا۔

علامہ شبلی کا منصوبہ تاریخ

علامہ شبلی نے جب تاریخ نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو اس کا ایک جامع منصوبہ بنایا جس میں اسلامی حکومتوں کی نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھنے کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں جب اس کام کی طوالت اور وسعت کو دیکھا تو فطری طور پر یہ محسوس کیا کہ یہ طویل تحقیقی کام تنہا ایک شخص کے بس کا نہیں ہے اس لیے صرف تاریخ بنو عباس لکھنے پر اکتفا کرنا چاہا۔ خلیفہ معتصم باللہ کے حالات تک پہنچنے کے بعد یہ کام بھی طویل نظر آیا چنانچہ انھوں نے اپنے منصوبہ تاریخ کو اور مختصر کر کے صرف نامور فرمانروایان اسلام تک محدود کر دیا وہ خود لکھتے ہیں:

> "ایک مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اسلامی حکومتوں کی نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھوں مشکل یہ تھی کہ نہ میں تمام خاندان کا استقصا کر سکتا تھا نہ کسی خاص سلسلہ کے انتخاب کی مجھ کو کوئی وجہ مرجح ملتی تھی۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ رائل ہیروز آف اسلام یعنی نامور فرمانروایان اسلام کا ایک سلسلہ لکھوں جس کا طریقہ یہ ہوا کہ اسلام میں اب تک خلافت و سلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے ان میں سے صرف وہ نامور انتخاب کر لیے جائیں جو اپنے طبقے میں عظمت حکومت کے اعتبار سے اپنا ہمسر نہ رکھتے ہوں اور ان کے حالات اس ترتیب سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود رہے۔(۱)

علامہ شبلی جن نامور فرمانروایانِ اسلام کے حالات و کارنامے لکھنا چاہتے تھے ان کا ایک انتخاب بھی پیش کیا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروقؓ، بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک، بنو عباس میں مامون الرشید، اندلسی بنوامیہ میں عبدالرحمن ناصر، بنو حمدان میں سیف الدولہ، سلجوقیوں میں ملک شاہ، نوریہ میں نورالدین زنگی، ایوبیہ میں

۱- المامون ص۸۔

صلاح الدین ایوبی، موحدین اندلس میں یعقوب بن یوسف اور ترکان روم میں سلیمان اعظم، یہ سب علامہ شبلی کی فہرست ابطال کے نمایاں نام ہیں۔(۱)

حکومت و سلطنت کے ان مشاہیر کے علاوہ وہ علوم اسلامیہ کے بے تاج اور اصل فرمانروایان مملکت علم و دانش کے حالات و سوانح بھی تاریخ سلطنت کے پہلو بہ پہلو پیش کرنا چاہتے تھے جیسا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں ان کی اس عبارت سے ظاہر ہے:

> "اول اول جب مجھ کو اس (نامور فرمانروایان اسلام) کا خیال پیدا ہوا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کیے ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو اس سلسلہ کا ہیرو قرار دیا جائے مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا بلکہ سلسلہ حکومت سے بہت سے خاندان چھوڑ دیئے تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم توامان۔(۲)

تاریخ کے ان منصوبوں کے متعلق علامہ شبلی کا یہ بلند جذبہ تھا کہ اگر عمر نے وفا کی اور حالات نے مساعدت کی تو انھیں مکمل کر دوں گا۔ مگر افسوس زمانہ نے مساعدت کی اور نہ عمر نے وفا کی اور یہ دونوں تاریخی سلسلے نامکمل رہ گئے۔ نامور فرمانروایانِ اسلام کے دو شاہکار حصے المامون والفاروق اور ناموران اسلام کے تحت سیرۃ النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھی جا سکیں۔ علامہ ابن تیمیہ اور ابن رشد پر مختصر مگر جامع مضامین سپرد قلم کیے لیکن قسام ازل نے ان کو حقیقتاً اس عظیم ترین ہستی کی سوانح اور حالات طیبہ مرتب کرنے کے لیے منتخب کر لیا جو پورے عالم انسانیت اور کائنات کا سب سے بڑا ہیرو ہے ابھی وہ سیرۃ النبی لکھ ہی رہے تھے کہ ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

۱- المامون ص ۸-۹۔ ۲- سیرۃ النعمان۔ دیباچہ ص ۷۔

علامہ شبلی اور تاریخ اسلام

علامہ شبلی نعمانی علوم اسلامیہ کے صاحب نظر عالم تھے ان کے مجتہدانہ اور وسیع مطالعہ خصوصاً تاریخ اسلام پر ان کی عمیق نظر کی ہر صاحب فکر و نظر نے داد دی ہے۔ وہ مؤرخین اسلام کے کارناموں اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ واقف تھے۔ اسی بناء پر مولانا الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) نے انھیں بجا طور پر مشرقی تاریخ کا مخزن قرار دیا تھا۔

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

سر سید احمد خاں جو خود اپنے وقت کے عظیم مؤرخ تھے علامہ شبلی کی مؤرخانہ ژرف نگاہی کے بڑے معترف تھے اس کا اظہار انھوں نے المامون کے دیباچہ میں تفصیل سے کیا ہے اور ان کے رسالہ الجزیہ کے بارے میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

> "اگر وہ (علامہ شبلی) نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں فاتو بسورۃ من مثلہ تو تعجب نہ ہوگا"۔(۱)

علامہ شبلی کے تاریخی مضامین ہی کو دیکھ کر سر سید کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یورپ کے مؤرخین نے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کی تصحیح و جواب کے لیے ایک مجلس قائم کی جائے۔ چنانچہ جب ۱۸۹۲ء میں یہ مجلس قائم ہوئی تو انھوں نے علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری بنایا اور ان کے تاریخی مضامین کو اس سلسلہ میں داخل کیا۔(۲)

تاریخ کی ابتداء کے بارے میں علامہ شبلی کا نقطہ نظر

فن تاریخ کے متعلق علامہ شبلی کی یہ رائے ہے کہ "جس طرح تمام علوم و فنون کا ہیولیٰ پہلے سے موجود ہوتا ہے اور وہ تمدن کے زمانہ میں موزوں قالب اختیار کر لیتا ہے اور اسے فن کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے فن تاریخ نے بھی اسی طرح ترقی کی ہے"(۳)۔ تاریخ نگاری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ تاریخ کا تعلق اجتماع انسانی سے ہے۔ انسان اس روئے زمین پر جہاں کہیں آباد ہوا اپنی تاریخ خود بخود بناتا چلا گیا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

۱- حیات شبلی ص ۲۳۳۔ ۲- حیات شبلی ص ۲۳۳۔ ۳- الفاروق۔ تمہید ص ۲، دار المصنفین ۱۹۹۲ء۔

دنیا میں جہاں کہیں انسانوں کا کوئی گروہ موجود تھا تاریخ و تذکرے
بھی ساتھ ساتھ تھے کیونکہ فخر و ترجیح کے موقعوں پر لوگ اپنے اسلاف کے
کارنامے خواہ مخواہ بیان کرتے تھے۔ تفریح اور گرمی صحبت کے لیے مجالس
میں پچھلی لڑائیوں اور معرکوں کا ذکر ضرور کیا جاتا تھا۔ باپ دادا کی تقلید کے
لیے پرانی عادات و رسوم کی یادگاریں خواہ مخواہ قائم رکھی جاتی تھیں اور یہی
چیزیں تاریخ و تذکرہ کا سرمایہ ہیں۔(۱)

عربوں کی انفرادیت

علامہ شبلی نے فن تاریخ میں عربوں کی انفرادیت کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ فن تاریخ میں عربوں کو دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں بعض اسباب کی بنا پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ مثلاً تاریخ کے ابتدائی ہیولی نے دنیا کی دوسری قوموں میں تمدن کے زمانہ میں موزوں قالب ضرور اختیار کیا مگر عرب اپنے تمدنی اور تہذیبی دور ارتقاء و عروج سے پہلے ہی تاریخ و انساب کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ علم انساب، ایام العرب اور اشعار عرب کی روشنی میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ عربوں کو اسلام سے پہلے تاریخ سے جس قدر تعلق تھا اس کی مثال دنیا کی اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> "انساب کا چرچا جس کی یہ کیفیت تھی کہ بچہ بچہ اپنے آباء و اجداد
> کے نام اور ان کے رشتے ناتے دس دس بارہ بارہ پشتوں تک محفوظ رکھتا تھا۔
> یہاں تک کہ انسانوں سے گذر کر گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب نامے
> محفوظ رکھے جاتے تھے۔ یا ایام العرب جس کی بدولت عکاظ کے سالانہ میلے
> میں قومی کارناموں کی روایتیں سلسلہ بہ سلسلہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں تک
> پہنچ جاتی تھیں۔ یا شاعری جس کا یہ حال تھا کہ اونٹ چرانے والے بدو جن کو
> لکھنے پڑھنے سے کچھ سروکار نہ تھا اپنی زبان آوری کے سامنے تمام عالم کو ہیچ
> سمجھتے تھے اور در حقیقت جس سادگی اور اصلیت کے ساتھ وہ واقعات اور
> جذبات کی تصویر کھینچ سکتے تھے دنیا میں کسی قوم کو یہ بات نصیب نہیں۔(۲)

۱۔ الفاروق۔ تمہید ص ۲، دار المصنفین ۱۹۹۲ء۔   ۲۔ الفاروق ص ۳۔

عربوں کی ان خصوصیات کا تعلق دراصل تاریخ کے فن سے ہے۔ دوسری قوموں کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے آراستہ ہوئیں تو عربوں جیسا تعلق و شغف نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ کے ساتھ وہ اعتنا نہ کر سکیں جو عربوں کے حصہ میں آیا اور یہی وجہ ہے کہ غیر عرب اقوام کی ابتدائی تاریخی تصانیف اب ہمارے سامنے داستان اور قصوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس جب عربوں میں تمدن کا آغاز ہوا جو دراصل اسلام کے فیوض و برکات کی خوش گوار بہار ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن کا کارواں نئی منزلوں کی تلاش میں رواں دواں ہوا تو سب سے پہلے مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی سیرت و سوانح اور فضائل و اخلاق پر خاص توجہ مرکوز کی جب کہ دوسری اقوام کے مذہبی رہنماؤں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

سیرت رسول کو قلمبند کرنے میں ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ علامہ شبلی کے الفاظ میں کسی صحیفۂ آسمانی کے لیے بھی نہ ہو سکا، اور وسعت و تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طریق معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی۔ (۱)

سیرت نبویؐ سے اس غیر معمولی اور بے مثال والہانہ تعلق کے علاوہ مسلمانوں نے عام فن تاریخ کے ساتھ بھی کم اعتناء نہیں کیا۔ بلکہ آغاز تمدن کے بعد جب باقاعدہ تصنیف و تالیف کی ابتداء ہوئی تو جو کتاب سب سے پہلے لکھی گئی وہ فن تاریخ میں تھی (۲)۔ پھر اس فن نے بقول علامہ شبلی اس قدر ترقی کی کہ "ہمارے لٹریچر کا ہر جملہ گویا قومی تاریخ کا ایک مختصر سا متن تھا۔ (۳)

مسلمانوں میں ایسے ایسے نامور مؤرخ پیدا ہوئے جنھوں نے نہایت عظیم الشان تاریخی کتابیں مرتب کیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ چوتھی صدی تک تاریخ کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہو گیا (۴)۔ اس دور کے ایک مؤرخ علامہ مسعودی کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

فن تاریخ کا امام ہے اسلام میں آج تک اس کے برابر کوئی وسیع

۱- سیرۃ النبیؐ ج۱، ص۴ مقدمہ۔ ۲- الفاروق ص۳۔

۳- المامون ص۶۔ ۴- الفاروق ص۴۔

النظر مؤرخ پیدا نہیں ہوا۔ وہ دنیا کی اور قوموں کی تواریخ کا بھی بہت بڑا ماہر
تھا اس کی تمام تاریخی کتابیں ملتیں تو کسی اور تصنیف کی کچھ حاجت نہ ہوتی۔
افسوس کہ قوم کی بد مذاقی سے اس کی اکثر تصنیفات ناپید ہو گئیں۔(۱)

متاخرین کے دور میں بھی فن تاریخ نے بڑی ترقی کی اس دور میں بھی بے شمار مؤرخ پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کی خدمت میں اپنی زندگیاں گذار دیں۔ ابن الاثیر، سمعانی، ذہبی ابوالفدا، نویری، سیوطی اور ابن خلدون اسی دور کے نامور مؤرخ گذرے ہیں۔

غرض یہ کہ تاریخ اسلام کے ہر دور میں تاریخ اور تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق استوار رکھا گیا اور اس فن پر اس قدر توجہ کی گئی کہ یہ بامِ عروج تک پہنچ گیا۔

مؤرخین اسلام: قدماء و متاخرین

تاریخ اسلام میں چوتھی صدی ہجری تک کا عہد قدیم مؤرخین کا دور کہا جاتا ہے۔ علامہ شبلی اس دور کے مؤرخین کے بڑے مداح ہیں اور در حقیقت یہ تاریخ اسلام کا زریں اور تابناک عہد ہے اس میں عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، احمد بن داؤد، ابو حنیفہ دینوری، محمد بن سعد کاتب الواقدی، احمد بن ابی یعقوب بن واضح کاتب عباسی، احمد بن یحییٰ بلاذری، ابو جعفر بن جریر طبری، ابوالحسن علی بن حسین مسعودی وغیرہ جیسے نامور مؤرخ پیدا ہوئے۔ فنِ تاریخ کی عظیم الشان اور نہایت بلند پایہ کتابیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ ذیل میں ہم اختصار سے اس دور کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

قدیم مؤرخین کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کی ہر تصنیف نئی معلومات پر مشتمل اور جدا جدا عنوان پر ہوتی تھی۔ تمدن و معاشرت کی جزئیات پر بھی ان کی نظر رہتی تھی جس سے تمدن و معاشرت کا بھی کچھ نہ کچھ پتہ چلتا تھا(۲)۔ وہ تمام واقعات کو حدیث کی طرح مسلسل سند کے ساتھ قلمبند کرتے تھے جس سے بقول علامہ شبلی "فائدہ یہ ہے کہ کبھی روایت میں شک ہو تو اس کی کافی تحقیق ہو سکتی ہے۔(۳)

پانچویں صدی ہجری کی ابتدا سے متاخرین کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں اسلامی مؤرخوں نے فن تاریخ کے ساتھ متقدمین کی طرح ہی اعتناء کیا مگر ان کی تقلید و اتباع اس حد تک

۱- الفاروق ص ۷-۸ ۲- الفاروق ص ۸-۹۔ ۳- ایضاً و مقالات شبلی ج ۴، ص ۱۴۔

کی گئی کہ جدت واجتہاد کی کمی محسوس کی گئی۔ اس دور میں ابن الاثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفدا، نویری اور سیوطی وغیرہ جیسے اہم نام ہیں۔ مگر علامہ شبلی کا خیال ہے کہ یہ دور ''فن تاریخ کے تنزل کا پہلا قدم ہے... ان لوگوں نے تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا۔ خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کی بلکہ قدما کی جو خصوصیات تھیں وہ بھی کھو دیں(۱)۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:

ان مورخین نے قدماء کی تصانیف سامنے رکھ کر معمولی ردو بدل اور اختصار کے ساتھ اس کا قالب بدل دیا اور اختصار بھی اس طرح کیا کہ جہاں جو بات چھوڑ دی وہی اس تمام واقعہ کی روح تھی(۲)۔ واقعات کو سند بہ سند لکھنے کو بھی ترک کر دیا۔ قدماء کی کتابوں سے تمدن و معاشرت کا بھی کسی قدر اندازہ ہو جاتا تھا مگر اس دور کے مؤرخین نے اس کی طرف بھی توجہ نہ دی(۳)۔ اس سے فن تاریخ بہر حال متاثر ہوا اور اسے جس قدر ترقی کرنا چاہیے تھا وہ نہ کر سکا۔ ترقی کے مدارج طے نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ہمارے علماء نے اسلامی علوم کو دو قسموں معقول و منقول میں تقسیم کر دیا۔ جن لوگوں نے معقول کو اپنا مرکز توجہ بنایا انھوں نے منقول کو اپنے دائرے سے خارج تصور کیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے منقول کی طرف توجہ دی انھوں نے معقول کو لائق اعتناء نہ سمجھا۔ چنانچہ بعض جامع العلوم شخصیات کی توجہ سے یہ فن محروم رہا اور بقول علامہ شبلی ''یہ فن فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے محروم رہ گیا''۔ یہی وجہ ہے کہ بوعلی سینا، فارابی، طوسی، امام رازی، قطب الدین شیرازی، جلال الدین دوانی کی کوئی تصنیف اس فن میں موجود نہیں ہے۔(۴)

اس فن کے ترقی نہ کرنے کا ایک سبب علامہ شبلی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس عہد میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ تاریخ کو عقل و درایت سے تعلق نہیں اس لیے مؤرخین نے خود مؤرخانہ فہم و بصیرت سے کام نہیں لیا ان کو صرف اس سے غرض تھی کہ راوی ثقہ ہے یا نہیں۔(۵)

علامہ ابن خلدون اور فلسفہ تاریخ

دور جدید (متاخرین) کے مؤرخین کے بارے میں علامہ شبلی کا خیال اوپر گذر چکا

۱-الفاروق ص ۸۔ ۲-ایضاً ص ۸۔ ۳-الفاروق ص ۸-۹۔
۴-مقالات شبلی ج ۴، ص ۲۲۔ ۵-ایضاً

ہے، اسی عہد میں عبدالرحمٰن بن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۶ء) نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی اور اس کے اصول و آئین منضبط کیے، اور دنیا کو پہلی بار سائنٹفک اصولوں سے روشناس کرایا، گو علامہ ابن خلدون اپنے فلسفۂ تاریخ کو خود بھی عملی جامہ نہ پہنا سکے (۱)۔ تاہم اس کا غلغلہ تمام ممالک میں بلند ہوا، لیکن مسلمانوں میں انحطاط وزوال کا ایسا سلسلہ رہا کہ کوئی اور شخص بھی ان کے فلسفہ کی طرف بھرپور توجہ نہ کر سکا (۲) اور وہ کئی سو سال تک پردۂ گمنامی میں رہا۔ یورپ کے جدید مؤرخین نے ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کو یورپ میں روشناس کرانے میں نمایاں حصہ لیا (۳)۔ علامہ شبلی ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ سے بہ خوبی واقف تھے اور اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر نہ صرف اس کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کے بعض اصولوں سے استفادہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے ابن خلدون کے ساتھ ان کے شاگرد مقریزی کی بھی تعریف کی ہے (۴)۔

مولانا وحیدالدین سلیم کا خیال ہے کہ فلسفۂ تاریخ کی بنیاد یورپ میں پڑی۔ سنٹ آگسٹائن نے سب سے پہلے اس پر اظہار خیال کیا اس کے بعد مان ٹسکیو، شلی جل، ہیجل، کامٹی اور بکل وغیرہ نے اسے مزید ترقی دی اور مسلمانوں میں صرف ابن خلدون ہی ایسا مؤرخ ہے جس نے اس کی طرف توجہ دی (۵)۔ لیکن معروف محقق ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب کی تحقیق ہے کہ اس علم کی ابتداء دراصل صاعد الاندلسی کی کتاب طبقات الامم سے ہوئی اور اس کی تکمیل ابن خلدون کے مقدمہ سے ہوئی (۶)۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے بغیر کسی معذرت کے صاف اور واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ جس فلسفہ تاریخ کی بنیاد ابن خلدون نے ڈالی اس پر نہ صرف متاخرین بلکہ مسلمانوں کی کل قوم ناز کر سکتی ہے۔ (۷)

علامہ شبلی کی تاریخ نگاری میں ابن خلدون کے فلسفہ کے اثرات گو واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں تاہم وہ ان کے بعض نظریات تاریخ پر توجہ نہیں دے سکے۔ مثلاً ابن خلدون نے طبقہ انسانی کی دو قسمیں مہذب شہری اور غیر مہذب بدوی کے نام سے کی ہیں۔ اس کا ذکر علامہ شبلی کی تحریروں میں نہیں ملتا، اقوام کی عمر کے بارے میں ابن خلدون کا نظریہ بھی ان کے یہاں نظرانداز ہو گیا ہے۔

۱-الفاروق ص۹-۱۰۔ ۲- ایضاً۔ ۳- ابن خلدون کی عظمت اور علمائے یورپ ص ۳۳۔

۴-الفاروق ص۹۔ ۵-مضامین سلیم حصہ اول ص ۱۶۰۔

۶-علم تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ مشمولہ ارمغان مالک ج ۲، ص ۳۱۰۔ ۷-الفاروق ص ۱۱۔

ابن مسکویہ اور تجارب الامم

مشہور مؤرخ و فلسفی ابن مسکویہ کے تاریخی افکار و نظریات سے بھی علامہ شبلی بخوبی واقف تھے۔ایک مختصر مضمون میں انھوں نے ابن مسکویہ کی کتاب تجارب الامم کا تفصیل سے تعارف کراتے ہوئے اس کے نظریہ تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ ابن مسکویہ کی کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن تاریخ کو یورپ نے جس مقام پر انیسویں صدی میں پہنچایا مسلمانوں نے اسے پانچویں صدی ہجری سے قبل ہی پہنچا دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ فن تاریخ سے بے اعتنائی کا رجحان بھی اسی کے دور سے شروع ہو گیا تھا جس کا ذکر ابن مسکویہ نے بھی کیا ہے(۱)۔

علامہ شبلی نے ابن مسکویہ کے اصول تاریخ کی تعریف و توصیف کے ساتھ اس کے بعض اصول و نظریات پر تنقید بھی کی ہے جس سے فن تاریخ میں ان کی دقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

اسلامی نظریہ تاریخ سے علامہ شبلی کی واقفیت کے اس سرسری جائزے کے بعد اب ہم علامہ کی غیر اسلامی نظریہ تاریخ سے واقفیت اور دلچسپی کا ایک مختصر جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔

علامہ شبلی اور مؤرخین یورپ

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ علامہ شبلی علمائے یورپ کی تحقیقات سے علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں واقف ہوئے۔ سر سید احمد خاں اور پروفیسر آرنلڈ کی علمی صحبتیں اور علی گڑھ کالج کا ماحول اس واقفیت میں نہایت مددگار ثابت ہوئے۔ گو وہ یورپ کی کسی زبان سے واقف نہ تھے(۲) اس لیے براہ راست یورپین تصنیفات سے استفادہ نہیں کر سکے تاہم ان کے عربی و اردو ترجموں کے ذریعہ انھوں نے یورپ کے تاریخی رجحان و میلانات سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں روم و مصر کا سفر اور شمس العلماء سید علی بلگرامی سے علمی روابط بھی بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔ ترکی سیاسی اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر یورپ کا خاص مرکز توجہ تھا۔ سفر ترکی میں علامہ شبلی کو یورپ کی تاریخی سرگرمیوں اور اسلام کے ساتھ یورپ کے معاندانہ طرز عمل کا براہ راست علم اور تجربہ ہوا اور ترکوں کے رد عمل سے بھی واقفیت ہوئی اور یہیں انھوں نے یورپ کی علمی بے اعتدالیوں پر نقد و جرح بھی سنی۔(۳)

۱- مقالات شبلی ج ۴، ص ۱۹-۲۸۔ ۲- سیرۃ النبی ج ا ص ۷۔ ۳- سفر نامہ روم، مصر و شام ص ۴۹۔

سید علی بلگرامی چند مغربی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے انھوں نے علامہ شبلی کو جدید تاریخی رجحانات، نئے انداز تحقیق اور یورپ کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں سے آگاہ کیا(۱) اس کے بعد وہ مدۃ العمر یورپ کے افکار و خیالات سے آگاہی حاصل کرنے میں مصروف رہے اور سیرۃ النبیؐ کی تالیف تک ان کا یہ مطالعہ نہایت وسیع و عمیق اور جامع ہو چکا تھا۔

درحقیقت یورپ کی تصانیف نے علامہ شبلی کے اندر تصنیف و تالیف کا مخفی جذبہ بیدار کیا(۲)۔ چنانچہ انھوں نے اس کی ابتداء اپنے ایک گراں مایہ مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' سے کی جو ان کے جدید انداز تحقیق و تصنیف کا پہلا نمونہ ہے۔ اس کے بعد مغربی علوم و افکار سے ان کی واقفیت برابر بڑھتی گئی اور اپنی آخری تصنیف سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ میں اس موضوع پر لکھی جانے والی تصانیف یورپ کی ایک فہرست نقل کی ہے(۳)۔ اس سے علامہ شبلی کے علم و مطالعہ کی وسعت و جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ یورپ کے جدید تاریخی خیالات، تحقیقات اور علمی اکتشافات سے بھی اس حد تک واقف تھے کہ انھوں نے یورپ کی تعریف و تحسین کے ساتھ ان پر تنقید و تبصرہ بھی کیا۔ یہ ان کی غیر جانبداری، وسیع النظری اور ایک مکمل نظریہ تاریخ رکھنے کا ثبوت بھی ہے، انھوں نے مؤرخین یورپ کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱)۔ مؤرخین یورپ کا پہلا گروہ علامہ کی نظر میں ان لوگوں پر مشتمل ہے ''جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں۔ ان کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں''۔ ظاہر ہے اس گروہ کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ اس گروہ میں گبن (GIBBON) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست بھی شامل ہیں جو ''راکھ کے ڈھیر سے بھی سونے کے ذرّے نکال سکتے ہیں''۔(۴)

(۲)۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو عربی زبان اور علم و ادب اور تاریخ و فلسفہ اسلام کے بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت سے آشنا نہیں۔ گو ان لوگوں کی کوئی مستقل تصنیف نہیں لیکن ضمنی موقعوں پر اپنی عربی دانی کے زعم میں اسلام اور شارع اسلام پر

۱۔ ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۹۲۔
۲۔ مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۲۰۰۔
۳۔ سیرۃ النبیؐ ج ۱ دیباچہ ۹۸۔
۴۔ سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۶۲۔

دلیری کے ساتھ جو چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً سخاؤ (SOKHAU) اور نولدیکی (NOWLEDEKE) وغیرہ۔(۱)

(۳)۔ تیسرا گروہ مسٹر پامر (POMMER) اور مارگولیوتھ (MARGOLIUTH) جیسے مستشرقین کا ہے جو

دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں(۲)

یہ لوگ عربی زبان وادب کے بڑے ماہر اور مذہبی لٹریچر سے بھی آشنا ہیں مگر ان کے منہ سے وہی باتیں نکلتی ہیں جو عام پادری کہتے ہیں۔

علامہ شبلی یورپین لٹریچر سے اپنی واقفیت حاصل کرنے کے متعلق پروفیسر عبدالقادر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سیرت نبویؐ جو زیر تصنیف ہے میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں نہایت زور و شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔(۳)

علامہ شبلی نے اس کام کے لیے مؤرخین یورپ کی تصانیف جمع کیں، دفتر سیرت نبویؐ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنا لٹریری معاون بنایا کہ وہ مؤرخین یورپ کی تصانیف کا ترجمہ کریں۔ ان کے علاوہ اپنے بہت سے احباب اور شاگردوں کے پاس ان مؤرخین کی کتابیں اس غرض سے بھیجیں کہ وہ کتاب کا مطالعہ کر کے اہم اقتباسات اور قابل اعتراض مقامات کی نشاندہی اور ان کا ترجمہ کر دیں اور مصنف سیرت کو ان سے پوری واقفیت ہو جائے۔

ان تصانیف کا جس قدر ترجمہ ہو کر سامنے آتا گیا اس سے یورپ کی غلط بیانی بددیانتی اور تعصب بھی عیاں ہوتا گیا۔ ایک خط میں مولانا حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں کہ "یورپین مؤرخوں پر روز بروز حیرت بڑھتی جاتی ہے، نولدیکی اور گولڈ زیہر (GOLDZIHER) کا ترجمہ دیکھ رہا ہوں عجیب قیاس آفرینیاں نظر آتی ہیں(۴)۔ مولانا

۱-سیرۃ النبیؐ ج۱، ص ۶۲۔ ۲-ایضاً۔ ۳-مکاتیب شبلی ج۱، ص ۲۲۵ و ج۱، ص ۲۰۱ و ج۱، ص ۹۱ مولانا شروانی اور ریاض حسن خاں خیال کے نام مکاتیب میں۔ ۴-ایضاً، ج۱، ص ۳۸۔

حبیب الرحمٰن خاں شیر وانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یورپین مؤرخوں کی تصنیفات کشت زعفران نظر آتی ہیں سیکڑوں ہوائی قلعے بناتے ہیں"۔(۱)

مولانا شیر وانی نے یورپ کی کسی کتاب پر اظہار تعجب کیا تو اس کے بعد میں لکھا کہ "آپ کو ایک کتاب پر تعجب ہے یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ مار گولیتھ سب سے بڑا عربی داں ہے اس کی تصنیف (محمدؐ) کا ترجمہ ہو رہا ہے ایک حرف بھی ساری کتاب میں صحیح نہیں (۲)۔ ان ہی کو ایک دوسرے خط میں لکھا کہ انگریزوں کی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں ان سے کذب وافتراء کا عجیب منظر سامنے آتا جاتا ہے۔(۳)

سیرت نبویؐ سے متعلق مؤرخین یورپ کی تصانیف ان کے خیالات، قابل اعتراض مقامات، تعصب، بددیانتی سے بڑی حد تک واقف ہونے کے بعد علامہ شبلی اس نتیجے پر پہنچے کہ مجموعی طور پر یورپ کے مؤرخین تعصب اور غلط بیانی سے بری نہیں ہو سکتے۔ مولوی ریاض حسن خاں خیال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یورپ کے خیالات کا بڑا حصہ سامنے آ گیا۔ سب تاروں کی ایک ہی صدا ہے کچھ غلط فہمیاں، کچھ ناواقفیت، کچھ تعصب، باقی ہیچ۔(۴)

مؤرخین یورپ کی غلط فہمیوں کے اسباب

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ ابتداً یورپ اسلام کے متعلق لاعلم تھا۔ لیکن جب اسے جاننے کی کوشش کی تو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس کے عجیب وغریب حیرت انگیز اور مبہم خیالات تھے۔ مثلاً مسلمان بت پرست ہیں، جنگ جو، غارتگر اور وحشی ہیں عیسائیوں اور ان کے قبلہ بیت المقدس کے دشمن ہیں۔ فرانسیسی مصنف ہنری دی کاستری (HENRI DE CASTERY) لکھتا ہے:

"ہر مسیحی شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے ماہوم یاماہون یا مافومیڈ اور اپلین اور تیسرا ٹرگاماں۔ ان کا خیال تھا کہ محمد (ﷺ) نے اپنے

۱۔ مکاتیب شبلی ج ا، ص ۱۹۹ — ۲۔ ایضاً ص ۲۰۲ مکتوب نمبر ۲۰۴۔

۳۔ ایضاً ج ا ص ۲۰۰ مکتوب نمبر ۲۰۳۔ — ۴۔ ایضاً جلد ۲ ص ۱۹۲

مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی، اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ
محمد (ﷺ) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا... ایک
دوسرا شاعر ریچر مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو ان الفاظ میں آمادۂ جنگ
کرتا ہے "اٹھو ماہو میڈ اور ٹرگاماں کے بتوں کو اوندھا کر دو اور ان کو آگ میں
ڈال دو اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو۔ (۱)

یورپ کے ان خیالات اور غلط فہمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ان کی یہ ابتدائی معلومات عامیانہ اور محض افسانوی قسم کی تھیں۔ یورپ میں یہ غلط فہمیاں دراصل اس زمانہ میں پیدا ہوئیں جب وہ مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑ رہا تھا۔ حالانکہ موجودہ علم تاریخ کی ابتداء اسی دور میں ہوئی (۲)۔ اس کے فوراً بعد ہی ان کا گذر اسلامی ممالک میں ہوا جہاں ان کو مسلمانوں کی علمی و عملی ترقیوں کے حیرت انگیز مناظر دیکھنے کو ملے اور مسلمانوں کے خوان کرم سے زلہ رُبائی بھی کی۔ باوجود اس کے اپنی غلط فہمیوں کو یورپ نے اس قدر شہرت دی کہ ضرب المثل ہو گئیں اس کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں مسلمانوں کے مذہب، قومیت، معاشرت، تمدن
کے متعلق یورپ میں جو غلط اور بے سروپا روایتیں پیدا ہوئیں وہ رفتہ رفتہ اس
قدر شہرت پکڑ گئیں کہ ضرب المثل کے طور پر عام و خاص کی زبانوں پر جاری
ہو گئیں اور جب تصنیف و تالیف کا زمانہ شروع ہوا تو تاریخوں، حکایتوں،
ناولوں بلکہ فلسفہ کی کتابوں میں بھی بکثرت ان کا استعمال ہونے لگا۔ (۳)

ان غلط فہمیوں کی بنیاد ابتداً مذہب کے ذریعہ رکھی گئی۔ قوموں میں جو خیالات و اثرات مذہبی اور قومی بنیاد پر دلوں میں سرایت کر جاتے ہیں ان کا تعلق گوشت پوست اور نظام عصبی سے ہو جاتا ہے اور وہ نسل در نسل باقی رہتے ہیں ان کا زائل ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ یورپ میں جب مذہب کا زور ٹوٹا تو امید تھی کہ یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی مگر ایسا نہ ہو سکا بلکہ اس نے دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:

"یورپ میں مذہب کا اب زور ختم ہو گیا ہے اس لیے قیاس تھا کہ
یہ خیالات اب مٹ جاتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بد قسمتی سے یورپ میں

۱۔ ہنری دی کاستری عربی ترجمہ مطبوعہ مصر ص ۸-۱۰ بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱، دیباچہ ص ۵۷۔
۲۔ مقالات شبلی ج ۲، ص ۱۱۱۔ ۳۔ ایضاً ص ۱۱۲

مذہب کی جگہ پالٹکس نے لی ہے اس لیے یہ خیالات اب مذہبا نہیں بلکہ پالٹکس
کی ضرورت سے قائم رکھے جاتے ہیں۔ اس قدر فرق آ گیا ہے کہ اب وہ اس
رنگ سے ادا کیے جاتے ہیں کہ تعصب کا گمان نہ ہونے پائے۔(۱)

یورپ کی غلط کاریوں کے اسباب

علامہ شبلی نے یورپ کی غلط کاریوں کے متعدد اسباب بتائے ہیں اور اپنی تحریروں میں جابجا اس کی وضاحت کی ہے جن کی تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) سب سے اہم سبب اُن کی تعصب ہے اس کی ابتداء مسلمانوں کی فتح اندلس سے ہوئی۔ ترکوں کی فتوحات نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ چنانچہ یورپ میں جب تصنیف و تالیف کی ابتداء ہوئی اور یورپ نے اپنے حدود سے باہر اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کتابیں لکھیں تو اس میں غالب حصہ انھیں تعصبات اور غلط بیانیوں کا تھا جو مدت سے یورپ کے ورد زبان تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں مادیّت، ملک گیری اور ملوکیت کی ایک زبردست لہر پیدا ہوئی جس نے ایک طرف یورپ میں نسل اور محدود قومیت کے تخیل کو بیدار کیا اور دوسری طرف اس جذبہ کے ماتحت ایشیا کی اسلامی سلطنتوں پر قبضہ کرنے کے لیے بانی اسلام ﷺ اور نئی پرانی اسلامی حکومتوں کے متعلق وسیع پیانے پر غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں۔ اس ملوکیت کی تبلیغ نے مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں، کبھی آزادی جمہور کا صور پھونکا گیا، کبھی شخصی آزادی اور مساوات و اخوت کے نغمے گائے گئے، اور کبھی بے تعصبی اور عام رواداری کے خطبے سنائے گئے۔ لیکن اسلام اور شاہان اسلام پر حملے ہر حالت میں جاری رہے۔(۲)

یورپ کے خیالات میں آہستہ آہستہ وسعت پیدا ہوئی اور مؤرخین مغرب غیر جانبداری کی طرف مائل ہوئے۔ مذہب کا زور ٹوٹا، یہاں تک کہ اس کا اثر بھی چنداں قوی نہ رہا، تاہم بقول علامہ شبلی نعمانی:

۱۔ مقالات شبلی ج ا ص ۱۲۲۔ ۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، شبلی کا نظریہ تاریخ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ج ۱۴۲، شمارہ ۴، ص ۲۹۰۔

> ''جب کبھی پولیٹیکل ہوا چلتی ہے تو یہ دبی چنگاری اس قدر جلد بھڑک اٹھتی ہے کہ تمام یورپ میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔(۱)

مسلمانوں سے واقف ہونے کے ذرائع جب یورپ میں وسیع ہوئے اور اسلامی ممالک کا بڑا حصہ ان کے قبضے میں آگیا تو خود یورپ میں سیکڑوں عربی داں علماء پیدا ہوگئے۔ عربی زبان کی بے شمار کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہونے لگیں۔ اور ینٹل کانفرنس نے مشرق ومغرب کے ڈانڈے ملادیئے اور مسلمانوں کے خیالات وعقائد سے واقف ہونے کے متعدد مواقع یورپ کو حاصل ہوئے مگر باوجود ان تمام باتوں کے یورپ کے طرز میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:

> ''غلط معلومات کا بادل جو آج سے کئی سو برس پہلے یورپ کے افق پر چھایا تھا اب تک نہیں ہٹا۔ بہت سے بہت یہ ہوا کہ وہ کسی قدر ہلکا ہوگیا لیکن فضا میں اب بھی اس قدر تاریکی ہے کہ اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا (ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا)۔(۲)

اور یہ کہ:

> ''یورپ کے مؤرخین جب مسلمانوں کے متعلق کوئی کتاب یا رسالہ یا مضمون لکھتے ہیں تو ایسی بے سروپا باتیں لکھ جاتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان دفعتاً متحیر ہوجاتا ہے۔(۳)

پروفیسر مارگولیتھ عربی زبان کا بڑا عالم ہے باوجود اس کے اسلام کا سخت دشمن(۴)، سخت بددیانت اور غلط نتائج نکالنے والا ہے(۵)۔ علامہ شبلی اس کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اس کی لائف آف محمدؐ دیکھنے کے قابل ہے عبدالمطلب، مطلب کے غلام تھے کعبہ آنحضرت ﷺ سے صرف سو برس پہلے کی عمارت ہے''۔(۶)

اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھتے ہیں:

۱-مقالات شبلی ج۱، ص۱۸۵۔ ۲-ایضاً۔ ۳-ایضاً ص۱۲۱۔
۴۔ مکاتیب شبلی ج۲، ص۱۹۰۔ ۵۔ ایضاً ج۱ ص۲۹۱۔ ۶۔ ایضاً ص۲۰۱

"دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب وافتراء اور تاویل؛
تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ
سادہ سے سادہ اور معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا
صرف اپنی طباعی کے زور سے بد منظر بنا دیتا ہے"۔(۱)

دوسرے مستشرق اور یورپ کے فاضل مؤرخ سخاؤ (SOKHAU) کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے
بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے
قابل ہے۔ لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے
جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے
دیکھا تھا۔(۲)

نولدیکی (NOWLEDEKE) کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نولدیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا لیکن انسائیکلو پیڈیا
(جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب
بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔(۳)

علامہ شبلی کی ان تحریروں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یورپ کی غلط کاری اور بددیانتی کی اصل وجہ ان کا اسلام سے تعصب تھا اور اسی تعصب نے یورپ کو اسلام کی صحیح اور سچی تعلیمات سے دور رکھا اور خود یورپ طرح طرح کے توہمات میں مبتلا رہا۔

(۲)- یورپ کی غلط فہمی کا ایک سبب یہ بھی رہا کہ خود مسلمانوں نے اپنے علمی خزانے کی حفاظت واشاعت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا۔ ان کے اس سرمایہ علمی کے مفقود ہونے کی وجہ سے بھی بہت سی غلط فہمیاں عام ہو گئیں جن کے اثر سے مسلمان بھی محفوظ نہ رہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہے:

مسلمانوں کا تاریخی سرمایہ بہت کچھ مفقود ہو چکا اور ہوتا جاتا ہے
اس نے علاوہ اور بہت سے نقصانات کے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ خود

۱- سیرۃ النبی ج ادیباچہ ص ۶۲ ۲- ایضاً۔ ۳- ایضاً

مذہب اسلام کے متعلق دنیا کو عجیب عجیب غلطیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو گئیں
خود مسلمان بھی ان غلطیوں سے بچ نہیں سکتے وہ بھی مذہب کی وہی حقیقت
سمجھتے ہیں جو معلومات کے مفقود ہونے نے کئی سو برس سے قائم کر دی
ہے۔(۱)

(۳)-یورپ کی غلط فہمیوں کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ خود مسلمانوں نے بھی اپنی تصانیف میں غلطیوں سے احتراز نہیں کیا اور بہت سی بے سروپا باتیں لکھ دیں۔ علامہ شبلی مولوی سید نواب علی پروفیسر بڑودہ کالج کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

سیرت کے متعلق یورپ کی غلط کاریوں کا تعجب نہیں جب کہ
خود اسلامی مؤرخین اور ارباب روایت نے سیکڑوں غلطیاں کی ہیں(۲)۔
یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے ان کے ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں
ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے
یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔(۳)

مثلاً مؤرخین یورپ کا تمام تر سرمایہ استناد سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ لیکن یہ کتابیں استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ نہیں اور ان میں بہت سی خامیاں راہ پا گئی ہیں، دوسرے یہ کہ سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں وہ ضعیف الروایۃ ہیں۔(۴)

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ سیرت کے یقینی اور صحیح واقعات حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں جس سے مؤرخین یورپ بے خبر ہیں اور اگر ایک آدھ کوئی ہے تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے۔(۵)

(۴)-اسلامی مؤرخین اور اہل یورپ کے اصول تنقیح شہادت میں بہت اختلاف ہے۔ اسلامی مؤرخین صداقت پر بہت زور دیتے ہیں مگر یورپ اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب۔ اگر ایک جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرے جو قرائن موجودہ اور

۱-مقالات شبلی ج ۵ ص ۵۲۔ ۲-مکاتب شبلی ج ا ص ۳۱۴ ۳-ایضاً، ص ۲۴۲
۴-سیرۃ النبی ج ا ص ۶۳ ۵-ایضاً

گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہو اور بیان میں تسلسل بھی ہو تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی(۱)۔

(۵)-یورپ کی غلط کاریوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بعض بادشاہوں کے ذاتی افعال کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں(۲)۔ حالانکہ یہ انفرادی اور بادشاہوں کے ذاتی افعال ہیں جو یورپ کے حکمرانوں سے بھی سرزد ہوتے ہیں اس کے لیے مذہب کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(۶)-یورپ کی غلط بیانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ قدیم زمانہ کا موازنہ دور جدید سے کرتا ہے۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں "یورپ موجودہ طرز سلطنت سے ایشیائی حکومتوں کو ناپتا ہے(۳)۔ حالانکہ دونوں کے طرز حکومت اور آئین سلطنت میں بڑا فرق ہے۔

غرض یورپ کی غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں کے اسباب متعدد ہیں اور گو بعد کے چند مغربی مفکرین و مؤرخین نے ان کا اعتراف بھی کیا ہے مگر عام باتوں میں اس کا زور کم نہیں ہوا، علامہ رقمطراز ہیں:

> یورپ میں جو نامور محقق ہیں اکثر ان بیہودہ روایتوں کو غلط تسلیم کرتے جاتے ہیں جو اسلامی واقعات کے متعلق وہاں پیدا ہوگئی تھیں۔ چنانچہ گبن، کارلائل، گاڈفری، میکنز، باسورتھ، رینان، سیدیو وغیرہ نے عموماً ان واقعات سے صاف انکار کیا ہے لیکن تفصیلات اور عام روایتوں میں ان غلطیوں کا زور اب بھی کم نہیں ہوا(۴)۔

علامہ شبلی نے یورپ کی چند اہم کذب بیانیوں اور افترا پردازیوں کا رد کیا ہے۔ الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر جیسے تاریخی، تحقیقی اور علمی مقالات مؤرخین یورپ کی علمی بے راہ روی اور غلط بیانی کے خلاف قلمبند کیے گئے ہیں۔ درحقیقت یورپ کی کذب بیانی اور افترا پردازیوں کی پردہ دری ان کا مقصد حیات تھی جس کے لیے بڑی طویل مدت حیات درکار تھی، رقمطراز ہیں:

> اگر دنیا کی عجیب و غریب غلط فہمیوں کی فہرست تیار کی جائے تو ان میں یورپ اور یورپین مؤرخوں کی غلط بیانیوں کو سب سے اونچے درجے پر

۱-سیرۃ النبی ج ۱،ص ۶۳ ۲-المامون ص ۱۰۳۔ ۳-ایضاً ص ۵۳ ۴-مقالات شبلی ج ۶،ص ۱۱۴

رکھنا پڑے گا اور اگر کوئی شخص ان غلط فہمیوں کو دور کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لے تو اس کے لیے یہ عمر کافی نہ ہوگی بلکہ اس کام کی تکمیل کے لیے اسے خدا سے ایک اور عمر کی دعا کرنی پڑے گی (۱)۔

یورپ کی علمی فیاضیوں کا اعتراف

اس سخت تنقید، طاقت ور ردّ و ابطال اور انتہائی سخت رائے کے باوجود علامہ شبلی یورپ کی بعض خوبیوں کے مداح بھی تھے۔ خاص طور پر مستشرقین نے مسلمانوں سے سخت تعصب کے باوجود اسلامی علوم و فنون کی اشاعت میں جس قدر دلچسپی لی اور مسلمانوں کی نایاب بلکہ نادر الوجود کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کیا، ان پر مقدمے اور حواشی لکھے اور ترتیب و تحقیق کی مشقتیں برداشت کیں۔ اس کی ابتداء سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مستشرقین کے وجود سے ہوئی، اور انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ نے مسلمانوں کی سیرت، مغازی اور تاریخ و تہذیب سے متعلق بیشتر کتابیں ایک ایک کر کے شائع کر دیں۔ انھوں نے سیکڑوں کتابوں کا یورپ کی زبانوں میں ترجمہ کیا، حکومت کے اشارے پر السنہ مشرقیہ کے مدارس قائم کیے، مشرقی کتب خانوں کی جا بہ جا بنیاد ڈالی، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں اور واقعتاً اسلامی علوم و فنون کے فروغ و اشاعت میں ایک مثال قائم کر دی۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں "خاص اسلامی علوم و فنون کو اس قدر ترقی دی کہ پچھلے کارنامے بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں" (۲)۔ غرض یورپ کی علمی فیاضیوں اور ان کی خدمات کی ایک طویل تاریخ ہے جس کا اعتراف و ذکر علامہ شبلی نے بار بار کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> یورپ نے ہماری یادگاروں کو زندہ کرنے میں جو کام کیے ہیں وہ کیا کم ہیں۔ انھیں کی بدولت فن حرب کی وہ کتاب شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اس فن کے علمی اصول مرتب کیے تھے اور ان کا فن جنگ موجودہ فن جنگ کا مکمل خاکہ تھا۔ یورپ ہی کی بدولت زہراوی کی کتاب فن تشریح سے متعلق چھپ کر شائع ہوئی جس میں کئی سو آلات تشریح کی تصویریں اور ان کے استعمال کے طریقے درج ہیں۔۔۔ یورپ ہی کی بدولت تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور تاریخ الحکماء وغیرہ کا پتہ لگا جو گویا

۱۔ رسائل شبلی بحوالہ ڈاکٹر سید عبد اللہ، سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۸۴۔ ۲۔ مقالات شبلی ج ۸، ص ۱۰۵

دنیا سے ناپید ہو گئی تھیں۔(۱)

یورپ کی اس علمی فیاضی اور فراخدلی کے بھی متعدد اسباب تھے۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ابتداً یورپ جب اسلام سے واقف ہوا تو اس کی معلومات محض سنی سنائی اور عامیانہ قسم کی باتیں تھیں۔ اب وہ اسلام سے براہ راست واقف ہونا چاہتا تھا، اس میں بعض سیاسی اغراض و مقاصد بھی پنہاں تھے۔ یورپ کا جب اسلامی ممالک میں گذر ہوا تو وہاں مسلمانوں کی علمی و عملی ترقیوں کے سبب یورپ کو مسلمانوں کی علمی فضیلت و برتری کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس فراخ دلی میں یہ خیال بھی کار فرما نظر آتا ہے کہ مسلمانوں نے یہ علمی فضیلت کیونکر حاصل کی اس کو جاننے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے علوم و فنون کو سیکھنے اور حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یورپ کی یہ فیاضیاں اسی پس منظر میں دیکھنے کے لائق ہیں، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> یورپ کی یہ فیاضی دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف مذہبی اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوان کرم سے زلہ ربائی شروع کر دی(۲)۔

یورپ کی علمی فیاضی و فراخدلی کے پس پشت جو بھی مقاصد رہے ہوں وہ اس بات کا ضرور مستحق تھا کہ اس کے کاموں کا اعتراف کیا جائے اور ان کی علم دوستی، معارف پروری اور فراخ دلی کی تعریف کی جائے۔ علامہ شبلی طبقات ابن سعد کی اشاعت پر لکھتے ہیں:

> ہم کو فیاض دلی سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم و فنون کے ساتھ جو اعتناء ہے اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کے بیش بہا نوادر ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کر رہا ہے ہم خود نہیں کرتے بلکہ نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج تک یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کی ہیں۔(۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ہم یورپ کی علمی فیاضیوں کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں لیکن یورپ اپنی فیاضیوں سے نہیں تھکتا۔(۴)

۱-مقالات شبلی ج ۴، ص ۶۷۔ ۲-ایضاً، ج ۵ ص ۴۹-۵۰۔ ۳-ایضاً، ج ۴، ص ۱۔ ۴-ایضاً ص ۲۹

غرض یورپ اپنی علمی فیاضیوں اور اسلامی خدمات کے لیے جس مدح و ستائش کا مستحق تھا علامہ شبلی نے مسلمانوں کی طرف سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ راقم کا خیال ہے کہ یورپ کی اس علم دوستی کا جس قدر اعتراف اور شکریہ علامہ شبلی نے ادا کیا ان کے معاصرین میں اتنا شاید ہی کسی نے کیا ہو ان کو خود احساس تھا کہ یورپ کی علمی فیاضیوں کا ذکر اس قدر بار بار کر چکا ہوں کہ مزید کچھ اور کہوں تو لوگ بول اُٹھیں گے

ایں آں فسانہ ایست کہ صد بار گفتہ

لیکن اگر ہر نئے احسان کا نیا شکریہ واجب ہے تو یہ ذکر کرنا پڑے گا اور بار بار کرنا پڑے گا۔(۱)

علامہ شبلی کے اس اعتراف و شکر میں یہ اشارہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ خود مسلمان اس طرف توجہ نہیں دیتے تو وہ مایوس ہو کے کہتے ہیں:

> مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر سخت حیرت زدہ ہو گیا۔ علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے ہیں کیا کہوں اپنے علما کی بد قسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔(۲)

علامہ شبلی نے متعدد مقامات پر یورپ اور عالم اسلام کا موازنہ کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو کام یورپ کر رہا ہے وہ دراصل ہمارے کرنے کا کام تھا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمان دنیا کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہیں اور اپنے علوم و فنون کی قدردانی کا ان کو دعویٰ بھی ہے مگر یورپ نے اسلام سے متعلق جو کچھ کیا ہے مسلمانوں نے آج تک اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں کیا(۳)۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> اسلام آج دنیا کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے کروڑوں مسلمان موجود ہیں بڑی بڑی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہیں عربی علوم و فنون اسی زور و شور کے ساتھ پڑھے اور پڑھائے جا رہے ہیں اس بنا پر دنیا کو ہم سے اس کام کی توقع تھی لیکن ابھی ہم کو اور ضروری کاموں سے فرصت کہاں ہے۔(۴)

پھر اس عدیم الفرصتی، بے توجہی اور مسلمانوں کے بے مقصد کاموں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔مقالات شبلی، ص۱۹ ۲۔مکاتیب شبلی ج۱، ص ۱۳۲۔ ۳۔مقالات شبلی ج۴ص ۱۹۔ ۴۔ایضاً ص ۶۷

حمد اللہ کے بعض ضروری مقامات اب تک ناحل شدہ ہیں شرح ملا کی ایک ضمیر کا مرجع اب تک متعین نہیں ہوا، میر زاہد کی بعدیت زمانی اور مکانی کا اب تک فیصلہ نہیں ہو سکا اور خیر یہ سب کام تو اٹھا بھی رکھے جا سکتے ہیں لیکن شیعوں کی تکفیر تو بہر حال مقدم ہے اور گو وہابیوں کا استیصال اس قدر ضروری نہ ہو لیکن آخر اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔(۱)

علامہ شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمانوں کو جو کام کرنا چاہیے اور جس پر قومی ترقی کا انحصار ہے وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور دوسرے دوسرے بیکار اور لایعنی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ یورپ کی علمی ترقیوں اور اس کے اسباب کا مسلمانوں سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کو کافر بنانے میں مصروف ہیں اور اس کام میں وہ کوششیں کرتے ہیں جو صحابہؓ کافروں کو مسلمان بنانے میں کرتے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آب حیات برسا رہا ہے۔ دنیا کے تمام قوموں کے مردہ علوم و فنون تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے اُلٹ اُلٹ کر نکالے جا رہے ہیں اور دنیا کی نمائش گاہ ان گمشدہ جواہرات سے اس طرح سجادی گئی ہے کہ گویا پچھلا زمانہ اسی سر و سامان سے دوبارہ سامنے آ گیا ہے۔(۲)

یورپ کی بے اعتدالیاں

علامہ شبلی نے فن تاریخ کے ساتھ یورپ کی دلچسپی اس فن میں ان کی دقیقہ سنجی اور ایجاد و اختراع کی جا بہ جا تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی یورپ کی جس چیز کے سب سے زیادہ قائل تھے وہ فلسفہ تاریخ ہے(۳)۔ خود علامہ شبلی لکھتے ہیں:

یورپ میں آج کل فن تاریخ کو اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ تاریخی واقعات کے ساتھ اس قدر اعتناء کیا جاتا ہے کہ ایک ایک جزئی واقعہ کی ہر قسم کی جزئی خصوصیات کا استقراء کیا جاتا ہے۔(۴)

۱- مقالات شبلی، ص ۶۷۔ ۲- ایضاً، ج ۴ ص ۵۴۔

۳- شبلی کا نظریۂ تاریخ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، ج ۱۴۱ شمارہ ۴، ص ۲۸۶۔ ۴- مقالات شبلی ج ۴، ص ۲۲-۲۳

تاریخی واقعات کے اسباب و علل پر غور و فکر کرنے اور اس سے نتائج مستنبط کرنے کے طریقے کی ابتدا یورپ نے کی اور فن تاریخ میں جس ایجاد و اختراع پر انھیں ناز ہے وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے(۱)، اور یہی وہ چیز ہے جو اسلامی مؤرخین کے یہاں مفقود ہے۔ انھوں نے المامون کے دیباچہ میں اسی بنیاد پر یہ لکھا کہ:

> موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہنچ گیا ہے، اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ اضافے کیے ہیں اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصانیف ہمارے مقصد کے لیے بالکل کافی نہیں۔ (۲)

بلاشبہ اسباب و علل کی تلاش اور اس سے نتائج مستنبط کرنے کا طریقہ فن تاریخ میں یورپ کا ایک اضافہ ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی تحریروں میں یورپ کی اس ایجاد و اختراع کی تعریف کی ہے اور خود بھی اسے مؤرخ کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں یورپ نے جو بے اعتدالیاں کی ہیں علامہ شبلی نے اس پر واشگاف انداز میں تنقید بھی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مؤرخین یورپ اپنی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کے سبب اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتے ہیں اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں (۳)۔ اسی طرح وہ واقعہ کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لیے ایسی ترتیب اور انداز سے اسے لکھتے ہیں کہ واقعہ بالکل ان کے اجتہاد کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی شخص قیاس و اجتہاد کو اصل واقعہ سے الگ کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ (۴)

یورپ کے مؤرخین علت و معلول کی تعیین میں بھی بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں اور دو ہم زمان واقعات کو علت و معلول فرض کر لیتے ہیں مثلاً علامہ شبلی کے الفاظ میں "جب تاریخ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد ایرانیوں کا لٹریچر برباد ہو گیا تو وہ قطعی طور سے یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ اسلام ہی کے طرز عمل کا نتیجہ تھا... یا جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں پارسی قوم کے معابد کا، پیشوایان مذہبی کا، تصنیفات کا، تعلیم و تلقین کا پتہ نہیں چلتا تو ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے سلاطین نے تعصب کی وجہ سے یا تو

۱- المامون ص ۱۱۔ ۲- ایضاً ص ۱۰۔
۳- سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۸۔ ۴- الفاروق حصہ اول ص ۱۹۔

سرے سے ان کو ملک میں گھسنے نہیں دیا یا انھیں ایسی حالت میں رکھا کہ ان کی کوئی امتیازی حیثیت قائم نہ رہی۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہے تاریخی کم مائیگی کا قصور ہے۔(۱)

تاریخ نگاری میں صداقت وہ بنیاد ہے جس پر فن تاریخ کی سر بہ فلک عمارت کھڑی ہے۔ اسلامی مؤرخین نے اس پر بہت زور دیا ہے یہاں تک کہ وہ سچائی کی تلاش میں اپنی قومیت مذہب اور تاریخ کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ مگر یورپ نے اس میں بھی بڑی بے اعتدالیاں کی ہیں مثلاً علامہ شبلی کے الفاظ میں یورپ کو "یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ وہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لیتے ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن و قیاس کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔(۲)

علامہ شبلی کا نظریۂ تاریخ

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی مشرق و مغرب کے قدیم و جدید اہم نظریہ ہائے تاریخ سے بہ خوبی واقف تھے۔ وہ جہاں اسلامی مؤرخین کے تاریخی اصول و آداب، رجحانات اور افکار و خیالات پر وسیع نظر رکھتے تھے وہاں ان سے خاطر خواہ طور پر استفادہ اور مغربی مؤرخین کے عمدہ اصولوں سے بھی اخذ و استنباط کیا تھا۔ انھوں نے اگر اسلامی مؤرخوں کے نقائص پر تنقید کی ہے تو یورپ کی بے اعتدالیوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس فن میں ان کی کاملیت و جامعیت اور فہم و بصیرت کی وجہ سے یہ کہنا بجا ہو گا کہ وہ خود ایک نظریہ تاریخ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

> وہ صرف مؤرخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع و نقاد بھی تھے۔ انھوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمائے پر جو تنقید کی ہے وہ بلاشائبہ مبالغہ اصول تاریخ کے لیے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے۔(۳)

علامہ شبلی کے فلسفہ تاریخ کے متعلق دور جدید کے دیدہ ور مؤرخ پروفیسر خلیق

۱- مقالات شبلی ج۵، ص ۹۲-۹۳۔ ۲- سیرۃ النبی ج۱ دیباچہ ص ۲۴۔
۳- سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۷۲

احمد نظامی لکھتے ہیں:

فن تاریخ نویسی میں مولانا شبلی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی ایرانی اور مغربی نظریہ ہائے تاریخ کو ایک فکری وحدت میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا کہ اس میں عربوں کی حقیقت نگاری، ایرانیوں کا ذوق ادب اور مغرب کا انداز تحقیق جمع ہو گیا۔(۱)

تاریخ کی تعریف

ہم یہاں علامہ شبلی کی مذکورہ بالا تاریخی خصوصیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کی تعریف ایک بڑے مصنف اور ایک حکیم کے حوالہ سے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کیے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے۔ یا ان حالات کا پتہ چلانا جن سے دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گذشتہ زمانہ سے کیونکر بطور نتیجہ پیدا ہوا"۔(۲)

دوسری جگہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چونکہ یہ مسلّم ہے کہ آج دنیا میں جو تمدن، معاشرت، خیالات مذاہب موجود ہیں سب گذشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونے چاہیے تھے۔ اس لیے ان گذشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ ہر موجودہ واقعہ گذشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا اسی کا نام تاریخ ہے"۔(۳)

علامہ شبلی کا فلسفۂ تاریخ جن اصولوں پر مشتمل ہے ان کی تصریح خود انھوں نے اپنی تحریروں میں جابجا کی ہیں، مثلاً تاریخ کیا ہے۔ تاریخ کا مقصد کیا ہے، مؤرخ کے فرائض کیا ہیں اسے کن کن باتوں کا علم ہونا چاہیے، اسے کن باتوں پر عمل اور کن سے احتراز کرنا چاہیے، مورخ کا انداز تحریر کیسا ہو۔ یہاں علامہ شبلی کے انھیں اصولوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا

۱- معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۸۸۔ ۲- الفاروق ص ۹ ۳- ایضاً

ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے مشرق و مغرب کی تاریخی خوبیوں کو کس حد تک استعمال کیا اور خامیوں کو کن بنیادوں پر نظر انداز کیا۔ گویا مجموعی طور پر ان کے فلسفہ تاریخ کا تصور کیا ہے۔

پہلا اصول

مؤرخ جس عہد کی تاریخ لکھے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس عہد کے تمام حالات و واقعات لکھے۔ مثلاً تہذیب و تمدن، معاشرت، اخلاق و عادات، مذہب گویا ہر چیز سے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔ صرف سیاسی امور، فتح و شکست، معرکوں اور خانہ جنگیوں کا تذکرہ نہ ہو۔ اور سیاست اور تاریخ معاشرت کی داستان طرازی کا فرق اور مؤخر الذکر کی اہمیت علامہ شبلی کی اس بلیغ تحریر سے ظاہر ہے کہ:

> ''کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر ڈالا''۔(۱)

شروع میں مشرق و مغرب کے بیشتر مؤرخین محض جنگ و جدل اور امور سیاست کے واقعات بیان کرتے رہے۔ لیکن اس طرز تاریخ نویسی سے بقول علامہ شبلی ''انسانی تہذیب و معاشرت کے بہت سے روایات اور شاندار آثار مٹ گئے''۔ خود مسلمانوں کی تاریخ کے بہت سے عجیب و غریب کارنامے گمنامی کی خاک میں دفن ہو گئے(۲)۔ علامہ شبلی خاص طور پر ایشیائی مؤرخین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ایشیائی مؤرخین کی عادت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں صرف جنگ و جدل، بغاوت اور خونریزی کے واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں۔ اس لیے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصائی کی دکان کہتے ہیں اور واقعی ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، پالٹکس، معاشرت، خانگی زندگی کا پتہ لگانا ہو تو بہت کم کامیابی ملے گی''۔(۳)

ایرانی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ایران کی تاریخ میں دور از کار واقعات کثرت سے ہیں اور

۱۔ مقالات شبلی ج ۶، ص ۱۱۴۔ ۲۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔ ۳۔ ایضاً ج ۴، ص ۵۹۔

فردوسی کی شاعرانہ رنگ آمیزی نے تو تاریخ کو ناول بنا دیا"۔(۱)

اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے جو یورپ کے عہد ظلمت سے نکلنے کا عہد ہے، خود یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے نزدیک بھی کسی سلطنت کی عظمت، سطوت اور پستی و تنزل کا معیار فتوحات ملکی تھیں(۲)۔

اسلامی مؤرخوں نے یہی مروجہ اور عام طرز سیرت نگاری میں بھی اختیار کیا۔ چنانچہ ابتداء جو کتابیں سیرت پر قلمبند کی گئیں ان کا نام اسی طرز نگارش کی وجہ سے مغازی رکھا گیا اور ان میں صرف عہد رسالت کے معرکوں کا ذکر کیا گیا۔ حالانکہ یہ طرز نگارش نبی کریم ﷺ کے سوانح نگاروں کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھا، کیونکہ علامہ شبلی کے الفاظ میں "یہ سکندر کے سوانح نہیں بلکہ فرشتہ یزدانی کی سیرت تھی"(۳)۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس طرز تاریخ نگاری کا یہ حال ہے کہ بقول علامہ شبلی "تاریخوں میں حالات جنگ کے ہزاروں صفحے پڑھ کر بھی فن جنگ کے اصول پر کوئی معتد بہ اطلاع نہیں ملتی"۔(۴)

دوسرا اصول

مؤرخ کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کرے کیونکہ اس کے بغیر واقعات اپنی اصلی صورت میں سامنے نہ آسکیں گے اور چونکہ "تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے"(۵)۔ مثلاً یہ کہ چند صحرا نشینوں نے کیونکر فارس و روم کا دفتر اُلٹ دیا اور یہ کہ عباسیہ اور سادات کے ہوتے ہوئے بنوامیہ کیونکر خلافت پر قابض ہو گئے۔ اس لیے ان اسباب کا پتہ لگانا نہایت ضروری ہے اور ایک مورخ بغیر ان امور کا سراغ لگائے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ نہیں سکتا، علامہ شبلی کے الفاظ میں:

> "انھیں ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج مستنبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے"۔(۶)

باوجود اس اہمیت کے علامہ شبلی کو شکایت ہے کہ ایک جانب اسلامی مورخوں نے اس اصول کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھا تو دوسری جانب یورپ نے اس سے غلو کی حد تک

۱-مقالات شبلی ج ۴، ص ۲۵۔ ۲-ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ج ۱۴ ش ۳ ص ۲۰۰
۳-سیرۃ النبیؐ ج ۱ دیباچہ ص ۲۵۔ ۴-الفاروق حصہ اول ص ۱۱۔ ۵-المامون ص ۱۱۔ ۶-ایضاً ص ۱۱۔

اعتناء کیا اس لیے وہ راہِ اعتدال سے بھٹک گیا۔ چنانچہ انھوں نے اسباب و علل کی تلاش اور ان سے نتائج مستنبط کرنے میں یورپ کی بے اعتدالیوں سے احتراز کیا ہے۔

تیسرا اصول

واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کے لیے اکثر جگہ قیاس و اجتہاد سے مورخ کو کام لینا پڑتا ہے اور چونکہ وہ اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا اس لیے اس کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس و اجتہاد کو اصل واقعہ میں اس قدر مخلوط نہ کردے کہ کوئی شخص اگر دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔(۱)

قیاس و اجتہاد سے جو رائے قائم کی جاتی ہے اسلامی مورخین نے اسے اصل واقعہ میں مختلط ہونے سے بچانے کے لیے اس قدر احتیاط کی کہ گرد و پیش کے ظاہری اسباب و علل پر بھی نظر نہ ڈالی اور واقعات کو خشک اور ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ مثلاً انھوں نے اکثر غزوات کا تذکرہ اس طرح شروع کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں مگر فوجیں بھیجنے کے اسباب پر مطلق روشنی نہیں ڈالی۔ اسلامی مورخوں کی اس غیر ضروری احتیاط سے بقول علامہ شبلی "عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، حالانکہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے"(۲)۔

اسباب و علل کی طرف اسلامی مورخین کے توجہ نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے تاریخ میں واقعیت اور صداقت کے پہلو پر اپنی ساری توجہ مبذول کر دی۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> "اسلامی مؤرخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑیگا۔ اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی

۱- الفاروق ص ۱۸-۱۹۔ ۲- سیرۃ النبی ج ۱ دیباچہ ص ۳۹۔

قربان کر دیتا ہے"(۱)۔

اس کے برعکس مغربی مؤرخین نے اسباب و علل کی تلاش پر بہت زور دیا، مگر اس میں انھوں نے اپنی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کی وجہ سے بڑی بے اعتدالیاں کیں۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:

"وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلومات پیدا کرتا ہے اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہے وہ اپنے مقصد کو محور بنالیتا ہے تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں"(۲)۔

علامہ شبلی نے یورپ کی اسی بے اعتدالی کو طرز استدلال کی ملمع سازی اور یورپ کا خاص انداز قرار دیا ہے(۳)۔

غرض اسباب و علل کی تلاش میں قیاس و اجتہاد سے نتائج مستنبط کرنے کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے ایک معتدل اصول پیش کیا ہے جیسا کہ اوپر کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

چوتھا اصول

مؤرخ جو واقعہ قلمبند کرے اس کی صحت و صداقت مسلّم ہونی چاہیے۔ صحت واقعہ کی تعیین کے لیے مغربی مؤرخین کے یہاں کوئی اصول و ضابطہ نہیں ہے۔ البتہ اسلامی مؤرخین نے اس پر بہت زور دیا اور اس کے لیے دو اصول روایت و درایت ایجاد کیے۔ علامہ شبلی نے ان دونوں اصولوں کو صحت واقعہ کے لیے نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

پانچواں اصول: روایت

جو واقعہ قلم بند کیا جائے اس شخص سے کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے۔ کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے یا غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں، عالم تھے یا جاہل(۴)۔

۱- سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ ص ۳۸-۳۹۔ ۲- ایضاً۔
۳- الفاروق حصہ دوم ص ۴۔ ۴- سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ ص ۲۴-۲۵۔

علامہ شبلی نے روایت کو اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

"اس امر پر مسلمان بے شبہ فخر کر سکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انھوں نے جس قدر اعتنا کیا کسی قوم نے کبھی نہیں کیا۔ انھوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفحص اور تلاش سے بہم پہنچائے کہ اس کو ایک مستقل فن بنا دیا جو فن رجال کے نام سے مشہور ہے"(۱)۔

یہ اصول اصلاً مسلمانوں نے فن حدیث کے لیے وضع کیا تھا مگر فن تاریخ میں بھی مسلمانوں نے اس سے کام لیا(۲)۔ قدیم مؤرخین اسلام نے اپنی تصنیفات میں اس کا سختی سے التزام کیا، البتہ متاخرین نے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جب کہ یورپ کے مؤرخین اس فن کے نام سے بھی واقف نہیں۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"یورپ نے فن تاریخ کو آج کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے لیکن اس خاص امر (روایت) میں وہ مسلمان مؤرخوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ان کو واقعہ نگار کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ جرح و تعدیل کے نام سے بھی آشنا نہیں"(۳)۔

چنانچہ یورپ میں جب کوئی واقعہ مدت کے بعد قلمبند کیا جاتا ہے تو چونکہ مؤرخین یورپ جرح و تعدیل اور روایت کے اصولوں سے واقف نہیں اس لیے بقول علامہ شبلی:

"ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں"(۴)۔

چھٹا اصول: درایت

مؤرخ جو واقعہ لکھے وہ عقلی شہادت کے مطابق ہو یا واقعہ پر اصول درایت سے تنقید

۱- الفاروق حصہ اول، ص ۱۲۱۔ ۲- ایضاً۔ ۳- ایضاً۔ ۴- سیرۃ النبیؐ ج ا دیباچہ ص ۲۴۔

کرے واقعہ کی صحت کا تعین کرے مثلاً:

۱- واقعہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲- واقعہ کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کا میلان عام مخالف تھا یا موافق؟

۳- واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴- اس امر کی تفتیش کی جائے کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اس کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

۵- راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶- اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں(۱)۔

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ ”ان اصولوں کی صحت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور ان کے ذریعہ بہت سے مخفی راز معلوم ہو سکتے ہیں“(۲)۔

روایت و درایت دونوں اصولوں کی ابتداء قرآن مجید سے ہوئی(۳)۔ روایت کے ساتھ مسلمان مورخوں نے اس قدر اعتناء کیا کہ اسے ایک قابل فخر فن بنادیا۔ مگر درایت کو جس قدر ترقی دینی چاہیے تھی وہ اس سے محروم رہا اور فن تاریخ میں تو اس کا نام بھی نہیں لیا گیا۔ ابن مسکویہ پہلا مورخ ہے جس نے تجارب الامم میں پہلی بار اس موضوع پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ابن خلدون نے درایت کی طرف خاص توجہ دی اور اس کے اصول نہایت باریک بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ مرتب کیے۔ ان کا خیال ہے کہ ”واقعہ کی تحقیق میں پہلے جرح و تعدیل سے بحث نہیں کرنی چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعہ فی نفسہ ممکن بھی ہے یا نہیں کیونکہ اگر واقعہ کا ہونا ممکن ہی نہیں تو راوی کا عادل یا ثقہ ہونا بیکار ہے، امکان سے مراد امکان عقلی نہیں بلکہ اصول عادت اور قواعد تمدن ہیں(۴)۔

علامہ شبلی نے درایت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ابن مسکویہ اور ابن خلدون سے

۱- الفاروق ص ۱۴-۱۵۔ ۲- ایضاً۔ ۳- سیرۃ النبیؐ ج ۱ دیباچہ ص ۲۶-۲۷۔ ۴- الفاروق ص ۱۳۔

ماخوذ ہے۔

درایت کے سلسلہ میں یورپ کے جدید مورخین نے بھی کافی توجہ دی ہے مگر قدیم مورخین بہر حال اس سے نا آشنا تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"یہ اس وقت سے رائج ہے جب یورپ کے عیسائی مورخ اپنے بزرگوں کی کرامتوں اور خوارق کے ذکر ہی کو تاریخ نویسی کا کمال سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ازمنہ ماضی کی تاریخ بلکہ کل تاریخ کا سارا سرمایہ یونان سے متعلق تھا جن کا خیال تھا کہ مذہبی معاملات میں عقل سے کام لینا جرم ہے"(۱)۔

ساتواں اصول

واقعات کا مختلف علوم وفنون سے تعلق ہوتا ہے اس لیے مورخ کا ایک ضروری فریضہ یہ بھی ہے کہ واقعہ کا تعلق جن فنون سے ہے وہ اس کا ماہر ہو۔ مثلاً اگر جنگ کے واقعات لکھے تو فن حرب سے واقف ہو، انتظامی امور قلمبند کرے تو قانون سے واقف ہو اخلاق تذکرے تحریر کرے تو علم الاخلاق سے آشنا ہو، سیاست پر خامہ فرسائی کرے تو اصول سیاست کا ماہر ہو۔ کیونکہ بقول علامہ شبلی:

"مورخ اگر ان تمام امور کا ماہر ہو تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے ورنہ اس کی نظر اسی قسم کی سطحی ہو گی جیسی کہ ایک عامی کی ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی عمدہ عمارت پر ایک ایسے واقعہ نگار انشا پرداز کا گزر ہو جو انجنیری کے فن سے ناواقف ہے تو گو وہ اس عمارت کا بیان ایسے دلکش پیرایہ میں کرے گا جس سے عمارت کی رفعت اور وسعت اور ظاہری حسن وخوبی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی لیکن اگر اس کے بیان میں خاص انجنیری کے علمی اصول اور اس کی باریکیاں ڈھونڈی جائیں تو نہ مل سکیں گی"(۲)۔

اس اصول سے علامہ شبلی کے ذہن رسا کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ دراصل ان کے فلسفہ تاریخ کا بنیادی جزء ہے۔ گو یہ اصول تاریخ نویسی کے لیے نہایت سخت اور مشکل ہے تاہم اگر

۱- معارف اعظم گڑھ ج ۱۴۱ ش ۳ ص ۲۰۲-۲۰۳۔ ۲- الفاروق حصہ اول ص ۱۱

مورخ ان خوبیوں سے آراستہ ہو تو وہ واقعی تاریخ نگاری سے عہدہ بر آ ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلی کے اس خیال کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ "اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہوتا جو تاریخ کے ساتھ فن جنگ، اصول قانون، اصول سیاست اور علم الاخلاق سے بھی آشنا ہوتے تو آج یہ فن کہاں سے کہاں پہنچا ہوتا"۔ بدقسمتی سے ہمارے مورخین اس معیار کے حامل نہیں تھے اسی وجہ سے بقول علامہ شبلی تاریخ کا فن نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام قوموں میں ناتمام رہا۔(۱)

آٹھواں اصول

علامہ شبلی نے رینکی (Renke) کے بارے میں ایک پروفیسر کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا وہ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب اور قوم کا طرفدار ہوا کسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں چلتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔(۲)

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی بھی ایک مورخ کے لیے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ وہ تاریخ نگاری میں شاعری اور انشاء پردازی سے کام نہ لے نہ ملک و قوم کی ہمدردی و طرفداری اور اس کی خوشی وناخوشی اور اعتقاد ذاتی اس کی تاریخ نگاری پر اثر انداز ہو۔ صاف لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیر جانبداری کو ضروری خیال کرتے تھے۔

نواں اصول

ماضی کے واقعات کو ماضی کے معیار و مذاق سے دیکھنا اور پرکھنا چاہیے اور موجودہ طرز سلطنت کو پچھلی ایشیائی حکومتوں کے اندازہ کرنے کا پیمانہ نہیں بنانا چاہیے۔(۳)

دسواں اصول

علامہ شبلی کے نزدیک مورخ کا منصب واقعہ نگاری ہے فیصلہ نویسی نہیں۔ کیونکہ تاریخ کا انداز مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلے سے بالکل مختلف ہے(۴)۔ اس لیے مورخ کو اپنے منصب پر باقی رہتے ہوئے فیصلہ نویسی سے احتراز کرنا چاہیے۔

۱- الفاروق حصہ اول ص ۱۰-۱۱۔ ۲- ایضاً، ص ۱۱۔ ۳- المامون ص ۲۰۳-۲۰۴۔ ۴- سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۳۳۵

گیارہواں اصول

علامہ شبلی نے مورخ کا لازمی فرض یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ انشاء پردازانہ تاریخ کو اگرچہ قبول عام حاصل ہوتا ہے لیکن درحقیقت تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں۔ان دونوں میں وہی فرق ہے جو نقشہ اور تصویر میں ہے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"ان دونوں میں جو فرق ہے وہ نقشہ اور تصویر کے مشابہ ہے نقشہ کھینچنے والے کا یہ کام ہوتا ہے کہ کسی حصہ زمین کا نقشہ کھینچے تو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ اس کی ہیئت، شکل، جہت، اطراف، اضلاع ایک ایک چیز کا احاطہ کرے۔ بخلاف اس کے مصور صرف ان خصوصیات کو لے گا یا ان کو زیادہ نمایاں صورت میں دکھلائے گا، جن میں کوئی خاص انجوبگی ہو اور جن سے انسان کی قوت منفعلہ پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً رستم و سہراب کی داستان کو ایک مورخ لکھے گا تو سادہ طور پر واقعہ کے تمام جزئیات بیان کر دے گا۔ لیکن ایک انشاء پرداز ان جزئیات کو اس طرح ادا کرے گا کہ سہراب کی مظلومی و بیکسی اور رستم کی ندامت و حسرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی اور واقعہ کے دیگر جزئیات باوجود سامنے ہونے کے نظر نہ آئیں گے"۔(۱)

علامہ شبلی کے اس اصول تاریخ کا ذکر بھی عموماً مورخین کے یہاں اصول کی حیثیت سے نہیں ملتا۔ اسلامی مورخین نے ضرور یک گونہ توجہ دی ہے اور مغربی مورخین مثلاً شریکن کینٹ اور رینکی وغیرہ کے یہاں بھی اس اصول کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً اصول کی حیثیت علامہ شبلی نے دی اور اسے مورخ کا لازمی فرض قرار دیا۔

بارہواں اصول

علامہ شبلی نے افراد کی تاریخ نگاری میں انسانی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔(۲)

۱-الفاروق حصہ اول ص ۱۸۔ ۲--مقالات شبلی ج ۴ ص ۸۱۔

تیرہواں اصول

علامہ شبلی کے نزدیک سیرت و سوانح اگرچہ تاریخ کا حصہ ہے تاہم اسے علوم و فنون کی صف میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سیرت کے صحیح اور یقینی واقعات حدیث کی کتابوں میں ہیں، اس لیے انھوں نے یہ اصول پیش کیا کہ "سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے"۔(۱)

چودہواں اصول

علامہ شبلی نے مورخ کا ایک یہ فرض بھی بتایا ہے کہ وہ اپنی تاریخ میں جن کتب و مضامین سے استفادہ کرے یا ان میں ظاہر کی گئی آراء و خیالات نقل کرے تو صداقت کو قائم رکھنے کے لیے ان کا حوالہ دے۔ ان کے نزدیک "تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے"۔(۲)

حوالہ انہیں کتابوں کا دینا چاہیے جنھیں خود مصنف نے دیکھا اور پڑھا ہو۔ ان کتابوں کا حوالہ نہ دے جسے خود مصنف نے نہ دیکھا ہو۔ کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر واقعات اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہتے (۳)۔ مطبوعہ کتابوں کے مطبع کا بھی اندراج ہو اگر کتاب قلمی ہے تو اس کی تمام تفصیلات دی جائیں۔

علامہ شبلی کا یہ اصول مغرب سے اخذ کردہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "اس زمانہ میں انگلستان کے مورخین کا ایک گروہ آکسفورڈ گروپ کے نام سے مشہور تھا جس نے سند اور حوالہ کو تاریخی دیانت کے لیے مورخ کا لازمی فرض قرار دیا تھا"۔ بہر حال علامہ شبلی کو اردو زبان میں سند اور حوالہ کے التزام میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اوپر کی بحث سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں علامہ شبلی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ نگاری کے بلند اور معیاری اصول وضع کیے اور نہ صرف علامہ ابن خلدون کی طرح اس کے اصول و آئین منضبط کیے بلکہ انھیں عملی طور پر بھی پیش

۱- سیرۃ النبی دیباچہ ص ۵۴۔ ۲- ایضاً، ص ۶۶۔ ۳- سیرۃ النعمان دیباچہ ص ۱۴-۱۵

کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر اور سیرۃ النبی جیسی بلند پایہ اور مہتم بالشان کتابیں اور معرکۃ الآراء تاریخی مقالات ہمارے اس دعویٰ کے شاہد عدل ہیں۔

علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت کے عملی نمونے

ہم نے اب تک علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت اور ان کے نظریہ تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اب ہم ان کی تصانیف کا ان کے نظریہ تاریخ کی روشنی میں ایک جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے تاریخ نگاری کے جن اصولوں کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا ان پر وہ خود کہاں تک عمل پیرا رہے ہیں۔

علامہ شبلی کی تصانیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سفرنامہ روم ومصر وشام، الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم، الغزالی، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، شعرالعجم اور سیرۃ النبی وغیرہ کا ذکر اوپر جابجا آچکا ہے۔ ان کتابوں کا تعلق مختلف موضوعات سے ہے مثلاً سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم اور الغزالی فن سوانح کا حصہ ہیں۔ گو ان میں سیرۃ النعمان کو چھوڑ کر سوانحی جزئیات بہت کم پائی جاتی ہیں اور کلامی مباحث زیادہ ہیں، تاہم بنیادی طور پر یہ کتابیں سوانح ہی کا حصہ ہیں۔

الکلام خالص کلامی مباحث پر مشتمل ہے البتہ علم الکلام، علم کلام کی تاریخ ہے اور علوم وفنون کی تاریخ کے ضمن میں اسے علمی تاریخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ خود علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> "میں نے ابتدائے زمانہ سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں وہ تاریخی ہی تھیں۔ اس بنا پر علم الکلام میرے دائرے سے خارج تھا۔ علم الکلام لکھنے سے ایک طرف تو اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے دوسری طرف یہ تصنیف جو در حقیقت علم کلام کی تصنیف ہے تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہے اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہ گار نہیں رہتا"۔(۱)

اس کے باوجود ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے علامہ شبلی کی مورخانہ حیثیت پر متکلمانہ

۱۔ مقدمہ علم الکلام ص ۴-۵

حیثیت کو ترجیح دی ہے(۱)۔اور انھیں مورخ سے بڑھ کر متکلم قرار دیا ہے۔ ہمیں علامہ شبلی کی بلند درجہ متکلمانہ حیثیت سے انکار نہیں تاہم علامہ شبلی کی تصانیف، اسلوب نگارش اور سب سے بڑھ کر ان کے طریقہ کار کے معروضی مطالعہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اصلاً مورخ ہی تھے۔ یہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ خود انھوں نے اپنا موضوع تاریخ قرار دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے دور ہونا بھی انھیں گوارا نہ تھا۔(۲)

اسی طرح شعر العجم کو جو علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے عام طور سے فارسی شعر و ادب کی تنقید سمجھا جاتا ہے۔ مہدی افادی نے لکھا ہے کہ یہ تنقید عالیہ کا بہترین نمونہ ہے جس پر دنیا کی کوئی بھی زبان ناز کر سکتی ہے(۳)۔ ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بھی علوم و فنون کی تاریخ کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ اسے اصولاً تذکرہ یا شاعری کی تاریخ سمجھنا چاہیے(۴)۔ گویا شعر العجم تنقید عالیہ کے ساتھ فارسی شعر و ادب کی تاریخ بھی ہے اور یہاں بھی نقاد شبلی پر مورخ شبلی سایہ فگن ہے۔

سفر نامہ روم و مصر و شام میں ترکی روم و مصر و شام کے علمی دینی تعلیمی اور تہذیبی و معاشرتی حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ سفر نامہ خود ایک فن ہے گو اس کا تاریخ سے بڑا گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک سفر نامے اپنے عہد کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ و مرجع ہیں جس سے کوئی مورخ بے نیاز نہیں ہو سکتا تاہم یہ تاریخ نہیں۔ پس تاریخ اور سفر نامے کا یہ فرق ملحوظ رہنا چاہیے کہ تاریخ میں اور تجنلیٹی ہوتی ہے اور تاریخ کا ہر واقعہ تحقیق و تدقیق کے بلند معیار پر تولا جاتا ہے جب کہ سفر ناموں میں چشم دید حالات اور مشاہدات سفر قلم بند کیے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کے سفر نامہ کو بھی تاریخ کے بجائے ماخذ تاریخ اور سفر نامہ تصور کرنا چاہیے۔

علامہ شبلی کی باقی کتابیں مثلاً مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، الفاروق، اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر اور سیرۃ النبیؐ تاریخ کا حصہ ہیں۔ المامون اور الفاروق سوانحی انداز میں لکھی گئی ہیں مگر ان میں سوانحی جزئیات کے مقابلہ میں تاریخی جزئیات زیادہ ہیں اور مزید یہ کہ مصنف کے پیش نظر تاریخ میں لائف کا مذاق پیدا کرنا تھا(۵)۔ اس لیے یہ کتابیں سوانح سے زیادہ تاریخ ہیں۔

۱۔ فکر و نظر علی گڑھ شبلی نمبر ص ۲۲۳۔ ۲۔ دیباچہ علم الکلام ص ۵۰۴۔ ۳۔ افادات مہدی ص ۲۲۰
۴۔ سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۲۶۔ ۵۔ المامون ص ۴۔

تاریخ و سوانح میں یہ فرق ہے کہ سوانح کا موضوع شخصیت ہوتی ہے اور اس میں شخصی واقعات پر زور دیا جاتا ہے جب کہ تاریخ کا موضوع زمانہ ہوتا ہے اور شخصیت سے زیادہ زمانے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں "سوانح نگار کا ذہن دائرے سے مرکز کی طرف رجوع کرتا ہے اور مورخ کا ذہن مرکز سے دائرے کی طرف پھیلتا ہے" (۱)۔ علامہ شبلی کی تاریخی تصانیف جن کا اوپر ذکر ہوا اسی فرق کی بنا پر سوانح سے زیادہ تاریخ قرار دی جاتی ہیں۔

سیرۃ النبیؐ تاریخ بھی ہے اور سیرت بھی ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے تاریخ کم اور سیرت زیادہ قرار دیا ہے۔ مگر یہ درست نہیں بظاہر سیرۃ النبیؐ سیرت و سوانح کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ پوری کتاب تاریخ نگاری کے اصولوں پہ لکھی گئی ہے جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں دلائل سے ثابت کریں گے پھر یہ نکتہ بھی کم نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی شخصیت کا ذکر آپؐ کے عہد مبارک کا ذکر ہے اور اسی نوع سے سیرۃ النبی لکھی بھی گئی ہے۔ بہر حال اب ہم علامہ شبلی کی کتابوں کا تعارف اور ان کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

یہ علامہ شبلی کا ایک مختصر رسالہ ہے جو ان کے جدید طرز تصنیف کا نمونہ اور ان کا پہلا کارنامہ ہے۔ یہ دراصل وہ گرانمایہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں پڑھا تھا۔ بعد میں کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا اور اب مقالات شبلی جلد سوم میں شامل ہے۔ علامہ شبلی نے اسے اردو میں اپنی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ (۲)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں علامہ شبلی نے مسلمانوں کے گذشتہ علمی و عملی کارناموں کا مرقع پیش کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم دینیہ کے ساتھ دوسرے علوم و فنون کی تحصیل میں کس قدر سعی و کوشش اور محنت و جانفشانی سے کام لیا، اور پھر خود کارہائے نمایاں انجام دے کر ان علوم کا فیضان دنیا کی دیگر قوموں کے لیے عام کیا نیز علوم جدیدہ کی بنیاد رکھی۔ اس اہم رسالہ کے بارے میں اختر وقار عظیم لکھتے ہیں:

"اس مضمون میں شبلی نے قدیم زمانے کے طریقہ کار کا ذکر کچھ

۱- سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۵۵۔ ۲- مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۳۵۔

اس عمدگی سے کیا ہے کہ اسے پڑھنے میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی قدیم
طرز تعلیم کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کے پیش نظر اس
طریقہ کا ذکر ہے جس سے ہم آپ آج فیض پا رہے ہیں"۔(۱)

علامہ شبلی نے جب یہ مقالہ لکھا تھا اس وقت اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہ تھی۔ انھوں نے تاریخ و تذکرہ کی کتابوں سے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی کاناموں کو ڈھونڈ کر ریزہ ریزہ جمع کیا اور اسے ایک مقالہ کی شکل دی اور خود علامہ شبلی کے الفاظ میں "غالباً یہ پہلی تحریر ہے جس میں اس قدر واقعات جمع کیے گئے ہیں"(۲)۔ یہ مقالہ اپنے موضوع پر انداز نگارش کے لحاظ سے بھی منفرد اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

مصنف نے اپنے انداز نگارش کے سہارے مسلمانوں کی علمی
خدمات کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کر دی ہے۔ ایسی تصویر کا اس طرح کا
کوئی مرقع کسی ایک تصنیف میں نہیں ملتا۔(۳)

اس مقالہ سے علامہ شبلی کا یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یورپ کی چیرہ دستیوں کا جو رعب گھر کر گیا ہے اس کا سدِ باب کیا جائے اور انھیں یہ باور کرایا جائے کہ تمھارے اسلاف کس بلند مقام پر تھے اور یہ کہ وہ علوم وفنون کی ایجاد اور ترویج واشاعت میں دنیا کی کسی اور قوم سے فروتر نہ تھے۔ علامہ شبلی کو اپنے مقصد میں کامیابی ملی، مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی اور سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی(۴)۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے لکھا ہے کہ:

"جب یہ مضمون پڑھا جارہا تھا تو انگریزی تعلیم یافتہ سامعین میں
کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر پوچھتے تھے کہ مولانا کیا ہمارا ماضی ایسا ہی شاندار تھا جیسا
کہ آپ بیان کر رہے ہیں"۔(۵)

جناب ضیاء الحسن فاروقی نے اس رسالہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں علامہ شبلی نے تنقیدی نقطہ نظر سے کام نہیں لیا ہے اور یہ واضح نہیں کیا ہے کہ جب تقلید کا عام رواج ہو

۱- شبلی بحیثیت مورخ ص ۲۸۔ ۲- مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ص ۲۔ ۳- اشخاص و افکار ص ۸۷
۴- حیات شبلی ص ۱۷۱۔ ۵- مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۱۵۔

گیا تھا اور لوگ فلسفہ کی تعلیم سے گھبرانے لگے تھے تو اس سے مسلم معاشرے کو کتنا نقصان پہنچا۔ یا یہ کہ مسلمان اپنی علمی ترقی اور علوم و فنون کے ساتھ گہری دلچسپی کے باوجود پستی و تنزلی کا شکار کیوں ہو گئے۔(۱)

اسی طرح ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ اس میں تعلیم سے دلچسپی وانہماک کی داستان تو ہے لیکن اس بات کا مطلق ذکر نہیں کہ نصاب تعلیم کیا تھا کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور ان کا معیار کیا تھا۔(۲)

فاروقی مرحوم کے یہ اعتراضات آج کے پس منظر میں بجا معلوم ہوتے ہیں لیکن آج سے سوا سو سال پہلے کے ہندوستان کے علمی و تعلیمی مسائل کو اگر مد نظر رکھا جائے تو ان اعتراضات کی حیثیت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔ جہاں تک نصاب تعلیم اور معیار تعلیم کا سوال ہے اولاً تو یہ مباحث سرے سے علامہ شبلی کے موضوع ہی سے خارج تھے بقدر ضرورت ضمناً ان کا ذکر بہر حال آگیا ہے۔ فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ علامہ شبلی اگر قیاس واجتہاد سے کام لیتے تو ان کے اصولوں کی روشنی میں کوئی خاکہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ یہ سچ ہے مگر راقم الحروف کے خیال میں اس مضمون کو سپرد قلم کرتے وقت مصنف کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستان میں مغرب سے مرعوبیت کا جو دور دورہ ہے اور جو لوگ اپنے اقدار و روایات سے بے خبر، بیزار اور مغرب کی ہر اچھی بری ادا پر جان دیتے ہیں ان کے کانوں میں ان کے اسلاف کی عظمت و بلند پاتگی اور ان کے کارناموں کی گونج سنائی دے۔ اس لیے ساری بحث اسی محور کے گرد مرکوز رہی اور مذکورہ اعتراضات یا سوالات کی تشفی کے لیے ایک الگ اور ضخیم تصنیف کی ضرورت تھی۔ بعد میں اس موضوع پر اردو زبان میں ایک ذخیرہ جمع ہو گیا جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ بہر حال اس رسالہ کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے قدردانوں نے اسے وقعت کی نظر سے دیکھا۔ سر سید احمد خاں نے بے ساختہ ایک خط میں یہ لکھ کر داد دی کہ:

> "مولانا شبلی نے تاریخانہ مضمون گذشتہ تعلیم مسلمانان پر اختیار کیا وہ رسالہ مرسل ہے میں سمجھتا ہوں نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی ہے۔(۳)

اس رسالہ کے بعد ملک میں علامہ شبلی کی شہرت کی دھوم مچ گئی اور بقول مولانا سید

۱- اشخاص وافکار ص ۸۵-۸۶ ۲- ایضاً۔ ۳- خطوط سر سید ص ۱۳۶

سلیمان ندوی یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا(۱)۔ اس کتابچہ کے بارے میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے لکھا ہے کہ جب اس رسالہ پر دلگداز میں ریویو ہوا تو کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو (۲)۔ اور سچ یہ ہے کہ آج بھی اس کی قدر و قیمت میں فرق نہیں آیا ہے۔

المامون

یہ علامہ شبلی کی پہلی مستقل تاریخی تصنیف اور ان کے سلسلہ نامور فرمانروایان اسلام کا حصہ ہے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں لکھی گئی اور وہیں سے پہلی بار ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ پہلا ایڈیشن صرف تین ماہ میں ختم ہو گیا اب تک اس کے متعدد ایڈیشن دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب میں دولت عباسیہ کے گل سر سبد مامون الرشید کے حالات و کارنامے اور اس کے عہد حکومت کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی اور تمدنی حالات لکھے گئے ہیں جن سے دولت عباسیہ کے عروج اور ساتھ ہی اس کے اسباب زوال کا پورا مرقع سامنے آ جاتا ہے۔

اس کے دوسرے ایڈیشن میں سر سید احمد خاں کے قلم سے دیباچہ بھی ہے جس میں انھوں نے اس بلند پایہ کتاب کی تصنیف کے لیے خراج تحسین پیش کیا ہے اور معیاری تاریخ نویسی کے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد مامون الرشید کی ولادت، تعلیم و تربیت، ولی عہدی، تخت نشینی، اس کے عہد کی بغاوتیں، خانہ جنگیاں فتوحات ملکی اور مامون کی وفات تک کے حالات لکھے گئے ہیں اور ان واقعات کو علامہ شبلی نے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ تاریخ میں سوانح عمری کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

دوسرے حصہ میں مامون کے نظام حکومت، طرز سلطنت، وسعت سلطنت، فوجی نظام، آمدنی، خراج، آبادی، رصد خانہ، زمین کی پیمائش، اس عہد کے حالات تہذیب و تمدن، مذہب، طرز معاشرت نیز مامون کے اخلاق و عادات، علمی ذوق فضل و کمال اس کی علمی مجالس، اراکین دربار، ملکی عہدے، غرض ان تمام حالات و واقعات اور خصوصیات و امتیازات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے اس کا عہد عموماً شاہان عالم کے درمیان بالخصوص علمی حیثیت سے

۱۔ حیاتِ شبلی ص ۱۷۱۔ ۲۔ بحوالہ حیاتِ شبلی ص ۱۷۱

ممتاز تسلیم کیا گیا ہے۔

وجہ تصنیف

کسی کتاب کے جائزہ میں اس کی تالیف و تصنیف کی غرض و غایت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ المامون کی تصنیف کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ ذیل میں اس کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

المامون کی تصنیف کا ایک سبب یہ ہے کہ علامہ شبلی عباسی خلفاء پر مورخین یورپ کے الزامات کا جواب دینا چاہتے تھے چنانچہ المامون میں متعدد مقامات پر یہ محرک واضح طور پر نظر آتا ہے۔ نیز اس کی تصنیف میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی بڑا دخل ہے۔ مسٹر پامر نے اپنی کتاب میں ہارون الرشید اور ان کے عہد حکومت پر متعدد لغو اور بے سروپا الزامات لگائے گئے تھے جس کو پڑھ کر علامہ شبلی کے دل میں خیال آیا کہ المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کا تریاق بھی پیش کیا جائے(۱)۔ چنانچہ علامہ شبلی نے المامون میں جابجا مسٹر پامر کے الزامات اور ان کی غلط فہمیوں کا جواب دیا ہے اور ان کی غلط بیانیوں کی پردہ دری کی ہے۔ (۲)

المامون علامہ شبلی کے اصول تاریخ کی روشنی میں

علامہ شبلی کے اصول تاریخ کی روشنی میں اگر المامون کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے وضع کردہ اصول و ضوابط کا بڑا پاس و لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ المامون میں انھوں نے اس عہد کے واقعات میں جہاں مامون کی ولی عہدی، تخت نشینی، فتوحات ملکی اور اس کے عہد کی بغاوتوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں انھوں نے نظام حکومت، فوجی نظم و نسق، عدالتی اصول و ضوابط، وسعت سلطنت، عمال کے عزل و نصب، عام طرز معاشرت، تہذیب و تمدن اور اس عہد کے علماء و فضلاء علوم و فنون اور عام اخلاق و عادات وغیرہ کی تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ المامون شاید اردو میں پہلی تصنیف ہے جو جدید ترین اصول تاریخ کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔

المامون میں روایتیں نقل کرتے وقت عملی طور پر وہ روایت کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ روایتیں ثقہ، مستند اور اصل راویوں سے نقل کی ہیں۔ مثلاً امین کے قتل کا واقعہ امین کے غلام احمد بن سلام سے روایت کیا ہے جو بذات خود امین کے قتل کے وقت

۱- حیات شبلی ص ۱۷۳۔ ۲- المامون حصہ دوم ص ۱۵۱-۱۶۱

موجود تھا(۱)۔ یا اسی طرح مامون کے خراج کی تفصیل مقدمہ ابن خلدون سے اس لیے نقل کی ہے کہ یہ تفصیلات مامون کے سرکاری کاغذات سے تیار کی گئی تھیں اور علامہ ابن خلدون نے ان کاغذات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ (۲)

اسباب و علل کی تلاش بھی علامہ شبلی نے ہر ممکن کی ہے۔ المامون کی اس خصوصیت کے بارے میں سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

"پہلے حصہ میں انھوں نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی واختصار سے لکھا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیونکر اور کیوں خاندان بنو امیہ کو برباد کر کے عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے جس سے امین اس کا بھائی مقتول اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہ بن گیا"۔ (۳)

علامہ شبلی نے المامون میں سادہ واقعہ نگاری سے بھی کام لیا اختر وقار عظیم نے بھی المامون کی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے وہ تحریر کرتے ہیں:

"فنی لحاظ سے المامون کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ شبلی نے ایک بڑے انشاپرداز اور مزاجاً شاعر ہونے کے باوجود کہیں بھی بلا ضرورت اپنی رنگین بیانی کے جوہر دکھلانے کی کوشش نہیں کی"۔ (۴)

علامہ شبلی نے المامون میں سند و حوالہ کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور ہر بات کو مستند ماخذ اور معتبر حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے لیے مستند ماخذ سے حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی شہادت میں المامون کے صفحات دیکھے جاسکتے ہیں۔ سر سید احمد خاں بھی اس کے معترف ہیں وہ رقمطراز ہیں:

"مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر ماخذ سے نہ دیا ہو۔ ہر ایک جزئی بات پر اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے حوالہ دیا ہے۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق الٹنے پڑے ہوں گے"۔ (۵)

۱۔ المامون حصہ اول ص ۵۹۔ ۲۔ ایضاً دوم حاشیہ ص ۱۲۵۔ ۳۔ دیباچہ المامون ص ۲۔
۴۔ شبلی بحیثیت مورخ ص ۹۴۔ ۵۔ دیباچہ المامون ص ۳

علامہ شبلی بلند پایہ مورخ ہونے کے ساتھ ایک بڑے سوانح نگار بھی ہیں۔ان کے اکثر تاریخی کارنامے سوانح ہی کے ذریعہ وجود میں آئے۔انھوں نے سوانح نگاری میں صاحب سوانح کے محاسن و معائب دونوں کے ذکر کو ضروری قرار دیا ہے۔اس سلسلہ میں ان کا وہ قول بھی یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں۔حالانکہ آج کل کے مذاق عام کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے"۔(۱)

چنانچہ انھوں نے المامون میں مامون کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی بیان کیا ہے۔گو مامون الرشید ان کا ہیرو تھا اور اس کے فضل و کمال کے ذکر میں ان کا قلم حالت وجد میں نظر آتا ہے لکھتے ہیں:

> "اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے اس وسیع مدت میں ایک تخت نشیں بھی ایسا نہیں گذرا جو فضل و کمال کے اعتبار سے مامون کی شان یکتائی کا حریف ہو سکتا۔افسوس کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفاء و سلاطین کے پہلو میں جگہ دی ورنہ شاعری، ایام العرب، ادب، فقہ، فلسفہ کون سی بزم ہے جہاں فخر و شرف کے ساتھ اس کا استقبال نہ کیا جاتا۔(۲)
>
> اس کی دلیرانہ فتوحات نے دنیا کے ممتاز حصوں میں اپنی نامور اور محسوس یادگاریں چھوڑی ہیں۔بہادری کے معرکوں میں اس کی تیز دستیاں دیکھ کر یقین نہیں آسکتا کہ ان ہاتھوں نے تلوار کے سوا کبھی قلم بھی چھوا ہے۔اس کے ذاتی اخلاق بھی ایسے پاک اور برگزیدہ ہیں کہ سلاطین تو کیا فقراء اور درویشوں میں بھی دو چار ہی ایسے فرشتہ خو گذرے ہوں گے"۔(۳)

مامون کے اس فضل و کمال کے اعتراف کے باوجود علامہ شبلی نے مامون کے معائب

۱-مقالات شبلی ج ۴ ص ۸۱۔ ۲-المامون حصہ دوم ص ۱۷۸۔ ۳-ایضاً ص ۱۲-۱۴-۸۔

پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ اس کی جو بے اعتدالیاں تھیں انھیں جوں کا توں قلمبند کر دیا لکھتے ہیں:

"ان سب خوبیوں کے ساتھ شخصی حکومت کے اقتدار میں ایسی بے اعتدالیاں بھی اس سے سرزد ہوئی ہیں جن کے خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے اور دفعتاً اس کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں"۔(۱)

علامہ شبلی نے مامون کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔ امین کے قتل پر جس طرح وہ خوش ہوا اس کا ذکر ناپسندیدگی سے کیا اور مامون کے مقابلہ میں امین کو مظلوم لکھا ہے(۲)۔ اس کے مذہبی جنون کے متعلق لکھا کہ جس چیز نے اس کی تمام خوبیاں غارت کر دیں وہ یہی اس کا مذہبی جنون تھا(۳)۔ اس کے غیر معتدل رحم پر یہ لکھ کر نکتہ چینی کی کہ یہ شان خلافت کے شایان نہ تھا(۴)۔ غرض یہ کہ علامہ شبلی نے مامون کی زندگی کے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور تاریخ نویسی میں اپنے اصولوں سے کہیں انحراف یا چشم پوشی نہیں کی ہے۔

علامہ شبلی نے اپنی اس تصنیف میں غیر جانبدار رہنے کی بھی کوشش کی ہے۔ امین الرشید کی شکست اور اس کے قتل کی تصویر انھوں نے جس طرح کھینچی ہے اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ مامون کے بجائے امین کی سوانح کا حصہ ہے اور جس سے مامون کے بجائے امین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور امین کی تقصیریں قابل عفو و درگذر اور مامون کی تدبیریں نفرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ یہ حصہ علامہ شبلی کے بحیثیت مورخ غیر جانبدار ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ امین کے قتل کی منظر کشی اس طرح کی ہے:

"امین گو عیش پرست اور نازک اندام تھا مگر اس کے ساتھ نہایت شجاع اور قوی بھی تھا۔ اس بیکسی میں بھی قاتلوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ آگے بڑھیں ہر شخص دوسرے پر ٹالتا تھا۔ امین نے بجائے سلاح جنگ کے ہاتھ میں ایک تکیہ اٹھا لیا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ میں تمھارے نبی کا ابن عم ہوں ہارون الرشید کا فرزند ہوں مامون کا بھائی ہوں میرا خون کسی طرح حلال نہیں بالآخر ایک شخص تلوار لے کر بڑھا اور امین کے سر پر ماری اس گستاخی اور جرأت نے امین کو یقین دلایا کہ اس کی دردناک فریاد ان سنگدلوں

۱-المامون حصہ دوم ص ۱۲۸۔ ۲-ایضاً حصہ اول ص ۶۰۔ ۳-المامون حصہ اول ص ۲۸۔

۴-ایضاً حصہ دوم ص ۱۹۵۔

پر کچھ اثر نہیں کر سکتی وہ مرنے کے لیے تیار ہوا مگر ایسا ہی مرنا جیسا کہ ایک عباسی شہزادے کو سزاوار تھا اب اس کی نزاکت غضبناک جرأت سے بدل گئی دلیرانہ بڑھا اور چونکہ تنہا تھا چاہا کہ حریف کی تلوار چھین کر ہاشمی جرأت کے جوہر دکھائے یہ دیکھ کر گروہ کا گروہ دفعتاً اس پر ٹوٹ پڑا ایک شخص نے کمر پر تلوار ماری پھر سب نے مل کر پچھاڑا اور الٹی طرف سے ذبح کیا، طاہر کے پاس سر لائے تو اس نے حکم دیا کہ ایک برج پر لٹکا دیا جائے تمام بغداد یہ عبرت انگیز تماشہ دیکھنے آیا طاہر یہ کہہ کر لوگوں سے اپنی کارروائی کی داد چاہتا تھا کہ یہ خلیفہ معزول کا سر ہے طاہر نے مامون کو ان دلچسپ اور مختصر لفظوں میں نامہ فتح لکھا "میں امیر المومنین کے حضور میں دنیا اور دین دونوں پیش کرتا ہوں"۔ دنیا سے مظلوم امین کا سر مراد تھا اور دین سے چادر اور خاتم خلافت، ذوالریاستین نے امین کا سر ایک سپر پر رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا اس غیر متوقع فتح کی خوشی نے مامون جیسے رقیق القلب شخص کو بھی ایسا سنگدل بنا دیا کہ اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوش خوشی میں سجدہ شکر ادا کیا، قاصد کو مژدہ فتح کے صلہ میں دس لاکھ درہم انعام دیئے اسی تقریب سے ایک بڑا دربار منعقد کیا اور تمام ارا کین دولت و افسران فوج مبارکباد دینے کو حاضر ہوئے۔ (۱)

اسی طرح ہارون الرشید کا ذکر اور اس کی خوبیاں اور اس کے فضل و کمال کا تذکرہ بھی علامہ شبلی کے غیر جانبدار قلم کا شاہد عدل ہے مامون الرشید یقیناً ان کا ہیرو اور ممدوح ہے وہ چاہتے تو کتاب کے یہ حصے (۲) مامون کی مدافعت تاویلوں اور مفروضوں پر ہو سکتے تھے مگر ان کی مورخانہ دیانت اور غیر جانبداری نے اسے قبول نہیں کیا اور جس کا جو حق تھا اسے ادا کیا۔

غرض علامہ شبلی نے پوری دیانتداری اور غیر جانبداری سے یہ کتاب لکھی اور غالباً اسی بنیاد پر اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

اگر کوئی جانبدار مورخ ہوتا تو ان واقعات کے ذکر کے بجائے انھیں کلیتاً غائب کر جاتا اور ان میں ایسی تاویلیں کرتا کہ یہی داستان مامون

۱- المامون حصہ اول ص ۶۰۔ ۲- ایضاً، ص ۱۹۔

کی گراوٹ کے بجائے اس کی عظمت کی منہ بولتی تصویر بن جاتے لیکن شبلی
کے غیر جانبدار قلم سے ایسی توقع ناممکن تھی انھوں نے جھوٹ بولنے پر
ہمیشہ سچائی کو ترجیح دی۔(۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ "وہ نظریہ کی حد تک درست چلتے ہیں مگر عمل میں ان کا نظریہ زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہیں دیتا"(۲)۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کی تائید و حمایت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس لیے ان کی جلالت علمی کے اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ ان کی یہ رائے محل نظر ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے اصولوں کا پوری طرح پاس ولحاظ رکھا ہے اور ان سے حتی الامکان انحراف نہیں کیا ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کی حقیقت

المامون جب شائع ہوئی تو بقول مولانا سید سلیمان ندوی اہل علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری(۳)۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ "ان کی دوسری تصنیف (المامون) علی العموم پسند کی گئی اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آئندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں"(۴)۔ مگر بعض لوگوں نے اس پر تنقیدیں بھی کیں۔ اخبار آزاد لکھنؤ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا کہ دولت عباسیہ میں مامون کے بجائے ہارون الرشید انتخاب کے لائق تھا اور وہ مامون سے ہر طرح بہتر اور برتر تھا۔ اس تبصرہ میں ہارون و مامون کا موازنہ بھی کیا گیا اور مامون کی خامیاں گنا کر ہارون کی برتری ثابت کی گئی تھی(۵)۔ اخبار آزاد کی یہ فائل باوجود تلاش بسیار کے دستیاب نہ ہو سکی۔

یہ سوال واقعی دلچسپ ہے کہ علامہ شبلی نے سلسلہ فرمانروایان اسلام میں ہیرو کے انتخاب میں کن خوبیوں کو پیش نظر رکھا؟ راقم الحروف اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ علامہ شبلی نے ہیروز میں مامون کا انتخاب نہایت غور و فکر اور وسیع تر پس منظر میں کیا تھا یقیناً ہارون الرشید خلافت عباسیہ کے سلسلہ زریں میں واسطۃ العقد کی شان رکھتا ہے لیکن کیا

۱۔ شبلی بحیثیت مورخ ص ۹۱۔ ۲۔ سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۶۱۔ ۳۔ حیات شبلی ص ۱۷۳
۴۔ بحوالہ حیات شبلی ص ۱۷۲-۱۷۳۔ ۵۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۲۷۔

علامہ شبلی کی اس دلیل کا جواب اس کے مداحوں کے پاس ہے کہ ''اس کا دامن انصاف برامکہ کے خون سے رنگین تھا۔(۱)

اس سلسلہ میں اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر نے ان تنقیدوں کے جواب کے لیے علامہ شبلی کو متواتر خطوط لکھے۔ ان کے پے در پے اصرار پر علامہ شبلی نے ایک مختصر مراسلہ ان ہی کے نام لکھا۔ یہ مراسلہ اخبار آزاد میں ۲۲ر فروری ۱۸۸۹ء کے ایڈیشن میں شائع ہوا، یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ علامہ شبلی کی یہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے اپنی تصنیف پر تنقید کے جواب میں لکھی ہے۔

اس مراسلہ میں انھوں نے المامون کے انتخاب پر جو اعتراضات کیے گئے تھے ان کا مسکت و مدلل جواب دیا۔ ان کا لہجہ اس میں ذرا سخت نظر آتا ہے جو شاید بعض معترضین کے اعتراض برائے اعتراض کے رویہ کے پیش نظر بے جا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے لکھا کہ ''جن لوگوں نے اس بات کو طول دیا ہے کہ دولت عباسیہ میں ہارون انتخاب کے لائق تھا نہ کہ مامون، اس اعتراض کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کیے ہوں اور ساتھ ہی باریک بیں اور تاریخی اصولوں کا نکتہ شناس بھی ہو(۲)۔ اس کے بعد انھوں نے ہارون رشید کے انتخاب نہ کرنے کے متعدد اسباب بیان کیے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہارون کے مقابلہ میں مامون کی برتری دلائل و حقائق سے ثابت کی ہے۔(۳)

اس مراسلہ سے ہمیشہ کے لیے یہ برحق فیصلہ ہو گیا کہ مامون کے انتخاب پر جو انگشت نمائی کی گئی تھی وہ کسی طرح درست نہ تھی۔

المامون پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی چند اعتراضات وارد کیے ہیں۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس میں علامہ شبلی نے مامون کی ایک رُخی تصویر پیش کی ہے اس کے محاسن کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن معائب کو دھندلا کر کے بیان کیا ہے(۴)۔ اس اعتراض کی حقیقت ہماری اس بحث میں گزر چکی ہے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے صاحب نظر کی نظر اس واضح حقیقت پر کیوں نہ پڑی کہ مامون کو فطرت نے گوناگوں اوصاف سے متصف کیا تھا۔ اس کی

۱-المامون حصہ اول ص ۱۹-۲۰۔ ۲-مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۱۔ ۳-ایضاً ج ۸ ص ۴۲-۴۳

۴-بحوالہ شبلی اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۸

خوبیوں کے مقابلہ میں اس کی خامیاں بہر حال کم ہیں اس لیے ان کا ذکر بھی نسبتاً کم ہوا اب اگر کسی صاحب فضل و کمال کی خوبیاں اس کی خامیوں پر غالب آ جائیں اور اس کی بعض بشری کوتاہیاں دھندھلا کر رہ جائیں تو کیا کسی فرض شناس مورخ کا یہ کام ہے کہ وہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے تصویر کے دونوں رخ یکساں کر دے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے المامون پر تبصرہ کرتے ہوئے چند اور سوالات قائم کیے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> سوال یہ ہے کہ مامون کی کون سی بے اعتدالیاں ہیں جن سے شبلی کا دل کانپ اٹھا یا جن سے دفعتاً تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ گئیں۔ شبلی فرماتے ہیں کہ مامون کی سب سے بڑی کمزوری اس کی حد سے بڑھی ہوئی فیاضی تھی اس پر اگر ہم کچھ الزام لگا سکتے ہیں تو یہی کہ اس کا رحم و انصاف حد سے متجاوز تھا (المامون حصہ اول ص ۱۱۳) مگر یہ کمزوری بھی بڑے مزے کی کمزوری ہے۔ لیکن شبلی اس میں معذور ہیں انھیں ایک ہیرو کی زندگی اور اس کے تمام کارناموں کی سر گذشت لکھنا ہے اس لیے عیوب بھی وہی بیان ہونے چاہیے جن پر محاسن قربان کیے جا سکتے ہوں۔(۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ اعتراض بظاہر طاقتور معلوم ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ انھوں نے پہلے ہی یہ رائے قائم کر لی کہ "مامون الرشید علامہ شبلی کا ہیرو ہے اور المامون کا مقصد عہد اسلامی کے قابل فخر کارناموں کو پیش کرنا ہے"۔ ان کی اسی رائے کی وجہ سے ان کی نظر ان واقعات پر نہیں پڑی جہاں علامہ شبلی نے انتہائی دیانتداری سے مامون کی وہ تقصیریں بلکہ جرائم گنائے ہیں جن سے دل کانپ اٹھتا ہے اور دفعتاً مامون کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔ خود امین کے قتل کے واقعہ پر گہرائی و گیرائی سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا وہ مامون کی بے تدبیری کی وجہ سے ہوا۔ علامہ شبلی نے امین کی شکست اور پھر اس کے قتل کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے مامون کے بجائے امین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور مامون سے نفرت۔ لطف یہ ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "کتاب کے اس حصے کو دیکھ کر بعض اوقات دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ

۱۔ سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۸

مامون کی لائف سے کہیں زیادہ امین کی لائف سے پڑھنے والے کو امین سے ہمدردی ہو جاتی ہے... اس کی لغزشیں کچھ پیاری پیاری معلوم ہوتی ہیں اور شبلی کی مامون نوازی کے باوجود اس سے نفرت نہیں پیدا ہوتی اس کے مصائب پر رحم آتا ہے۔ اس کے قتل کی تصویر اور اس وقت اس کے اضطراب و بے بسی کا نقشہ شبلی کے چھپے ہوئے غم کی غمازی کرتا ہے... فاتح مامون کے مقابلہ میں مقتول امین کی تصویر کچھ روشن تر ہو گئی "۔(۱)

اسی بنیاد پر اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

"مامون سے عقیدت کے باوجود انھوں نے مامون کے بے موقع گن کبھی نہیں گائے، بلکہ بعض موقعوں پر یوں اظہار خیال کیا کہ مامون کی عظمت کا نقش بہت ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کے دشمنوں سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔(۲)

اب رہی رحم وانصاف کے حد سے متجاوز ہونے کی بات تو علامہ شبلی نے نہایت بلیغ پیرایہ میں اسے مامون کی بے اعتدالیوں میں شمار کیا ہے، لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ نے شاید اس کو کسی اہمیت کے لائق نہیں سمجھا۔ یہ حقیقت ہے کہ رحم وانصاف کا بھی حد سے متجاوز ہونا بذات خود ایک بڑی خرابی اور بے اعتدالی ہے اور اکثر برائیوں کی جڑ بھی ہے۔ اس سے وزراء و عمال اور عہدیداران حکومت خود سر اور بدمزاج ہوتے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ خود سری کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعہ بڑے بڑے حادثات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس اہم کمزوری وخامی کو جس سرسری اور ہلکے انداز میں لیا ہے وہ خود ان کے اعتراض کی کمزوری کی نشانی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ علامہ شبلی نے مامون کے غلط اور غیر منصفانہ اعمال وافعال کے سلسلے میں تاویل سے کام لیا ہے اور اس کی مثال میں مامون پر سادات کے قتل عام کے الزام کے متعلق علامہ شبلی نے جو رائے قائم کی ہے اسے پیش کیا ہے۔ یہاں ہم پہلے علامہ شبلی کی اس رائے کو پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

خاندان عباسیہ پر عموماً سادات کے قتل کا الزام لگایا جاتا ہے جو

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۷-۱۵۸ ۲۔ شبلی بحیثیت مورخ ص ۹۰

لوگ حجروں میں بیٹھ کر اعتراض کے لیے قلم اٹھاتے ہیں وہ معذور ہیں لیکن جو شخص پولٹیکل ضرورتوں کا اندازہ داں ہے اس اعتراض کو مشکل سے تسلیم کرے گا سادات اور علوئین کو دو دن کے لیے زور ہو گیا تو ملک میں قیامت برپا ہو گئی عباسی خاندان ان کی جانب سے کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا تھا اور جو کچھ ان سے برتاؤ ہوا اسی ضرورت سے ہوا۔(۱)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے طاہر اور امام رضا کے زہر دینے کے واقعہ کا حوالہ پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

طاہر اور امام رضا کو زہر دیا گیا۔ شبلی کے نزدیک امام رضا کو زہر دینے کا واقعہ غلط ہے لیکن طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے دلوایا لیکن مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو کیا کرتا... شبلی کہتے ہیں مامون نے جو کچھ کیا سیاست ملکی کا عین اقتضا یہی تھا۔(۲)

یہاں سوال یہ ہے کہ علامہ شبلی نے قدیم تاریخوں، مستند حوالوں اور ماخذوں اور تاریخی اصولوں کے ذریعہ امام رضا کے زہر دینے کا واقعہ غلط ثابت کیا تو اس میں علامہ شبلی نے کس تاویل سے کام لیا۔ یا اگر مامون سے طاہر کو زہر دلوانے کا صحیح سبب علامہ شبلی نے سیاست ملکی بتایا تو اس میں کون سی تاویل کار فرما ہے۔ دراصل سید عبداللہ سے یہاں بھی سہو ہوا ہے علامہ شبلی نے طاہر کے زہر دینے کا جو مورخانہ سبب بیان کیا ڈاکٹر صاحب نے اسے تاویل تصور کر لیا ہے۔ مورخ کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ اسباب و علل کی تلاش میں قیاس سے کام لے کر مفید نتائج مستنبط کرے علامہ شبلی کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم تاریخوں میں ہمارے مورخین کی بے شمار بے احتیاطیاں اہل علم سے پوشیدہ نہیں، بے شمار بے سر و پا واقعات نقل کر دیے گئے ہیں جو یقیناً ناقابل تسلیم ہیں اور ان کے تسلیم کرنے پر اصرار کیا جائے تو کیا ہمارے تاریخی خزانے بے حقیقت ہو کر نہ رہ جائیں گے؟

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''شبلی کو دلچسپ بشریت سے بہت کم غرض ہے، انھیں تو شان جاہ و جلال، قوت، عظمت، جبروت جیسے اوصاف سے محبت ہے اس لیے ان کے ہوتے ہوئے شبلی کی نظر کسی دوسری صفت پر پڑ ہی نہیں سکتی۔(۳)

۱-المامون حصہ اول ص ۶۹۔ ۲-سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۹۔ ۳-المامون حصہ دوم ص ۲۰۵

اس میں شبہ نہیں کہ علامہ شبلی کو جاہ و جلال اور عظمت و سطوت سے محبت ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی علامہ شبلی نے بشریت سے غرض نہیں رکھی اور ان کی نظر عظمت و جلال کے سوا کسی اور صفت پر نہ پڑ سکی۔

المامون کا مطالعہ اگر مامون کی عام اور بشریت پر مبنی زندگی کے نقطہ نظر سے کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے المامون اور دوسری تصانیف میں بشری خد و خال کو بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ بشریت سے بھرپور ایک دلچسپ تحریر ملاحظہ ہو:

> ہمارے ناظرین جنھوں نے مامون کو کبھی فقہ و حدیث کا تذکرہ کرتے دیکھا ہے اہل کمال کے ساتھ اس کی عالمانہ بحثیں سنی ہیں نہایت تعجب سے دیکھیں گے کہ بزم عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھا ہے بے تکلف اور رنگیں طبع احباب جمع ہیں، پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے دور شراب چل رہا ہے، ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں یاران باصفا بدمست ہوتے جاتے ہیں۔(۱)

علامہ شبلی نے جہاں مامون کے زہد و ورع کا ذکر کیا ہے وہیں اس کے جلسہ ہائے عیش و نشاط اور اس کی رندی و سرمستی کا بھی دل کھول کر تذکرہ کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر سید عبداللہ کو اس پر بھی تعجب ہے کہ زہد و رندی کے اس ناخوشگوار امتزاج کے باوجود شبلی کا قلم المامون کی تعریف میں کس طرح رواں ہو سکا(۲)۔ حالانکہ علامہ شبلی نے المامون میں خود لکھا ہے کہ:

> اس میں تعجب کی کیا بات ہے آزادی، حوصلہ مندی، لطافت طبع اور جوش شباب ہمیشہ زہد کی حکومت سے باغی رہتے آئے ہیں۔ مامون کی تخصیص نہیں اس وقت اسلامی سوسائٹیاں عموماً اس رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔(۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہاں یہ نکتہ کی بات تلاش کر لی کہ شبلی نے اپنے ہیرو کے جوشِ محبت میں آ کر اس زمانے کی ساری اسلامی سوسائٹی کو عیب میں مبتلا دکھایا ہے حالانکہ یہ عیب امراء و سلاطین کا تھا صلحاء و صوفیاء اور عام مسلم سوسائٹی کا نہ تھا(۴)۔ لیکن مذکورہ بالا

۱-المامون حصہ دوم ص ۲۰۵۔
۲-سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۹۰۔
۳-المامون حصہ دوم ص ۲۰۵-۲۰۶
۴-سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۶۱

اقتباس میں علامہ شبلی نے جو بات عموماً کی قید سے لکھی تھی اور یہ قید ظاہر ہے کہ اہم نہیں مگر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے کلیتاً نہ صرف تسلیم کر لیا بلکہ دوسروں کو بھی یہی باور کرانے کی کوشش کر ڈالی۔ اسلامی سوسائٹی سے علامہ شبلی کی مراد علماو صوفیانہ تھے بلکہ یہی حکمراں طبقہ تھا۔ میری اس بات کا ثبوت وہ اقتباس ہے جو ذیل میں پیش ہے اگر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کی طرف توجہ دی ہوتی تو شاید یہ اعتراض پیدا ہی نہ ہوتا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو اس عہد میں امن، فراغ، اطمینان زر و مال سب کچھ میسر تھا پھر کیا چیز تھی جو ان کو زندگی کے پُرخطر مقاصد سے روک سکتی۔ ایک مذہب البتہ درانداز ہو سکتا تھا لیکن جدت پسند طبیعتیں اس کو بھی کھینچ تان کر اپنے ڈھب کا بنا لیتی تھیں۔ شراب کی جگہ نبیذ (کھجور کی تاڑی) موجود تھی جس کو عموماً عراق کے مذہبی پیشواؤں سے حلت کی سند مل چکی تھی، لونڈیوں کی عام اجازت نے عیاشی کے سب حوصلے پورے کر دیے تھے، نغمہ و سرود تو قابلیت علمی کے جز سمجھے جاتے تھے۔(۱)

ان مباحث کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ المامون میں ایک سوانح کے لحاظ سے کچھ کمی ہو سکتی ہے لیکن تاریخی تصنیف کی حیثیت سے یہ ایک اعلیٰ پائے کی تصنیف ہے، جس میں علامہ شبلی نے اس دور کے تمام واقعات، حادثات مع مامون کی زندگی کے بلا کسی رورعایت کے صفحۂ قرطاس پر اتار دیے ہیں، جن کو پڑھ کر آج بھی مامون کے عہد کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ علامہ شبلی نے جن اسباب کے پیش نظر اس کو لکھا تھا وہ اس عہد کے مانند آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں اس لیے المامون کے مطالعہ سے آج بھی وہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں جو علامہ شبلی کے پیش نظر تھے اور یہی ایک عمدہ تصنیف کی پہچان بھی ہے کہ اس کی افادیت صدیوں تک باقی رہے۔

الفاروق

الفاروق کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا یہ احساس تھا کہ اس کے لیے محض ہندوستان کے کتب خانے کافی نہیں ہیں، ان کی خواہش تھی کہ ممالک اسلامیہ کا سفر کر

۱- المامون ص ۲۰۶

سکے وہاں کے کتب خانوں میں قدیم مراجع و مآخذ کا جو خزانہ ہے ان سے استفادہ کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اسی بنیاد پر سلسلہ رائل ہیروز آف اسلام کی تکمیل بھی ممکن ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد (نامور فرمانروایان اسلام) کے لیے کسی بھی طرح کافی نہیں ہو سکتا، یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی کیونکہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک سلسلہ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہے۔ (۱)

۱۹۸۲ء میں ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور انھوں نے جب روم و مصر و شام کا سفر کیا تو الفاروق کے مراجع و مصادر اور مواد کی فراہمی میں ہر ممکن کوشش کی اور متعدد نادر و کمیاب کتابوں اور مخطوطات کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے ضروری اقتباسات بھی نقل کیے اور بقول مولوی محمد یحییٰ تنہا "مولانا نے اس سفر میں الفاروق کے لیے کافی مواد بہم پہنچانے کی کوشش کی اور کوئی دقیقہ تلاش و جستجو کا باقی نہ رکھا (۲)۔ اس کے باوجود بعض کتابیں جن کی انھیں شدت سے تلاش تھی نہ مل سکیں۔ مثلاً مشہور مورخ علامہ مسعودی کی کتاب اخبار الزمان اور کتاب الاوسط کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اگر چہ وہ فن تاریخ کی جان تھیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے مدت ہوئی ناپید ہو چکیں، میں نے اس غرض سے کہ حضرت عمرؓ کے حالات کا پتہ لگ سکے قسطنطنیہ کے تمام کتب خانے چھان ڈالے لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی"۔ (۳)

الفاروق کی تصنیف میں تاخیر اور لیت و لعل کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خود سر سید احمد خاں اس کی تصنیف کے حق میں نہ تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اس تصنیف سے کالج میں شیعہ سنی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو گا جس سے کالج اور ان کی تعلیمی تحریک کو نقصان پہنچے گا۔ انھوں نے علامہ شبلی کو مشورہ دیا کہ وہ الفاروق کے بجائے الغزالی لکھ دیں۔ لیکن جب یہ مسئلہ کالج کے بڑے ہمدرد اور شیعہ عالم نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے سامنے سر سید کے ذریعہ پیش ہوا تو انھوں نے یہ رائے دے کر کہ "اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے حیف ہے

۱۔سفر نامہ روم و مصر و شام ص ۲۔ ۲۔سیر المصنفین ج ۲ ص ۲۱۴۔ ۳۔الفاروق حصہ اول ص ۲۷

کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے"(۱)۔ الفاروق کی تصنیف کی راہ ہموار کر دی۔

غرض یہ کہ الفاروق کی تصنیف کی راہ کی جب تمام دشواریاں دور ہو گئیں اور یورپ میں جو نادر علمی کتابیں طبع ہو رہی تھیں ان میں سے بعض کتابیں مثلاً تاریخ طبری وغیرہ چھپ کر آ گئیں تو علامہ شبلی نے ۱۸ر اگست ۱۸۹۴ء کو الفاروق کی ابتداء کی اور چار سال کی محنت و مشقت کے بعد ۱۸۹۸ء میں پایہ تکمیل تک پہنچا دیا جنوری ۱۸۹۹ء میں اس کا پہلا ایڈیشن مطبع نامی کانپور سے طبع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔

الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کی ابتداء ایک تمہید سے ہوئی ہے جس میں تاریخ کی ابتداء تاریخ کی تعریف اور اس کے لوازمات تاریخ اور انشاپردازی میں فرق روایت و درایت کی تشریح اور ان کا طریقہ استعمال قدماو متاخرین کے تاریخی کارنامے ان کی خصوصیات اور ان کے نقائص کا ذکر ہے۔ مورخ کے فرائض اور ان کے مناسب و غیر مناسب کی بھی تفصیل ہے اور یہ بھی قلمبند کیا گیا ہے کہ یورپ کے مورخین کس قسم کی بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ تاریخ کے ساتھ اصول سوانح نگاری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تمہید تاریخ و سوانح نویسی کے فکر انگیز اور بصیرت سے لبریز اصولوں سے مزین ہے جن کی اہمیت و افادیت کا کوئی مورخ یا سوانح نگار منکر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ان اصولوں کا ایک تعارف گذشتہ صفحات میں علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ کی بحث میں پیش کر دیا ہے۔

تمہید کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کا شجرہ نسب بیان کیا گیا ہے اور ان کی ولادت، سنِ رُشد، قبول اسلام، ہجرت اور وفات تک کے حالات بترتیب قلمبند کیے گئے ہیں۔ اسی حصہ میں ان کی فتوحات اور ان کے عہد کے معرکوں کا سلسلہ وار ذکر بھی ہے۔

دوسرے حصہ میں فاروق اعظمؓ کے مالی، ملکی اور فوجی انتظامات اور ان کے ذاتی اخلاق و عادات، علمی کمالات اور ان کے مجتہدانہ کارناموں کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھا گیا ہے یہ حصہ علامہ شبلی کے مورخانہ اجتہادات، وسیع معلومات اور علمی نظریہ تاریخ کا بہترین نمونہ ہے۔ خود علامہ شبلی بھی اس حصہ کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

غرض علامہ شبلی نے الفاروق میں حضرت عمرؓ کے حالات و سوانح اور ان کے عہد کے حالات کو اس عمدہ انداز سے لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی عظمت و بلند پایگی اور علوئے مرتبہ

۱- حیاتِ شبلی ص ۲۳۰-۲۳۶

کے ساتھ اسلام کے اس مثالی اور لائق تقلید عہد کی تمام تفصیلات آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔

مقبولیت

الفاروق نہ صرف علامہ شبلی نعمانی کی بلکہ اردو زبان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ اس کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دوسرے ممالک کے لوگ بھی اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں افسوس ان کی یہ خواہش غالباً اب تک پوری نہ ہو سکی(۱) البتہ دنیا کی کئی اور دوسری زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ انگریزی میں اس کے دو ترجمے ہوئے، پہلا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا جسے شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ لاہور نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔ بعد میں اسے عماد پبلی کیشن دہلی نے شائع کیا۔ دوسرا ترجمہ محمد سلیم نے کیا جسے شیخ محمد اشرف ہی نے لاہور سے شائع کیا اب تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پشتو زبان میں غلام قادر نے ترجمہ کیا جو ۱۹۶۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ نجف علی عاصی جلال پوری نے فارسی میں ترجمہ کیا جو قندھار سے شائع ہوا۔ ترکی میں محمد رضا آکولہ نے ترجمہ کیا جسے مطبع سی آمدی استانبول نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا(۲)۔ اس طرح اردو، انگریزی، فارسی، ترکی، پشتو اور ملیالم وغیرہ میں ملک اور بیرون ملک سے الفاروق کے پچاسوں ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اتنی مقبولیت اردو کی شاید ہی کسی تاریخی تصنیف کو نصیب ہوئی ہو۔

تحسین و تنقید

الفاروق وجود میں آنے سے پہلے ہی بہت ہی مقبول ہو چکی تھی۔ خود علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> "الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے ہی تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزاء بھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا"۔(۳)

۱۔ حال ہی میں سعودی عرب سے اس کا عربی ترجمہ شائع ہوا ہے مترجم ڈاکٹر سمیر بن عبداللہ ابراہیم ہیں۔
۲۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری اشاریہ جہان شبلی، فکر و نظر علی گڑھ شبلی نمبر جون ۱۹۹۶ء ۳۔ الفاروق ص ا۔

چنانچہ الفاروق جب وجود میں آئی تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تبصرے ہوئے تعریفیں ہوئیں، گو بعض لوگوں نے اعتراضات بھی کیے تاہم عام طور سے مدح و تحسین کی نظر سے دیکھی گئی اردو کے صاحب طرز ادیب و نقاد مہدی حسن افادی نے لکھا کہ:

"یہ عمروں کی کمائی ہے بڑی کاوش و اہتمام سے سالہا سال کی مورخانہ تلاش اور تدوین کے بعد ناموران اسلام کے سلسلہ میں خلیفہ دوم کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے۔ مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لیے ممالک غیر یعنی ترکی، مصر وغیرہ کے مصائب برداشت کیے۔ سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھی اصلی ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔ غرض کہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہمات مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا"۔(۱)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جنھوں نے المامون پر بڑی تنقیدیں کی تھیں الفاروق پر ایک جامع تبصرہ لکھا اور علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت ان کی تلاش و تحقیق اور جدید انداز تصنیف کی بڑی تعریف کی (۲)۔ یہ تبصرہ خود مولانا شبلی کو بہت پسند آیا ان کا خیال تھا کہ اس سے اگر مدح کا پہلو نہ نکلتا تو اسے الفاروق کے ساتھ شائع کرتا۔(۳)

خود علامہ شبلی کو اپنی تمام تصانیف میں الفاروق زیادہ پسندیدہ تھی۔ انھوں نے ایڈیٹر زمانہ کانپور کے ایک سوال نامہ کے جواب میں لکھا کہ میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔(۴)

اس مدح و تحسین کے علاوہ بعض لوگوں نے مختلف قسم کے اعتراضات بھی کیے سیر المصنفین کے مصنف مولوی یحییٰ تنہا نے الفاروق پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ:

"الفاروق پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ موجودہ زمانے کی شائستگی اور اس زمانہ کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا، حالانکہ تیرہ سو برس کے عرصہ

۱- افادات مہدی ص ۵۰۔ ۲- مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۱۵۔ ۳- مقالات شیروانی ص ۳۸-۴۲
۴- مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۳۵ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ علامہ شبلی کا یہ قول سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے کا ہے۔

میں زمانہ نے ہر شعبہ زندگی میں بے حد ترقی کی ہے اور جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرز حکومت کے لازمی عناصر ہیں کم و بیش وہ سب دربار خلافت کے ارکان میں پائے جاتے ہیں جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی"۔(۱)

تمنا صاحب کے اس اعتراض کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے انتظامات اور حکومت کے مختلف اداروں پر آج کل کی اصطلاحیں جب چسپاں کی جاتی ہیں تو بظاہر مندرجہ بالا گمان پیدا ہو جاتا ہے مثلاً قانون مالگذاری جمہوریت وغیرہ۔ شبلی نے نظم و نسق کا جو مفصل حال لکھا ہے اس میں بیسیوں ایسی اصطلاحیں موجود ہیں جو اس زمانے میں اپنی موجودہ شکل اور مفہوم میں موجود نہ تھیں کیونکہ اس وقت نظم و انتظام میں انتہائی سادگی اور بدویت تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان اداروں اور محکموں اور انتظامی کاموں کے لیے شبلی الفاظ کہاں سے لاتے؟ وان کریمر وغیرہ نے جو کتابیں اسی موضوع پر لکھی ہیں ان میں بلا تکلف جدید زمانے کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے شبلی نے ان جزئیات میں کوئی بات خلاف واقعہ و سند نہیں لکھی ہے اور مورخ پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہو سکتا ہے کہ وہ صداقت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑے"۔(۲)

چونکہ علامہ شبلی کے پیش نظر الفاروق کے ذریعہ مذاق حال کی تشفی اور تاریخ کی نئے زمانے اور نئے مذاق کے مطابق تدوین مقصود تھی اس لیے انھوں نے مذکورہ بالا انداز تصنیف اختیار کیا جو اس زمانہ میں مغربی مورخین کے یہاں عام انداز تصنیف تھا، قدیم اصطلاحات اور تعبیرات سے یہ مقصد کماحقہٗ پورا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

علامہ شبلی کے شاگرد خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ "اس میں حضرت عمر فاروقؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے(۳)۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ الفاروق سے حضرت عمرؓ کی جو نمایاں تصویر اُبھرتی ہے وہ اسلامی طرز حکومت کے ایک نامور حکمراں کی ہے۔ سید صاحب جس زمانہ میں

۱-سیرا لمصنفین ج ۲ص ۴۲۶۔ ۲-سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۹۷۔ ۳-حیات شبلی ص ۳۲۔

حیات شبلی کی تدوین میں مصروف تھے اس وقت ان پر جو تصوف کا غلبہ تھا ممکن ہے یہ خیال اسی کا اثر اور نتیجہ ہو ورنہ حقیقت یہ ہے کہ الفاروق میں حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز کیا گیا نہ اس سے پہلو تہی کی گئی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید علامہ شبلی کے پرستار اور سید صاحب کے ممدوح اور ان کے تربیت یافتہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے کہ:

> "اس کتاب کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس کو جو پڑھے گا وہ حضرت عمر فاروقؓ کو ایک بہترین فرمانروا ایک بہترین مسلمان اور ایک بہترین انسان تسلیم کر کے محظوظ ہو گا۔ مسلمان تو اس کتاب کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سکندر ذوالقرنین، نوشیرواں، امام ابوحنیفہ، حضرت عبدالقادر جیلانی، خواجہ بہاء الدین رومی اور شیخ فرید الدین عطار میں جتنی خوبیاں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں وہ سب حضرت عمرؓ میں جمع ہو گئی تھیں"۔(۱)

اس کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ "الفاروق میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ ہے کہ اس میں مصنف گاہے گاہے عاشق کے لباس میں سامنے آتا ہے(۲)۔ مگر انھوں نے الفاروق سے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔

یہاں یہ بھی وضاحت کے لائق ہے کہ علامہ شبلی کے متعلق یہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ ناموران اسلام کے ذکر میں ہیرو پرستی کا شکار نظر آتے ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ بلاشبہ یہ شخصیتیں اپنے اوصاف و محاسن کی وجہ سے صرف مسلمان ہی نہیں دنیائے انسانیت کے ہر معتدل اور عدل پسند ذہن و قلب کے لیے تاثیر و کشش رکھتی ہیں۔ علامہ شبلی نے اگر ان کی سچی اور واقعی تصویر اپنے بے پناہ موئے قلم سے کھینچ دی تو یہ ان کی مہارت و حذاقت ہے نہ کہ ان کی بے جا محبت اور شیفتگی کا مظاہرہ۔ یہاں سوال یہ ہے کہ علامہ شبلی نے تاریخ و سوانح نگاری کے اصولوں سے کہیں انحراف کیا ہے یا نہیں۔ جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو پھر ان کی اس عقیدت کو قصور وار اور ان کا نقص کیوں قرار دیا جائے بلکہ اس کا اصل تعلق تو ممدوح شخصیت کے حسنات و صفات سے ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر میں الفاروق میں دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کا مقصد مغرب

۱- مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۵۲۔ ۲- سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۶۹۔

کے رجحان کا غیر معتدل احترام ہے مثلاً واقعہ بدر کو مدافعانہ ثابت کیا ہے تاکہ جارحانہ جہاد کے الزام سے بچ سکیں۔(۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے جس بات کو غیر معتدل احترام قرار دیا ہے وہ دراصل تاریخ کے سائنٹفک اصولوں کا نتیجہ ہے۔ مثلاً واقعات کے اسباب و علل کی تلاش و جستجو جس کا مقصد جارحانہ جہاد کے الزام سے فرار نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش ہے خود اسلام نے جارحانہ جہاد کی جب اجازت ہی نہیں دی ہے تو اس سے اجتناب اور احتراز کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اعتراض دراصل ایک عوامی نظریہ و رجحان کی وجہ سے پیدا ہوا اور واقعہ بدر میں جیسا کہ علامہ شبلی نے روایت و درایت کے معیار سے جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ معرکہ بدر جارحانہ جہاد نہ تھا بلکہ مدافعانہ جہاد تھا اور اگر اس عام خیال کے مطابق جارحانہ تسلیم کرلیا جائے اور اس کے اسباب و علل سے صرف نظر کرلیا جائے تو بقول شبلی "اس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔ حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔(۲)

چنانچہ علامہ شبلی نے واقعہ بدر کے اسباب کو تلاش بسیار کے بعد بیان کردیا، اب اگر وہ کسی مورخ، محقق، عالم یا عامی کے نظریہ کے مطابق نہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ اگر علامہ شبلی ایسا نہ کرتے تو آج اصول تاریخ کے لحاظ سے ان پر تنقید کی جاتی کہ انھوں نے تاریخ نویسی کے اصولوں پر عمل نہیں کیا اور خود اپنے بنائے پیمانوں سے اعراض کیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے الفاروق پر ایک اور اعتراض کیا ہے کہ الفاروق میں بعض جگہ حدیث پر معقولیت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس اعتراض کی دلیل بھی الفاروق سے پیش نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے مطالعہ کی بنیاد پر یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ کسی حدیث پر معقولیت کی ترجیح کی ایک مثال بھی نہیں۔ یہاں ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتراض کے متعلق یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے لفظ درایت کو معقولیت سے تعبیر کیا ہے اور ان دونوں کا فرق بہرحال ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً مولانا شبلی ایک جگہ لکھتے ہے:

۱- سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۶۹۔ ۲- سیرۃ النبی ج ادیباچہ ص ۳۹۔

"ممکن ہے کسی کوتاہ نظر پر یہ امر گراں گذرے کہ بخاری اور
مسلم کی حدیث پر شبہ کیا جائے لیکن اس کو سمجھنا چاہیے کہ بخاری و مسلم کے
کسی راوی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا اس
سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ
کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے"۔(۱)

ان چند اعتراضات کے بعد خود ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ "سیرۃ النبیؐ کے بعد الفاروق شبلی کی بہترین تصنیف ہے اور سوانحی لحاظ سے بھی بڑی مکمل اور مفصل ہے۔ اصول صداقت کے معاملہ میں جتنی احتیاط اس کتاب میں روا رکھی ہے شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ نہیں رکھی۔ اس سے حضرت عمرؓ کی پوری شخصیت اپنی گوناگوں خوبیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔(۲)

الفاروق علامہ شبلی کے اصول تاریخ کی روشنی میں

یہاں الفاروق کا علامہ شبلی کے اصول تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ انھوں نے اپنے اصول و معیار کا کس قدر خیال رکھا ہے اور الفاروق اس پر کہاں تک پوری اترتی ہے۔

جیسا کہ نظریہ تاریخ کے ضمن میں لکھا جا چکا ہے، علامہ شبلی نے مورخ کا یہ لازمی فرض بتایا ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ لکھے اس عہد کے ہر طرح کے واقعات لکھے۔ چنانچہ خود علامہ شبلی نے الفاروق میں عہد فاروقی کے ہر طرح کے واقعات قلمبند کیے ہیں جہاں انھوں نے سیاسی تاریخ لکھی ہے وہیں تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور علمی تاریخ کو بھی مدون کیا ہے۔ فتوحات ملکی کے ذکر کے ساتھ عہد فاروقی کے عام حالات، اخلاق و عادات، مالی، ملکی اور فوجی انتظامات جیسے موضوعات پر مکمل توجہ دی ہے۔ فاضل محقق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"انھوں نے اپنے جدید طریقہ مطالعہ سے حضرت عمرؓ کے عہد کی
نہایت دلچسپ تاریخ ہمارے سامنے پیش کر دی ہے، جس میں آپ کی
خلافت کے دہ سالہ دور کی ساری معاشرت سارے انتظامات ملکی ساری علمی

۱-الفاروق ص ۵۶۔ ۲-سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۷۰

مذہبی اور ادبی زندگی مفصل طور پر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ اس کتاب میں شبلی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صحیح تاریخ صرف جنگوں اور لڑائیوں کا نام نہیں اصل تاریخ تہذیب انسانی کا دوسرا نام ہے۔ الفاروق میں تمدنی جزئیات کا مواج سمندر موجزن ہے، اس سے مورخ کے عمیق مطالعہ، ناقدانہ استقصاء پُر خلوص اور پُر شوق محنت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔(۱)

علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ میں اسباب و علل کی اہمیت پر روشنی ڈالی جاچکی ہے الفاروق میں یہ پہلو بھرپور موجود ہے۔ خود ان کو احساس تھا کہ "یہ امر بھی جتادینا ضروری ہے کہ اگرچہ میں نے واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یورپ کی بے اعتدالی سے احتراز کیا ہے"۔ علامہ شبلی نے دوسرے حصہ کی ابتداء میں اولاً یہ بحث کی ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب تھے جن کی بدولت "چند صحرا نشینوں نے فارس و روم کا دفتر الٹ دیا۔ کیا یہ تاریخ عالم کا کوئی مستثنیٰ واقعہ ہے آخر اس کے کیا اسباب تھے"۔

غرض یہ کہ علامہ شبلی نے اسباب و علل کے سلسلے کی تلاش ایمانداری سے کی ہے۔ انھوں نے مغربی مورخین کے اس نظریہ سے کہ فارس و روم کی سلطنتیں اوج اقبال سے گر گئیں تھیں اور کوئی لائق حکمراں موجود نہ تھا، سے اسی بنیاد پر اختلاف کیا ہے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ مغربی مورخین کا یہ استدلال "اگرچہ واقعیت سے خالی نہیں تاہم جس قدر واقعیت ہے اس سے کہیں زیادہ طرز استدلال کی ملمع سازی ہے جو یورپ کا خاص انداز ہے"(۲)۔ اس کے بعد علامہ شبلی نے مورخانہ انداز سے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ "فارس و روم کی سلطنتیں اگرچہ اپنی اصل بلندی پر باقی نہیں تھیں" لیکن فنون جنگ سے بخوبی واقف اور منظم تھیں اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی قوی سلطنت کا مقابلہ نہ کر پاتیں نہ یہ کہ عرب جیسی بے سر و سامان قوم سے ٹکرا کر پرزے پرزے ہو جاتیں"۔ علامہ شبلی اصل سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک اس سوال کا اصلی جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت بانیِ اسلام کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہو گئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور قوی اور تیز

۱- سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۲۶۔ ۲- الفاروق دیباچہ ص ۱۸

کر دیا تھا، روم و فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ البتہ اس کے ساتھ اور بھی چیزیں مل گئی تھیں جنھوں نے فتوحات میں نہیں بلکہ قیام امن میں مدد دی۔ اس میں سب سے مقدم چیز مسلمانوں کی راست بازی اور دیانتداری تھی۔ جو ملک فتح ہو جاتا تھا وہاں کے لوگ مسلمانوں کی راست بازی کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کی سلطنت کا زوال نہیں چاہتے تھے"۔(۱)

یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کا رشتہ مولانا شبلی نے "اسباب و علل" کے سلسلے سے قائم کیا ہے۔

الفاروق میں "صحت واقعہ" کا پورا پورا خیال کیا گیا ہے بلکہ الفاروق اس اصول کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے ہر واقعہ کو اصول صداقت کی رو سے جانچنے کے بعد ہی اخذ و نقل کیا ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ اصول صداقت کے معاملے میں شبلی نے جتنی احتیاط اس کتاب میں روا رکھی ہے شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ نہیں رکھی۔(۲)

صحت واقعہ کے لیے اصول روایت ہمیشہ صاحب الفاروق کے پیش نظر رہے۔ انھوں نے ثقہ وضابط راویوں کی مرویات قبول کی ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ گو روایت کا تعلق اصلاً فن حدیث سے ہے مگر علامہ شبلی نے اسے تاریخ نویسی کے لیے بھی ضروری قرار دیا ہے۔ مثلاً حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ صدیق خلیفہ تسلیم کیے گئے تو بنو ہاشم نے بیعت کرنے سے انکار کیا اور اپنے موقف پر بضد رہے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر جمع ہو کر مشورہ کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ کو ناگوار گذرا چنانچہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا یا بنت رسولؐ اللہ خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے یہاں لوگ اسی طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا(۳)۔ حضرت فاطمہؓ کے متعلق حضرت عمرؓ کا یہ رویہ ممکن ہے ایک عقیدت مند کے قلم سے بالارادہ نقل نہ کیا جاتا لیکن علامہ شبلی نے اس سے صرف نظر نہیں کیا بلکہ یہ لکھا کہ "درایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے، حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ کچھ بعید نہیں(۴)۔ الفاروق میں روایت کے پہلو بہ پہلو درایت

۱-الفاروق حصہ دوم ص ۵-۶۔ ۲-سر سید اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۷۰۔
۳-الفاروق حصہ اول ص ۶۵۔ ۴-ایضاً۔

سے بھی کام لیا گیا ہے۔

الفاروق کی اس خصوصیت کا اعتراف ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "شبلی نے اس لائف میں بھی درایت کے اصولوں کو نہایت
> قوت و احتیاط کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اسی اصول کی وضاحت کے لیے
> شاندار علمی دیباچہ لکھ کر گذشتہ اسلامی تاریخ کی بعض خامیوں سے بحث کی
> ہے اور بتایا ہے کہ ہم آج ان نقائص کو کیسے دور کر سکتے ہیں"۔(۱)

علامہ شبلی نے مورخین کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جانبداری سے کام نہ لیں مگر الفاروق میں خود اس اصول کی رعایت وہ نہ کر سکے۔ یہ تو ضرور ہے کہ شاعری اور انشاپردازی سے انھوں نے احتراز کیا لیکن صاحب سوانح سے ان کی محبت تعلق، اور وابستگی بہر حال ظاہر و نمایاں ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ انھوں نے واقعہ اور صداقت کے مطابق ہی اس عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

الفاروق میں علامہ شبلی نے اپنے سند و حوالہ کے اصول کو بھی ہر لحاظ سے ملحوظ رکھا ہے اور کوئی بھی واقعہ بغیر سند اور حوالے کے نہیں لکھا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کم رتبہ کتاب کا حوالہ دیا ہے تو اس بنا پر کہ اس کی تصدیق کسی دوسرے معتبر ماخذ سے کر لی گئی ہے(۲)، اس کی شہادت الفاروق کے صفحہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

غرض الفاروق میں علامہ شبلی نے اپنے اصول تاریخ نویسی کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو زبان میں تاریخ کی یہ پہلی کتاب ہے جو اصول تاریخ کے بلند معیار پر لکھی گئی۔ سعید انصاری نے سچ لکھا ہے کہ الفاروق مولانا کے مورخانہ اجتہادات کا بہترین نمونہ ہے۔(۳)

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر

اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ کے کذب و افترا اور ان کی تاریخی غلطیوں کا ازالہ علامہ شبلی کی زندگی کا خاص مقصد اور مشن تھا ان کی اکثر تصانیف اور مضامین و مقالات مورخین یورپ کی کسی نہ کسی افترا پردازی ہی کے رد و ابطال اور احقاق حق کے لیے معرض

۱- سر سید اور انکے نامور رفقاء ص ۱۶۳۔ ۲- الفاروق دیباچہ ص ۱۹۔ ۳- مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز ص ۵۶

وجود میں آئی "اورنگ زیب عالم گیر" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۱۹۰۶ء میں علامہ شبلی نے اپنے عزیز شاگرد مولانا محمد علی جوہر کے اصرار پر بڑودہ کا سفر کیا، اور انھیں کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا جوہر نے ان سے اورنگ زیب پر عائد الزامات کے جواب و تردید میں ایک مفصل مضمون لکھنے کی فرمائش کی(۱)۔ چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں جس کے وہ اڈیٹر تھے، عالمگیر پر سلسلۂ مضامین شروع کیا جو دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء کے درمیان شائع ہوا۔ یہ سلسلہ مضامین اتنا مقبول ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا اور اب تک اس کے دسیوں اڈیشن طبع ہو چکے ہیں اور دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ ڈاکٹر سید محمود نے اس کا انگریزی میں ترجمہ یا خلاصہ لندن سے شائع کیا(۲)۔ دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں ترجمہ کیا جسے عالمگیر کے نام سے ادارہ ادبیات دلّی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔

ہندوستان میں انگریز مورخوں نے اپنے مخصوص سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت تعصب و عناد میں سرشار ہو کر مسلمان حکمرانوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے۔ ان کی تنقید و تنقیص کا سب سے زیادہ نشانہ مظلوم اورنگ زیب کی ذات رہی جس کو مطعون و مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا، علامہ شبلی کے الفاظ ہیں:

> "اس کی فرد قرارداد جرم اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی۔ باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹا دیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کر دیئے"۔(۳)

ان الزامات اور عالمگیر کے مفروضہ مظالم کی تشہیر اس قدر زور و شور سے کی گئی کہ وہ "افسانہ بزم و انجمن" بن گئے۔ علامہ شبلی نے بحیثیت مورخ ان الزامات کا جواب دینا اپنا فرض سمجھا، چنانچہ انھوں نے عہد وسطٰی کی معتبر تاریخوں اور تاریخ نویسی کے اصول کی بنیاد پر مورخین یورپ کی افترا پردازیوں اور ان کی غلط کاریوں کا پردہ فاش کر کے ان کو حقیقت و

۱- مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۴۵۴، دارالمصنفین اڈیشن و محمد سرور خطوط محمد علی، ص ۵۹، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۰ء ۲- حیات شبلی ص ۴۵۴ ۳- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۔ طبع جدید دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

صداقت کا آئینہ دکھایا اور فرمایا ؎

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا علامہ شبلی نے اپنے مذہبی جذبات، دینی حمیت و غیرت اور اورنگ زیب کے اسلامی عقائد و خیالات سے متاثر ہو کر عالمگیر پر لگائے گئے الزامات کو بے معنی اور بے سر و پا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یا واقعی عالمگیر پر عائد الزامات درست نہ تھے، سید شریف الحسن نقوی لکھتے ہیں:

"انھوں نے محض اورنگ زیب کے اسلامی عقائد سے متاثر ہو کر اس کی طرفداری نہیں کی ہے بلکہ تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کر کے ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد ہیں"۔(۱)

ابتداءً علامہ شبلی نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ جو الزامات عالمگیر پر لگائے جاتے ہیں وہ بعض دوسرے بادشاہوں پر بھی لگائے جا سکتے ہیں مگر انھیں کے الفاظ میں "اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہجہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں اور عالمگیر کے وہی الزامات افسانہ بزم و انجمن ہیں"(۲)۔ الزامی جواب کی تفصیل سے انھوں نے صرف اس لیے گریز کیا ہے کہ اس سے قومی تفریق کو تحریک ہوتی اور شاہجہاں پر اگر الزامات ثابت بھی ہو جاتے تو عالمگیر اس سے بری نہیں ہو سکتا۔(۳)

یہاں کتب کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنی مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ یہ براہ راست معلوم ہو جائے کہ انگریز مورخوں نے عالمگیر کی شخصیت کو بدنام کرنے اور اپنے مطالب بر آری کے لیے تاریخ میں کس طرح بددیانتی سے کام لیا ہے۔ ایک جگہ علامہ شبلی نے ان کے کذب و افترا اور جھوٹ میں جھوٹ ملانے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مورخین یورپ کے تعصب کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور علمی بددیانتی کا بھی، وہ لکھتے ہیں:

"یورپین مورخوں کے اعتراضات اگرچہ نہایت پادر ہوا ہوتے ہیں اور اس لیے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے۔ لیکن بایں ہمہ

۱۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات ص ۲۹۸، انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۲۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۔
۳۔ ایضاً۔

جواب دینے والا سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ یورپین مورخین ایک اعتراض کے بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے پے در پے اور بہت سے جھوٹ ملاتے جاتے ہیں۔ جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو سامنے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے۔ وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے۔ مسلسل دروغ بیانی اور افتراؤں کے ہجوم پر بے اختیار اس کو طیش آجاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ کے انکشاف پر متوجہ ہو غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ خود مجھ پر یہی اثر پڑا لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش سے فائدہ اٹھائیں"۔(۱)

دکن کی اسلامی ریاستوں کے برباد کرنے کا الزام

عالمگیر پر انگریز مورخوں کے الزامات کی فہرست میں ایک جرم یہ ہے کہ اس نے دکن کی اسلامی ریاستیں حیدر آباد اور بیجاپور کو برباد کر دیا۔ حیدر آباد چونکہ ایک شیعہ ریاست تھی اس لیے اس کی بربادی میں عالمگیر کا مذہبی تعصب کار فرما تھا ان ریاستوں کی آبادی سے مرہٹوں کا زور قائم ہوا اس لیے یہ عالمگیر کا سیاسی جرم بھی تھا۔(۲)

علامہ شبلی نے سب سے پہلے اسی الزام کا جائزہ لیا ہے اور معتبر تاریخی شہادت اور اصول تاریخ سے ثابت کیا ہے کہ چونکہ حیدر آباد کا حاکم ابوالحسن شاہ (تانا شاہ) نہایت عیش پرست اور ظالم تھا۔ وہ مرہٹوں سے ساز باز کر کے انھیں مدد دیتا رہا تاکہ وہ سلطنتِ مغلیہ کو برباد کر دیں۔ اس نے خود اپنی ریاست میں مرہٹوں اور ہندوؤں کو اس قدر بڑھاوا دیا کہ وہ علانیہ مسلمانوں پر ظلم کرتے اور مسجدوں کی بے حرمتی کرنے لگے اس لیے مجبوراً عالمگیر کو ان کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ حیدر آباد میں مرہٹوں کا اس قدر زور قائم ہو گیا تھا کہ حیدر آباد کا استیصال کرنا کسی اسلامی سلطنت کا نہیں بلکہ ایک مرہٹی سلطنت کا استیصال تھا۔(۳)

بیجاپور کے حکمرانوں کا بھی یہی رویہ رہا وہ بھی مرہٹوں کے معین و مددگار رہے، اس لیے ان پر بھی عالمگیر نے فوج کشی کی اور سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ عالمگیر کے اس الزام کا

۱- اورنگ زیب عالمگیر ص ۵۹ ۲- ایضاً ص ۹۰ ۳- ایضاً ص ۹۰- ۱۳

جائزہ لینے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"ہمارے دوستوں کو یہ معلوم نہیں کہ دکن کی یہ اسلامی ریاستیں مرہٹوں کی باجگذار بن گئی تھیں اور اگر عالمگیر حیدر آباد اور بیجاپور کو فتح نہ کرتا تو آج بڑودہ اور گوالیار کی طرح حیدر آباد اور بیجاپور پر بھی مرہٹوں کا علم لہراتا ہوتا"۔(۱)

دکن میں پانچ ریاستیں گولکنڈہ، بیجاپور، خاندیس، برار اور احمد نگر تھیں۔ ان پر قبضہ کرنے کی ابتدا اکبر نے کی، جہانگیر اور شاہجہاں ان سے تعلقات استوار رکھنا چاہتے تھے مگر ان کی شرارتوں سے تنگ آکر بالآخر ان پر فوج کشی کی اور ان کو زیر کر کے سلطنتِ تیموری میں داخل کیا۔ صرف دو ریاستیں حیدر آباد اور بیجاپور عالمگیر کے دورِ حکومت میں سلطنتِ مغلیہ کا حصہ بنیں۔ علامہ شبلی نے موضوع کے پیشِ نظر اختصار سے کام لیا ہے ورنہ وہ اس سوال کا جواب بھی دیتے کہ عالمگیر پر جو الزام لگایا جاتا ہے وہی الزام اکبر اعظم پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مگر انگریز مورخوں نے عالمگیر کی شخصیت ہی کو کیوں نشانہ بنایا۔

عالمگیر اور مرہٹے

دوسرے مضمون میں مرہٹوں سے متعلق متعدد الزامات کی تردید کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں عالمگیر پر انگریز مورخوں کے الزامات اس طرح ہیں:

(۱) مرہٹوں کا فساد عالمگیر کی ذات سے برپا ہوا۔ (۲) شیواجی جب عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوا تو اس سے ایسا برتاؤ کیا گیا جس سے وہ چار و ناچار سرکشی پر مجبور ہوا، اگر فراخ حوصلگی سے کام لیا جاتا تو وہ عالمگیر کا حلقہ بگوش ہو جاتا۔ (۳) شیواجی کو عالمگیر نے امان دے کر بلایا تھا لیکن خلاف عہد اس کو نظر بند کر دیا۔ (۴) شیواجی کے جانشینوں کے ساتھ عالمگیر نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ (۵) عالمگیر مرہٹوں کو زیر نہ کر سکا اور چونکہ مرہٹوں ہی نے سلطنت تیموریہ کو زیر و زبر کر دیا اس لیے تیموریوں کی بربادی کا اصل سبب خود عالمگیر تھا"(۲)۔

علامہ شبلی نے اس مضمون میں انھیں مضامین کا جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ

۱-اورنگ زیب عالمگیر ص۔ ۲-ایضاً ص ۱۴۔

مرہٹوں کا فساد خود مرہٹوں کی ذات سے تھا اور ان کی فساد انگیزیوں کی ابتدا شاہجہاں کے عہد میں ہوئی تھی نہ کہ عہد عالمگیر میں۔(۱)

شیواجی کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اس پر یورپین مورخوں نے بڑی لے دے کی ہے وہ دربار میں عالمگیر کے بلانے پر نہیں بلکہ شکست کے بعد آیا تھا، لیکن عالمگیر نے فراخدلی اور بلند حوصلگی سے کام لیا اور راجہ جے سنگھ کے لڑکے رام سنگھ اور مخلص خاں کو استقبال کے لیے بھیجا مگر انگریز مورخ کہتے ہیں کہ اس کے استقبال کے لیے ایک کمتر درجے کے سردار کو بھیجا گیا۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ رام سنگھ کمتر درجے کا سردار نہ تھا وہ امرائے عالمگیری میں سب سے زیادہ ممتاز اور سپہ سالار لشکر تھا۔ اس الزام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> "شیواجی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا؟ شاہی فوجوں نے اس کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے۔ وہ قلعے میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا، اس کے خاص صدر نشیں قلعے کے برجوں پر شاہی فوج کا پھریرا اڑ چکا تھا ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا اور دربار میں روانہ کیا گیا۔ تاہم اس کے استقبال کے لیے عالمگیر نے دربار میں جو شخص سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا اس کو بھیجا۔ پنج ہزاری امراء کی صف میں جو خود راجہ جے سنگھ کا منصب تھا اس کو جگہ دی اور اس سے زیادہ اور وہ کیا چاہتا تھا۔ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح رہزن کے لیے تخت سے اتر آتا۔ بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کر سکتا ہے، لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے"۔(۲)

شیواجی کو پنج ہزاری منصب دیا گیا تھا اس پر بھی انگریز مورخوں کو اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تیسرے درجے کا منصب تھا جو اس کے شایان شان نہ تھا۔ بعض دوسرے مورخوں نے لکھا ہے کہ چونکہ یہی منصب اس کے لڑکے کے پاس تھا اس لیے اس سے بڑا منصب اسے ملنا چاہیے تھا۔ حالانکہ شیواجی کو جو منصب دیا گیا تھا وہ دربار کے عام دستور کے مطابق تھا اور اس میں تحقیر واہانت کا کوئی دخل نہ تھا اس الزام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں:

۱- اورنگ زیب عالمگیر ص ۱۳۱۔ ۲- ایضاً ص ۲۷-۲۸

"واقعہ یہ ہے کہ دربارِ تیموری میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو ایک درجے کا منصب عطا کیا جاتا تھا اس لیے شیواجی کو بھی پہلے پہل یہی منصب دیا جا سکتا تھا جن لوگوں کو ہفت ہزاری اور دہ ہزاری منصب ملے ہیں سب ترقی کرتے کرتے اس درجے تک پہنچے ہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ شیواجی کے لیے توڑا نہیں جا سکتا تھا"۔(۱)

غرض عالمگیر نے شیواجی کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اس کے شان و مرتبے کے خلاف نہ تھا عالمگیر پر اس طرح کا الزام محض اسے بدنام کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

بعض یورپین مورخوں نے لکھا ہے کہ شیواجی کے ساتھ اگر عالمگیر اچھا برتاؤ کرتا تو وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا۔ مگر علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ یہ بات تاریخ شہادت کے کس قدر خلاف ہے، اس نے کبھی اپنے عہد کی پابندی نہیں کی۔ افضل خاں کو دھوکہ سے قتل کیا جب کہ اسے امن کے لیے بلایا تھا، بیجاپور اور گولکنڈہ سے مکارانہ سازشیں کیں، شہروں اور قصبوں پر شب خون مارا کیا اس کے باوجود اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا۔(۲)

عالمگیر پر انگریز مورخوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ اسی کی ذات سے مرہٹوں کا زور قائم ہوا اور شیواجی کے بعد اس کے جانشینوں نے عالمگیر کی سلطنت کا سارا انظام درہم برہم کر دیا(۳)۔ حالانکہ یہ درست نہیں اور مورخوں کے الزامات میں تضاد ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے شیواجی کے جانشینوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور دوسری جانب یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے جانشینوں نے عالمگیر کی سلطنت کا سارا انظام درہم برہم کر دیا۔ اس پر مفصل مورخانہ بحث کر کے مولانا شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مرہٹوں کی زیادتیاں اور دست درازیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو عالمگیر نے ان کے استیصال کی طرف توجہ دی، ان کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

"عالمگیر کے جیتے جی شیواجی مر گیا، سنبھا مارا گیا، رام راجہ آوارگی اور صحرا نوردی کی نذر ہوا، سنتا کا سر کٹ کر دربار میں پہنچا غرض علم برداران بغاوت ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے، تمام قلعہ جات پر قبضہ کر لیا گیا اور

۱- اورنگ زیب عالمگیر ص ۱۳۰۔ ۲- ایضاً۔ ۳- ایضاً ص ۱۳۱۔

دکن سے لے کر مدراس تک سناٹا ہو گیا"۔(۱)

علامہ شبلی نے انگریز مورخوں کے اس دعویٰ کو بالکل غلط ثابت کیا ہے کہ عالمگیر کی سلطنت کا سارا انتظام شیواجی کے جانشینوں نے درہم برہم کر دیا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ خود مرہٹوں کی ساری قوت وطاقت برباد ہو گئی اور مرہٹے خانہ بدوش راہزن ہو کر ادھر ادھر چوری چھپے لوٹ مار کرتے رہتے اس کے بعد عالمگیر دنیا سے اٹھ گیا، علامہ شبلی کے الفاظ میں:

> "اب یہ اس کے جانشینوں کا کام تھا کہ ان اڑتے ہوئے ذروں کو بھی فنا کر دیتے لیکن خوبی قسمت سے تیموری مسند معظم شاہ کے ہاتھ آئی اور بیداد مورخوں نے نالائق اخلاف کا الزام بلند پایہ اسلاف کے نامۂ اعمال میں لکھا اس سے بڑھ کر کیا ناانصافی ہو سکتی ہے"۔(۲)

غرض عالمگیر پر مرہٹوں سے متعلق جو الزامات لگائے گئے تھے علامہ شبلی نے تاریخی نقطۂ نظر سے ان کا رد اس انداز سے کیا کہ آج تک اس کی تردید نہیں ہو سکی۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی ان کاوشوں کو جس قدر عام کرنے اور بڑے پیمانے پر اشاعت کرنے کی ضرورت تھی وہ نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر پر عائد الزامات آج بھی اسی طرح ورد زبان ہیں جس طرح پہلے تھے۔

ہندوؤں پر مظالم کا الزام

علامہ شبلی نے عالمگیر سے ہندوؤں کی ناراضگی اور اس کے اسباب پر مفصل بحث کی ہے اور خاص طور سے اس کے جو اسباب انگریز مورخوں نے بتائے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں انگریز مورخوں نے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ ہندوؤں کی ناراضگی کے مذہبی اور سیاسی اسباب بیان کرنے میں خلط مبحث کر دیا ہے جو اصول تاریخ کی رو سے سراسر غلط ہے۔ علامہ نے سیاسی اور مذہبی اسباب کی الگ الگ نشاندہی کر کے ان کا رد و ابطال کیا ہے۔ سیاسی الزامات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عالمگیر نے اپنے طرز عمل سے راجپوت رئیسوں کو جو تیموری حکومت کے دست و بازو تھے ناراض کر دیا۔ (۲) عام ہندوؤں کو ناراض کر دیا۔ (۳) راجپوتوں کے ساتھ

۱-اورنگ زیب عالمگیر ص ۴۳۔ ۲-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۴۳۔

اچھا سلوک نہیں کیا اس لیے وہ بغاوت پر مجبور ہوئے۔ (۴) عالمگیر راجپوتوں کو کبھی زیر نہ کر سکا۔ (۱)

علامہ شبلی نے مذکورہ الزامات کا مفصل جائزہ لے کر عالمگیر کے راجپوتوں سے تعلقات اور ان سے رشتہ و تعلق کے شواہد کتب تاریخ سے پیش کرنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے کہ:

> "ان واقعات کے ثابت ہونے کے بعد کہ جے پور، جودھ پور، اودے پور کے فرمانروا عالمگیر کے ساتھ دکن میں مرہٹوں سے لڑائیاں لڑ رہے ہیں، راجپوت فوجیں مسلمانوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں، راجپوت افسروں کو سہ ہزاری و چہار ہزاری منصب عطا ہوتے ہیں اودے پور کا راجہ نابالغ ہونے کے ساتھ اس بے جگری سے مرہٹوں کا مقابلہ کرتا ہے تو کیا یورپین مورخوں کے اس قول میں سچائی کا کچھ شائبہ ہے کہ عالمگیر نے راجپوتوں کو اس قدر ناراض کر دیا کہ وہ پھر تیموری علم کے نیچے نہ آئے"۔ (۲)

اس کے بعد علامہ شبلی نے ہندوؤں کی ناراضگی کے مذہبی اسباب کا جائزہ لیا ہے اس سلسلے میں عالمگیر پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے جاتے ہیں:

(۱) عالمگیر نے ہندوؤں کو ملازمت سے یک قلم برطرف کر دیا۔ (۲) ان کے مذہبی میلے ٹھیلے موقوف کرا دیئے۔ (۳) ان کی درس گاہیں بند کرا دیں۔ (۴) ان پر جزیہ لگایا۔ (۵) اور ان کے بت خانے توڑے اور ان کو طرح طرح سے ستایا۔ (۳)

علامہ شبلی کے اصل موقف اور ان کے دلائل کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بہ خوبی واضح کرنے کے لیے ان الزامات کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا الزام

عالمگیر کی شخصیت پر مورخین یورپ نے ایک اہم الزام یہ عائد کیا ہے کہ اس نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ "یورپین مورخوں نے اپنی عادت کے مطابق واقعہ کی اصلی ہیئت بدل دی

۱- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۴۴-۴۵۔ ۲- ایضاً ص ۵۷۔ ۳- ایضاً ص ۵۸

ہے"۔ پھر انھوں نے معتبر معاصر تاریخوں مثلاً مآثر عالمگیر وغیرہ سے ثابت کیا ہے کہ عالمگیر نے تمام ہندوؤں کو برطرف کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ اس نے یہ حکم دیا تھا کہ صوبہ داروں اور تعلقہ داروں کے پیشکار، دیوان اور محالات خالصہ کی مالگذاری وصول کرنے والے ہندو مقرر نہ کیے جائیں۔(۱)

علامہ شبلی نے اس سلسلے میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ ان عہدوں پر عموماً کائستھ مقرر ہوتے تھے جن کی رشوت خوری کے واقعات شہرت کی حد تک سامنے آئے تھے۔ بعد میں اس حکم میں یہ اصلاح کر دی گئی کہ ایک پیش کار ہندو اور دوسرا مسلمان مقرر کیا جائے(۲)۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ یہ قدم عالمگیر نے مذہبی تعصب کی وجہ سے نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس کے پس پشت رشوت خوری اور غبن کی نگرانی کا جذبہ کارفرما تھا۔(۳)

اس کے بعد علامہ شبلی نے دوسری دلیل میں ایک معتبر تاریخ سے عہد عالمگیر کے ان ہندو عہدیداروں کی ایک فہرست پیش کی ہے جو اہم عہدوں پر فائز تھے جب کہ سیکڑوں غیر اہم ہندو عہدیداروں اور فوجیوں کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمگیر جس قدر اپنے مسلمان عہدیداروں پر بھروسہ کرتا تھا اسی قدر ہندو عہدیداروں پر بھی یقین کرتا تھا ورنہ وہ فوج کی افسری، قلعہ داری، اضلاع کی نظامت اور فوجداری جیسے اہم عہدوں پر انھیں مامور نہ کرتا۔(۴)

دور حاضر کے مورخین نے مغل حکمرانوں کے عہد کے ہندو عہدیداروں کی جو محققانہ فہرست تیار کی ہے اس سے بھی علامہ شبلی کی اس دلیل کو مزید تقویت ملتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکمرانوں میں شاہ جہاں کے بعد عالمگیر کے عہد سلطنت میں سب سے زیادہ ہندو بڑے عہدوں پر مامور تھے یہاں تک کہ اکبر سے بھی زیادہ۔(۵)

جزیہ

ہندوؤں سے جبری جزیہ لینے کا الزام بھی عالمگیر پر عائد کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے چونکہ جزیہ پر ایک علیحدہ مفصل رسالہ لکھا تھا(۶)، اس لیے یہاں مختصراً یہ لکھ دیا ہے کہ جزیہ کوئی ناگوار چیز نہ تھی بلکہ وہ غیر قوموں کے حق میں ایک رحمت تھی لیکن سچ ہے کہ ہندوؤں

۱-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۳۔ ۲-ایضاً۔ ۳-ایضاً۔ ۴-ایضاً ص ۶۷۔ ۵-اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر ص ۴۷-۴۷-۳ ۶-دیکھیں مقالات شبلی ج ۱ ص ۲۲۱ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ

نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا مگر اس کی وجہ بھی مذہبی نہیں تھی بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ اس سے پہلے اکبر کے عہد سلطنت میں جزیہ موقوف ہو چکا تھا دوبارہ جزیہ لگانے پر ناگواری کا اظہار ہوا(۱)، جزیہ کی بحث پر مولانا ابوالکلام آزاد نے مصنف کی جس بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے(۲)، وہ درست نہیں۔ اس لیے کہ علامہ شبلی نے اس موقع پر صراحت کر دی ہے کہ جزیہ پر ایک مفصل رسالہ لکھا جا چکا ہے۔

میلوں ٹھیلوں کی موقوفی

عالمگیر نے میلوں ٹھیلوں کو بند کرا دیا تھا اس کا سبب بھی مؤرخین یورپ کو مذہبی تعصب ہی نظر آیا۔ مگر علامہ شبلی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عالمگیر کا یہ حکم مذہبی تعصب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا تھا نیز فساد و بلوہ وغیرہ کا بھی خطرہ رہتا تھا اس لیے عالمگیر نے اسے بند کرا دیا۔ یہ محض علامہ شبلی کا اندیشہ ہی نہ تھا بلکہ انھوں نے اس کی یہ مثال بھی دی ہے کہ ۱۰۷۹ھ کے جلوس میں تابوت کے گشت کو لے کر برہان پور میں بلوۂ عظیم ہوا جس میں بڑی خونریزی ہوئی۔ چنانچہ اس نے تابوت نکالنے پر پابندی عائد کر دی۔ عالمگیر کی افتادِ طبع کو بھی اس میں دخل تھا، وہ طبعاً خشک اور روکھا پھیکا شخص تھا۔ اسے میلوں ٹھیلوں، شراب و کباب، ناچ گانے اور ظاہری نمائش و تکلفات سے سخت نفرت تھی۔ غرض یہ کہ ان امور کی پابندی میں عالمگیر کے مذہبی تعصب کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ اس کا اصل مقصد اصلاح معاشرت تھا۔(۳)

مولانا آزاد نے بھی عالمگیر کی اس روش پر اعتراض کیا ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی میلوں کو بند کرنے کا شرعاً و قانوناً اس کو کوئی حق نہ تھا مذہبی اور اخلاقی اصلاح صرف مسلمانوں کے لیے تھی نہ کہ ذمیوں کے لیے(۴)۔ حالانکہ اس اصلاح کا تعلق مذہب کے بجائے نقض امن سے تھا کیونکہ اس طرح کے میلوں میں عموماً فساد و خونریزی کا خطرہ ہوتا ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ امن و امان کا قیام ہر فرمانروا اور ہر حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مسلم اور ذمی کی تفریق کی بحث غیر ضروری اور غیر منطقی ہے۔

۱-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۷۔
۲-حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۰۔
۳-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۷-۶۸
۴-حواشی ابوالکلام آزاد ص ۳۵۱۔

ہندوؤں کے مدارس بند کرنے کا الزام

مغربی مورخین نے عالمگیر پر ہندوؤں کے مدارس بند کرنے کا بھی الزام لگایا ہے۔ مگر علامہ شبلی نے مستند و معتبر تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ عالمگیر نے تمام مدارس کو بند کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ صرف ان مدارس کو بند کرنے کا حکم دیا تھا جن کے متعلق یہ شکایت سامنے آئی تھی کہ وہاں کے مسلم طلبہ کو جبراً ہندوؤں کی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔(۱)

بت شکنی کا الزام

عالمگیر پر سب سے بڑا الزام بت شکنی اور مندر توڑنے کا ہے، جس کی مغربی مورخین نے اس زور سے تشہیر کی کہ آج تک فضا پُر شور ہے۔ علامہ شبلی نے اس اہم الزام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس نے ان ہی مندروں کو برباد کیا تھا جہاں بغاوتوں کی سازشیں کی جاتی تھیں۔ مغربی مورخین اور ان کے زیرِ اثر بعض ہندو مورخین نے اس سچائی کا رُخ اس طرف موڑ دیا کہ مندر توڑے گئے اس لیے بغاوتیں ہوئیں(۲)۔ جس کا ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا۔ مندروں کی بربادی کا اصل سبب ان سے اٹھنے والی روز روز کی بغاوتیں تھیں جیسا کہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ”جس قدر بُت خانے توڑے گئے ان ہی مقامات کے توڑے گئے جہاں پُر زور بغاوتیں برپا ہوئیں۔ عالمگیر پچیس برس تک دکن میں رہا ان ممالک میں ہزاروں بُت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بُت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ الورہ مشہور مندر میں سیکڑوں تصویریں اور بُت ہیں عالمگیر اسی نواح میں الورہ سے میل دو میل کے فاصلے پر مدفون ہے، بڑے بڑے بزرگانِ دین کا یہاں مزار ہے جو عالمگیر سے بہت پہلے گزرے ہیں لیکن یہ بت اور تصویریں آج تک موجود ہیں“۔(۳)

علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں جو ناقابل تردید دلائل بیان کیے ہیں دورِ حاضر کے بعض اہم مورخین نے بھی ان کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عالمگیر نے صرف مندر ہی نہیں توڑے بلکہ بغاوتوں کی زد میں آنے والی مساجد بھی توڑیں(۴)۔ اس موقع

۱-اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ص ۶۸-۶۹۔　　۲-ایضاً ص ۷۳

۳-ایضاً۔　　۴-اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر ص ۱۷۔

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ علامہ شبلی نے بغاوتوں کے اسباب ووجوہ بیان کرنے میں پہلو تہی سے کام لیا ہے۔ لیکن اس بحث کا تعلق ان کے اصل موضوع سے نہ تھا اس لیے اس سے تعرض کرنے کے بجائے انھوں نے ان مباحث کی جانب اپنی توجہ مرکوز رکھی جو اس مضمون کے لکھنے کا اصل محرک بنے تھے۔ طوالت کا خوف بھی مانع رہا ہوگا ورنہ یہ مباحث اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی مستقل مضمون کے متقاضی تھے۔

یقیناً مسجد و مندر اس کے نزدیک بھی قابل تعظیم و تقدیس تھیں لیکن اگر وہ سازشوں اور دنیاوی اغراض کا مرکز بنادی جائیں تو چاہے کوئی بھی حکمراں ہو تا رفع شر کے لیے اس قسم کی کارروائیاں ضرور کرتا۔ علامہ شبلی نے انگریزوں کے ''روشن زمانے'' میں مہدی سوڈانی کے مقبرے کی بربادی کا ذکر کیا ہے۔ موجودہ دور میں امرت سر میں سکھوں کی مشہور عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل کی اُس وقت کی حکومت کے ہاتھوں بربادی کو بھی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے حالانکہ یہ بحث متنازعہ فیہ ہے کہ حکومت کا اقدام روا تھا یا نا روا۔

باپ بھائیوں کے معاملات

آخر میں علامہ شبلی نے اس مشہور الزام کا جائزہ لیا ہے کہ عالمگیر نے باپ کو قید کیا اور بھائیوں کو قتل کیا۔ انھوں نے یہاں بھی معتبر تاریخوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ شاہجہاں کے بیمار پڑنے کے بعد دارا شکوہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ عالمگیر اس وقت گلبرگہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، اس کے باوجود دارا شکوہ نے اس کے فوجی عہدیداروں کو برطرف کردیا اس کے سفیر کا گھر ضبط کرکے اسے قید کردیا اور اس کے درباری سفراء سے مچلکہ لیا کہ دربار کی کوئی خبر عالمگیر تک نہ پہنچے۔ اس غرض سے بنگال، گجرات اور دکن کی عام شاہراہوں کو بند کرادیا اور عالمگیر اپنے بیمار باپ کی عیادت کو چلا تو دارا شکوہ کے ایما سے راستہ میں جے سنگھ معرکہ آرا ہوا۔ اس طرح جنگ کی ابتداء اور مخالفانہ کارروائیوں کا آغاز عالمگیر نے نہیں بلکہ خود دارا شکوہ نے کیا جس کی شاہجہاں نے ہمنوائی کی اور آخر آخر تک اس کا ہمنوا اور معین ومددگار رہا۔ یہاں تک کہ عالمگیر کی زندگی کا خاتمہ بھی کرادینا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ برابر سازشیں بھی کرتا رہا۔ لہذا اس کے جواب میں عالمگیر نے جو کچھ کیا وہ ظلم وجبر نہ تھا، بلکہ اس کی مجبوری تھی۔ اس کو جب ہر طرف سے اطمینان وسکون حاصل ہوا تو اس نے شاہجہاں

کے ساتھ پسرانہ محبت کا ثبوت پیش کیا جس کی شہادت اس کے مخالف برنیرؔ وغیرہ نے بھی دی ہے۔(۱)

جیسا کہ اوپر گذرا جنگ کی ابتدا دارا شکوہ نے کی مگر وہ عالمگیر کا مقابلہ نہ کر سکا اور گرفتار ہونے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اسے قتل کے بجائے کسی محفوظ مقام پر نظر بند بھی کیا جا سکتا تھا لیکن علامہ شبلی کا خیال ہے کہ "یہ قطعی تھا کہ دارا شکوہ جب تک زندہ رہتا سازشیں برپا رہتیں اور ملک کو امن و امان نصیب نہ ہوتا اس لیے عالمگیر کو وہی کرنا پڑا جو خود اس کے باپ شاہجہاں سے اس کو ترکہ میں ملا تھا"۔(۲)

اسی باب میں علامہ شبلی نے مراد کی گرفتاری اور پھر اس کی موت پر بھی بحث کی ہے اور محققانہ اور مورخانہ انداز میں بحث کرنے کے بعد مراد کی گرفتاری اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

> "اصل واقعہ یہ ہے کہ مراد گو نہایت دلیر، بہادر اور جانباز تھا لیکن اسی کے ساتھ نہایت سادہ لوح اور نہایت آسانی سے لوگوں کے دام میں آجاتا تھا۔ دارا شکوہ پر جب اس کو فتح حاصل ہو چکی تو اب اس کو لوگوں کے بہکانے سے یہ خیال آیا کہ یہ معرکے میں نے سر کیے ہیں میں ہی تنہا تخت سلطنت کا حقدار ہوں۔ اس خیال سے اس نے عالمگیر سے علیحدگی اختیار کی اور عالمگیر کے بڑے بڑے امراء کو بھاری تنخواہوں اور انعاموں کی طمع دلا کر توڑنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس ہزار فوج اس کے رکاب میں جمع ہو گئی اور روز بروز عالمگیر کی فوج گھٹتی جاتی تھی مجبوراً عالمگیر کو اس کا بندوبست کرنا پڑا"۔(۳)

عالمگیر نے مراد کا جس طرح بندوبست کیا خود علامہ شبلی کو بھی وہ پسند نہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "گو مراد سے علانیہ جنگ کرنے میں ہزاروں کا خون ہوتا لیکن اگر عالمگیر اور خونریزیوں کی طرح اس کو بھی گوارا کرتا اور مراد پر تدبیر سے نہیں بلکہ شمشیر سے قابو پاتا تو ہم اس کی مردانہ روش کی زیادہ داد دیتے۔ لیکن

۱- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۷۵-۹۵۔ ۲- ایضاً ص ۹۳۔ ۳- ایضاً ص ۹۵۔

سچ یہ ہے کہ عالمگیر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خلیفہ منصور عباسی سے
جس نے ابو مسلم اصفہانی بانی دولت عباسیہ کو دھوکے سے بلا کر قتل کرادیا تھا
زیادہ مدح کا مستحق ہے"۔(ص ۹۶)

علامہ شبلی نے برنیئر کے اس بیان پر تنقید کی ہے کہ عالمگیر نے مراد کو شراب پلا کر قید کیا اور لکھا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور مورخ نے اس کی صراحت نہیں کی ہے۔ اس کے بارے میں انفسٹن کی یہ رائے نقل کر کے کہ "ان کے بیان میں ایسی ایسی حکایتیں مذکور ہیں جو لوگوں کو بناوٹی معلوم ہوتی ہیں" (۱)۔ اس کی مورخانہ حیثیت واضح کی ہے۔

اس کے علاوہ بھی یورپین مورخوں کی بہت سی غلط بیانیوں اور ان کے کذب وافترا کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔

آخر میں علامہ شبلی نے عالمگیر کے مالی و ملکی انتظامات واصلاحات، عدل وانصاف، ٹیکسوں کی موقوفی، علمی و تعلیمی ترقی، آراضی کا بندوبست، قانون مالگذاری اور عالمگیر کے اوصاف و کمالات وغیرہ کو قدرے تفصیل سے لکھ کر اس کا یہ درجہ متعین کیا ہے۔

"ہم تیموری سلاطین کی فہرست میں وہی درجہ اس کو دے سکتے
ہیں جو اسے ترتیب شمار کی رو سے حاصل تھا تاہم عام اسلامی دنیا میں اس کے
بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی پیدا نہیں ہوا"۔(۲)

چند فنی خصوصیات

یہ رسالہ مولانا شبلی کی تاریخی تحریر ہونے کے باوجود عالمگیر یا عہد عالمگیر کی مکمل تاریخ نہیں ہے، بلکہ اس سے عالمگیر کی زندگی کے چند مخصوص پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بنا پر اصول تاریخ نویسی کے معیار پر اس کا مفصل جائزہ لینا درست نہیں۔ تاہم یہاں اس کی چند فنی خصوصیات وامتیازات کو پیش کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ علامہ شبلی نے کہاں تک اس میں فن تاریخ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

غیر جانبداری:— مورخ کا اولین فریضہ اس کی غیر جانبداری ہے۔ علامہ شبلی نے اس فریضہ کو شعوری طور پر انجام دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

۱- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۱۰۲۔ ۲- ایضاً ص ۱۲۶۔

"بے شبہ ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے بے رو رعایت ان جرائم کی تحقیقات کرنی چاہیے اور نہایت احتیاط رکھنی چاہیے کہ میزان عدل کا پلہ طرفداری کے رُخ نہ جھک جائے"۔(۱)

چنانچہ علامہ شبلی نے مکمل طور پر اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور عالمگیر پر عائد کردہ الزامات کو صحیح تاریخی مآخذ اور معتبر حوالوں کی مدد سے رد کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی عالمگیر کے ذاتی مذہب و عقیدہ یا اس کی پسند و ناپسند کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ مرزا احسان بیگ نے بجا طور پر لکھا ہے:

"علامہ کا دل اگرچہ ہمہ تن اسلامی جوش سے لبریز تھا لیکن پورے مضمون میں عالمگیر کی بے جا حمایت یا طرفداری کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا"۔(۲)

صحت و صداقت:- علامہ شبلی نے اسلامی مورخین کی طرح تاریخ نویسی میں صحت واقعہ اور سچائی کی تلاش کو بہت اہمیت دی ہے، کیونکہ اس کے بغیر اصل واقعہ سامنے نہیں آسکتا۔ چنانچہ خود انھوں نے اپنی اس تصنیف میں واقعہ کی صحت کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور صداقت کی تلاش میں انتہائی جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں روایت و درایت کے اصولوں کو بھی پوری طرح مد نظر رکھا ہے، وہ شاہجہاں اور عالمگیر کے موازنے میں لکھتے ہیں:

"اسلامی تعلق سے شاہ جہاں اور عالمگیر یکساں واجب التعظیم ہیں گو وہ خلیفہ نہیں لیکن لغوی معنوں میں (نہ شرعی) امیر المومنین ہیں۔ میرا دل دُکھتا ہے کہ ان میں کسی کو ملزم ٹھہراؤں۔ لیکن سچائی اور تاریخ نویسی کا کیا فرض ہے؟ شاہجہاں اور عالمگیر دونوں قابل ادب ہیں لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے "حق اور راستی" اور مجھ کو اسی اعلیٰ تر چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے"۔(۳)

ہر جگہ انھوں نے حق و راستی کے سامنے پوری طرح گردن جھکا دی۔ اختر وقار عظیم کا یہ خیال درست نہیں کہ "جہاں شاہجہاں اور عالمگیر میں موازنے کی نوبت آجاتی ہے وہیں

۱-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۷۵۔ ۲-مقالات احسان ص ۴۳۔
۳-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۸۵۔

شبلی کی غیر جانبداری دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے"(۱)۔ ان کو یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ شبلی نے عالمگیر اور شاہجہاں کے درمیان ہونے والے جن واقعات پر روشنی ڈالی ہے وہ عالمگیر کے حق میں جاتے ہیں، ورنہ وہ اس تاریخی صداقت کو پہلے صراحتاً بیان کر چکے ہیں کہ عالمگیر کو وہی مرتبہ و مقام حاصل ہے جو ترتیب شمار کی رو سے اسے حاصل تھا۔ اگر وہ مذہبی جوش و حمیت سے کام لیتے تو تمام مغل حکمرانوں میں عالمگیر کو سب سے بلند تر حکمراں قرار دیتے۔

اسباب و علل

تاریخ نویسی میں اسباب و علل کی تلاش مورخ کا فرض مانا جاتا ہے اس کے بغیر واقعہ کی تہہ تک پہنچنا اور اصلیت و حقیقت کو معلوم کرنا محال ہوتا ہے۔ علامہ شبلی عالمگیر پر لگائے گئے الزامات کی حقیقت سمجھنے میں اس اصول پر پوری طرح کاربند دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً عالمگیر نے دکن کی اسلامی ریاستوں پر کیوں قبضہ کیا یا اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ بظاہر اس کے ناروا سلوک کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ وغیرہ۔

یورپ کے فضلاء اور مورخین کو اسباب و علل پر بڑا زور دیتے ہیں، لیکن ان کی تحقیقات مخصوص اغراض کے تحت ہوتی ہیں۔ وہ اپنی مطلب برآری کے لیے اپنے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور کذب و افتراء کا طومار باندھ دیتے ہیں۔

تاریخ اور انشاپردازی

تاریخ اور انشاپردازی میں بُعد ہے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ دونوں کی سرحدیں جدا جدا ہیں۔ اس لیے خود انھوں نے اپنی اس تحریر میں بیجا انشاپردازی سے احتراز کیا ہے اور کہیں بھی اپنی مورخانہ حیثیت پر ادبی حیثیت کو غالب نہیں آنے دیا ہے۔ لیکن اگر تحریر میں قارئین کو انشاپردازی کا لطف ملتا ہے تو یہ علامہ شبلی کے قلم کا اعجاز ہے جو ان کی تحریر کا خاص جوہر ہے۔

سند اور حوالے

علامہ شبلی نے تاریخ نویسی میں سند اور حوالے پر بھی بہت زور دیا ہے اور خود اس کا اتنا اہتمام کیا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔ بعض جگہ جن واقعات کے حوالے دیئے ہیں ان کو اگر نہ دیتے تو بھی ان کے علم و فضل اور مورخانہ عظمت کی

۱- شبلی بحیثیت مورخ ص ۱۲۱۔

وجہ سے کوئی معترض نہ ہوتا۔ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں ان کے پایہ اعتبار واستناد کو پہلے ہی بیان کر دیتے ہیں۔

کسی کتاب اور مقالے پر بحث و گفتگو کرتے وقت اس کے عہد اور زمانے کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔علامہ شبلی نے جس وقت یہ رسالہ تحریر کیا تھا اس وقت اس موضوع پر کسی ہندوستانی مورخ اور صاحب علم و نظر کی کوئی تحریر موجود نہیں تھی۔پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم نے لکھا ہے کہ اورنگزیب کے عہد سے متعلق بعد میں جو دستاویز ملی ہیں اور جو اس وقت انھیں (علامہ شبلی کو) حاصل نہیں تھیں ان کی بنیاد پر کئی باتوں میں ان کی تردید کی جا سکتی ہے (۱)۔ مگر وہ کوئی دستاویز پیش نہیں کر سکے اس بنا پر ان کا خیال علمی حیثیت سے باوزن نہیں بلکہ اس کے برعکس دورِ حاضر کے مورخین مثلاً بی۔این۔پانڈے، عرفان حبیب، رومیلا تھاپر، ایس نورالحسن، ہربنس مکھیا، اطہر علی، ستیش چندر اور اوم پرکاش پرشاد وغیرہ نے عالمگیر اور اس کے عہد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے نہ صرف علامہ شبلی کے دلائل و براہین کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ اس کی تائید میں مزید دلائل بھی فراہم ہوتے ہیں۔(۲)

علامہ شبلی کی یہ مخصوص انداز کی تحریر جو ان کے وسعت نظر اور مورخانہ بصیرت کا بہترین نمونہ ہے، اصول تاریخ کی رو سے بھی ایک بلند پایہ اور معیاری چیز ہے۔آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والا کوئی بھی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

سیرۃ النبیؐ

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانی کی آخری مگر سب سے زیادہ مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ وہ خود بھی اسے اپنی زندگی کا حاصل اور اپنے لیے وسیلۂ نجات خیال کرتے تھے (۳)۔اس کی تالیف و تدوین میں ان کا جذبۂ خلوص اور رسولؐ اللہ سے غیر معمولی عقیدت و شیفتگی بھی شامل ہے اور یہ ان کے وسعتِ مطالعہ، غور و فکر، دقت نظر، تحقیق و تدوین، تلاش و تفحص، مورخانہ اجتہاد و بصیرت، حسن استدلال، ادبی لطافت اور اسلوب نگارش کی دلآویزی کا نمونہ بھی، اسی لیے یہ بڑی اہم، جامع اور عدیل المثال تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ ”یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے حتی کہ عربی میں

۱-اشخاص و افکار ص ۲۷۔ ۲-اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر مقدمہ ص ۵۔ ۳-مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۱۰۸

بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی"۔(۱)

گو علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ تقریباً ۱۰۰ برس پہلے لکھی گئی ہے لیکن ابھی تک اس کی شہرت و مقبولیت اور معنویت میں کوئی فرق نہیں آیا اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں اور دنیا کی کئی زبانوں مثلاً عربی، انگریزی، پشتو، ملیالم اور ترکی میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔(۲)

ذات نبویؐ سے مصنف کی عقیدت

علامہ شبلی کو حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے ابتداء ہی سے خاص عقیدت و محبت اور والہانہ شیفتگی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "اُس نام نامی کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد پایاں نہ تھی"(۳)۔اس کا اظہار بھی شعوری و لاشعوری طور پر ہوتا رہا، علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ان کے قلم سے جو تحریر سب سے پہلے نکلی وہ تاریخ بدء الاسلام تھی، جس کا تعلق اصلاً سیرت ہی سے ہے۔ یہ سر سید کی فرمائش پر عربی زبان میں درسی ضروریات کے پیش نظر ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی(۴)،اور عرصہ تک کالج کے نصاب میں داخل رہی۔ مقتدی خاں شیر وانی نے اسے سیرۃ النبیؐ کا تخم قرار دیا ہے(۵)۔ سر سید کی فرمائش پر علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا بعد میں آغاز اسلام کے نام سے میمونہ سلطان شاہ بانو (بیگم حمید اللہ خاں بھوپال) نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو میں ایک اور ترجمہ حیات النبیؐ کے نام سے تاج کمپنی کراچی نے شائع کیا ہے، جس پر مترجم کا نام درج نہیں ہے(۶)۔اس کے بارے میں ڈاکٹر انور خالد محمود لکھتے ہیں:

> "اس رسالہ نے نہ صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد ﷺ کے لیے عقیدت و محبت کے جذبات پیدا کیے بلکہ خود مصنف کے دل میں عشق رسول کی قندیل روشن کر دی(۷)۔

چنانچہ مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں میں سیرت نبویؐ کے کسی پہلو پر تقریر کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور بعد میں میلاد کی یہ تقریبات نہایت شان و شوکت کے ساتھ سالار منزل میں منعقد ہونے لگیں۔(۸)

۱-معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸۔ ۲-مولانا شبلی پر ایک نظر ص ۱۳۳۔ ۳-یادِ رفتگاں ص ۱۱۶
۴-مقالات یوم شبلی ص ۱۱ ۵-کتاب نامہ شبلی ص ۲۰۔ ۶-ایضاً۔
۷-اردو نثر میں سیرت رسول ص ۵۳۸۔ ۸-حیات شبلی ص ۱۴۹

علامہ شبلیؒ نے اپنے اشعار و قطعات میں بھی ذات نبویؐ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ سیرۃ النعمان کے منظوم دیباچہ میں ان کا عشق حد انتہا پر دکھائی دیتا ہے۔

شیفتگانیم و پیمبر پرست
سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں بھی جب وہ علم الکلام اور الکلام کی تدوین و تصنیف میں مشغول تھے اس وقت بھی سیرت نبویؐ ان کی توجہ کا خاص مرکز رہی اور سب سے پہلے یہیں سیرۃ النبیؐ کی ابتدا بھی کی (۱) اور سنہ ۳ھ تک کے واقعات مورخانہ انداز میں لکھے۔ مگر مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ وہ جس انداز سے سیرت نبوی لکھ رہے تھے غالباً وہ خود انھیں پسند نہیں آیا اور وہ آگے نہ لکھ سکے (۲)۔ ان کی نگاہ میں سیرت نبوی کی تالیف کا معیار بہت بلند تھا وہ فرماتے تھے کہ سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے۔ لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرور کائنات ﷺ کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لیے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اُتر سکتی ہے۔ (۳)

علامہ شبلیؒ نے جب ناموران اسلام کا سلسلہ شروع کیا تو بقول مولانا سید سلیمان ندوی "بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور کا نام آنا چاہیے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا ہے (۴)۔ مگر یہ ایسا اہم اور نازک فریضہ تھا کہ علامہ شبلیؒ باوجود اس کی اہمیت و افادیت، ضرورت اور ذات گرامیؐ سے عشق کے عرصہ تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکے (۵)، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔ (۶)

اس شدید احساس کے باوجود متعدد اسباب کی بنا پر سیرت نبوی کی ضرورت کا خیال ان کے دل میں جاگزیں رہا اور قوم کی طرف سے بھی اس کے لیے پیہم اصرار ہوتا رہا جس کی بنا پر سیرت نبویؐ کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا اور جنوری ۱۹۱۲ء میں ماہنامہ الندوہ میں مجلس تالیف

۱-مکاتیب شبلی، ج۱ص ۳۳۶۔ ۲-حیات شبلی ص ۷۰۲۔ ۳-ایضاً ص ۷۰۳۔
۴-ایضاً ص ۷۰۲۔ ۵-سیرۃ النبیؐ ج۱ مقدمہ ص ۴۔ ۶-مقالات شبلی ج۸ ص ۳۳

سیرت کے قیام کا اعلان کیا اور قوم سے اس میں معاونت کی خواہش کی۔

تالیفِ سیرت کے مقاصد و ضروریات

ذیل میں ان اسباب و مقاصد کا ذکر کیا جاتا ہے جو سیرۃ النبیؐ جیسی معرکۃ الآرا اور بے مثال کتاب کی تالیف کا باعث بنے۔

تالیف سیرت کا پہلا سبب حضور اکرم ﷺ سے علامہ شبلی کی عقیدت و محبت کا بے پایاں جذبہ تھا اور وہ اس کو سعادت دارین کا ذریعہ اور وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> "سیرۃ النبیؐ بنیادی طور پر ایک عاشق رسولؐ کا والہانہ اظہار عقیدت ہے... یہ ایک گدائے بے نوا کی شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر ہے، جس کی فرط عقیدت پکار پکار کر کہہ رہی ہے:
>
> ز چشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن(۱)

مگر سیرت النبیؐ صرف ایک عقیدت مند کا نذرانہ عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ دور جدید کے معیار و مذاق کے مطابق بھی ایک اہم تصنیف ہے۔

۲- تالیف سیرت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس اردو زبان میں سیرت پر کوئی معتبر، مستند اور جامع کتاب نہ تھی اور جو کتابیں تھیں علامہ شبلی کے الفاظ میں "انھیں سیرت نبوی کہنا آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کو آزردہ کرنا ہے"(۲)۔ اس لیے یہ ایک اہم قومی اور دینی ضرورت تھی کہ اردو میں سیرت نبویؐ پر ایک مکمل و مفصل اور مستند و جامع کتاب لکھی جائے۔

۳- اردو ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی آنحضرت ﷺ کی مستند اور دور جدید کے معیار و مذاق کے مطابق سوانح عمری موجود نہ ہونے کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو عربی علوم و فنون سے ناواقف تھا انگریزی کتابوں کی طرف رجوع کرتا تھا، جو نہ صرف یہ کہ صحیح نقطہ نظر سے نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ ان میں جا بجا زہر بھی بھرا ہوا تھا جن کو پڑھ کر لوگ زیغ و ضلال کا شکار ہو رہے تھے اور رفتہ رفتہ ملک میں جدید دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آ گیا تھا جو آنحضرت ﷺ کو یورپ کے معیار کے مطابق محض ایک مصلح تصور کرتا

۱- سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۴۹۔ ۲- مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۳

تھا(۱)۔ اس لیے ضرورت تھی کہ حضور اکرم ﷺ کے مستند حالات و سوانح جدید طرز تحقیق کے مطابق اس طرح لکھے جائیں کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے اپنی علمی پیاس بجھا سکے۔

۴- علامہ شبلیؒ کے نزدیک سیرت نبویؐ کی ضرورت صرف تاریخی حیثیت ہی سے نہیں تھی بلکہ مستشرقین نے جب اس کو اپنا موضوع بنایا تو انھوں نے اس کے جلو میں عقائد کی بحثیں بھی شامل کرلی تھیں، گویا سیرت جدید علم کلام کا ایک اہم موضوع ہو گیا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

> "اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا۔ لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو یہ بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن اگر اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات اخلاق اور عادات کیا تھے"۔(۲)

دراصل سیرت نبویؐ کی تالیف کا یہ نہایت اہم سبب ہے اور علامہ شبلیؒ اس کو تمام دینی و دنیوی ضروریات کا مجموعہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے ایک اخلاقی ضرورت ہے ایک تمدنی ضرورت ہے ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے"۔(۳)

۵- علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا بنیادی مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل بتایا ہے اور اسے وہ کائنات کا سب سے اہم اور مقدس فریضہ تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو۔ دنیا کی تاریخ میں ان کے نزدیک ایسی جامع اور کامل ہستی صرف حضور اکرم ﷺ کی ہے کیونکہ نفوسِ انسانی میں صرف آپؐ ہی کے حالات اور کارنامہ زندگی نہایت وسعت و تفصیل اور صحت و صداقت کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ آپؐ کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی۔(۴)

۱- سیرۃ النبیؐ ج۱ مقدمہ ص۵۔ ۲- ایضاً۔ ۳- ایضاً ص۴۔ ۴- سیرۃ النبیؐ ج۱، ص۱-۴

۶- علامہ شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ علوم وفنون میں سیرت کا ایک خاص درجہ ہے اور اس کی غرض وغایت عبرت پذیری اور نتیجہ رسی ہے۔ اس لیے اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت نہ صرف ہم مسلمانوں کو ہے بلکہ تمام عالم کو اس کی ضرورت ہے (۱)۔ اور غالباً اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ سیرت میں ہر قسم کے مطالب آجائیں اور وہ صرف سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو۔ (۲)

۷- نفوس انسانی کی تربیت واصلاح ہی کی غرض سے علامہ شبلی مورخین یورپ کے کذب وافتراء اور ان کی غلطیوں کی تردید کرنا چاہتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ سے ان کی عقیدت ومحبت اور ان کی دینی حمیت وغیرت کو بھی بڑا دخل تھا، تاہم اس کے پس پشت اصل مقصد اسلام کی حقیقی عظمت وبلندی کے ساتھ مورخین یورپ کے خیالات کی اصلاح ہی تھا اور اسی لیے وہ سیرۃ النبیؐ کے انگریزی ترجمے کے آرزومند بھی تھے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> "سیرت نبویؐ کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے"۔ (۳)

بالآخر علامہ شبلی کو مذکورہ اسباب ومقاصد اور قوم کے اس پیہم اور شدید تقاضے نے کہ "وہ سب کام چھوڑ کر سیرت نبویؐ کی تالیف میں مصروف ہو جائیں" (۴)، مجبور کر دیا کہ وہ سیرت نبویؐ پر ایک جامع، مستند، مکمل اور مبسوط کتاب کی تالیف کا یہ گراں مایہ بار فریضہ انجام دیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے علامہ شبلی کی نظر میں تالیف سیرت کا معیار بہت بلند تھا اس لیے یہ بڑا دقت طلب اور مشکل کام تھا۔ ان کی نگاہ اس حقیقت پر بھی تھی کہ "آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا" (۵)۔ وہ لکھتے ہیں:

> "جس طرح امام بخاری ومسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا ہے۔ آج بیسیوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں، مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام،

۱- سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱-۴۔ ۲- مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۰۲۔ ۳- مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۶۔
۴- ایضاً ص ۳۴۔ ۵- سیرۃ النبیؐ ج ۱ مقدمہ ص ۵۔

سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ کسی میں یہ التزام نہیں ہے"۔(۱)

اس قدر بلند معیار پر سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین واقعتاً فرد واحد کے بس کی بات نہیں تھی اور شاید اسی احساس کے پیش نظر علامہ شبلی نے تجویز پیش کی کہ "مجلس تالیف سیرت نبویؐ" بنائی جائے جس کے علمی و مالی معاملات کے لیے باقاعدہ ایسے ارکان ہوں جو مربی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپے ماہوار دیں یا عام ارکان ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں یا معین بن کر نادر و نایاب اور قلمی کتابیں بہم پہنچائیں اور کسی اور مفید طریقہ سے مدد کریں تاکہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں ان کو یکجا کیا جاسکے اور کچھ مترجم ہوں جو ان کو پڑھ کر ان کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں اور کچھ علماء ہوں جو روایات کی تلاش و تنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں جو مسودوں کو صاف کریں۔ اس لائحۂ عمل کی صراحت کے بعد انھوں نے اخراجات کے لیے قوم سے ڈھائی سو ماہوار اور کتابوں کی خریداری کے لیے کچھ نقد روپے کی درخواست کی۔ عجیب بات ہے کہ شاہ شاہان کی سیرت نگاری کے لیے شبلی بے نوا کی اس درخواست پر ایک فرمانروائے ریاست نے اول اول لبیک کہا۔ چنانچہ کتابوں کی خریداری کے لیے نواب حمید اللہ خاں نے دو ہزار روپے عنایت کیے اور زبیدۂ وقت نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال نے تدوین سیرت کے لیے دو سو ماہوار منظور کر کے مصارف کی طرف سے علامہ شبلی کو مطمئن کر دیا۔ انھوں نے اسی موقع پر یہ قطعہ کہا تھا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

علمی معاونت کے لیے انھوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا سید سلیمان

۱- سیرۃ النبیؐ حاشیہ ص ۷۔

ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کو منتخب کیا۔ غرض ہر طرف سے مطمئن ہو کر آستانۂ رسالت میں پہنچے اور ۱۷ر جون ۱۹۱۲ء کو انتہائی جوش و سرمستی اور عزم و حوصلہ کے ساتھ سیرۃ النبی کی ابتدا کی۔ منشی محمد امین زبیری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "ہر حال میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی"۔(۱)

ان کے جذبات اور عزم و حوصلہ کا اندازہ مندرجہ ذیل قطعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرورِ عالم
دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالم قدوس سے آئی
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

سیرت نبوی کا خاکہ

اس انتظام کے بعد علامہ شبلی اس عظیم الشان تالیف کے ابتدائی خطوط اور خاکے بنانے میں مصروف ہوئے، ایک کے بعد ایک خاکے بنائے، بالآخر جس خاکے پر وہ مطمئن ہوئے اس کا ذکر سیرت کے مقدمہ میں ان کے قلم سے یوں ہے:

> "اس کتاب کے پانچ حصے ہوں گے۔ پہلے حصے میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں۔ اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت ﷺ کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے آل و اولاد اور ازواج مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔
>
> دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال و اخلاق ہے۔ اس بناء پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے۔ اس حصہ میں فرائض خمسہ اور اوامر و نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح

۱- مکاتیب شبلی، ج ۱ ص ۲۴۲۔

اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے۔ اسی میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے اور ہر زمانے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقایق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے۔ قدیم سیرت کی کتابوں میں الگ باب باندھے ہے لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے۔ یعنی یورپ نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جواب"۔(۱)

اس ضمن میں یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف و تدوین اس وقت شروع کی جب ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی۔ گوناگوں عوارض صحت کی خرابی، خانگی مسائل، بھائی کی وفات، مخالفین کی سازشیں اور سب سے بڑھ کر قومی و ملّی درد نے انھیں چور کر دیا تھا۔ صحت، خانگی مسائل اور ماحول کی اس ناموافقت و نامساعدت کے باوجود انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر سیرت نبویؐ کی تالیف کا کام شروع کیا(۲) اور لکھا کہ "سیرت کو جس طرح ہو (گو جان دے کر) پورا کرنا ہے(۳)۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی تصنیف پر وہ اپنی زندگی کا خاتمہ بھی چاہتے تھے اور اسے حسن خاتمہ تصور کرتے تھے(۴)۔ وفات سے چند ماہ پیشتر انھوں نے یہ الہامی قطعہ کہا جس کی صداقت اب سب پر آشکارا ہے۔

۱-سیرۃ النبیؐ ج۱، مقدمہ ص۶۵-۶۶۔ ۲-مکاتیب شبلی ج۱ص ۲۴۲۔

۳-ایضاً ص ۳۲۷۔ ۴-ایضاً ج۲ص ۲۳۲

نجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرؐ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ہماری علمی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ علامہ شبلی سیرۃ النبیؐ مکمل نہ کر سکے اور دنیا سے اس کی ناتمامی کا داغ لے کر گئے۔ ان کی تالیف کردہ دو جلدیں ان کی وفات کے وقت مسودہ کی حالت میں طباعت کی منتظر تھیں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں یہ جلدیں شائع ہوئیں جلد اول کے دیباچہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی حسرت سے لکھا کہ:

> ''مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھوں سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چُن کر اس کے ہاتھ آئے تھے ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا''۔(۱)

مگر شکر ہے کہ علامہ شبلیؒ نے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں رنگ بھرنے کے لیے ان کو مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسا لائق شاگرد اور جانشیں ملا جنھوں نے بعد کی پانچ ضخیم جلدوں کو بحسن وخوبی پورا کیا۔

علامہ شبلیؒ کے قلم سے سیرت کی جو جلدیں نکلی ہیں، آگے بڑھنے سے پہلے ان کے مشمولات ومحتویات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حصہ اول

سیرۃ النبیؐ جلد اول طبع جدید ۷۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں دو مقدمے ہیں پہلا مقدمہ معلومات ومباحث اور قدر وقیمت کے لحاظ سے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سیرت نبویؐ کی ضرورت، اہمیت، افادیت، سیرت ومغازی اور حدیث کا فرق، سیرت نگاری کی ابتداء وارتقاء، قدیم وجدید سیرت نگاری اور ان کی خوبیاں وخامیاں اور ان کے اصول سیرت نگاری کا ذکر ہے۔ حدیث اور اصول حدیث کا مفصل جائزہ اور مغربی مورخین اور سیرت نگاروں کی تصانیف ان کی غلط کاریاں اور اس کے اسباب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان اصولوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کا سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مقدمہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے عالمانہ تنقید کا شاہکار قرار دیا ہے(۲)۔ ڈاکٹر سید شاہ

۱۔ سیرۃ النبیؐ ج۱، دیباچہ طبع اول ص۸۔
۲۔ فن سیرت نگاری پر ایک نظر، فکر ونظر اسلام آباد اپریل ۱۹۷۶ء ص ۳۸۰

علی نے لکھا ہے کہ سارے اسلامی ادب میں اس مقدمہ کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے(۱)۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

> "اس میں مصنف نے اپنی علمیت، ذہانت، گہرے مطالعہ، تنقیدی صلاحیت اور مورخانہ ژرف نگاہی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیرت نبویؐ پر قلم اٹھانے کا حق انھیں کا تھا"۔(۲)

دوسرے مقدمہ میں تاریخ عرب قبل از اسلام، عرب کی وجہ تسمیہ، اقوام و قبائل کے علاوہ اس عہد کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کی قدامت، نیز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا تذکرہ بھی ہے۔اس دوسرے مقدمہ کو اصل کتاب کا ابتدائی باب بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

ان دونوں مقدموں کے بعد کتاب کے آغاز میں حضور اکرم ﷺ کا شجرۂ نسب اور آپؐ کے آباء واجداد کا مختصر احوال ہے۔اس کے بعد حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا ظہور قدسی کے عنوان سے وہ ذکر ہے جس کو اب اردو ادب میں شہ پارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ علامہ شبلی کے قلم سے اس میں جس جوش و سرمستی کا اظہار ہوا ہے اس سے یہ تحریر الہام بن گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظام میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضاو قدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابرہیم، جمال یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جاں نوازی مسیح سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین ﷺ کے دربار میں کام آئیں گے۔
>
> آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال

۱-اردو میں سوانح نگاری، ص ۲۰۴۔ ۲-اشخاص واذکار ص ۱۱۴

ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ ”آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدہ فارس بجھ گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش کدۂ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر آزر کدۂ گمر ہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازہ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اُٹھا“۔(۱)

ظہور قدسی کے باب میں تاریخ ولادت، اسم گرامی، رضاعت، حلیمہ سعدیہ کی پرورش، رضاعی باپ، بھائی، بہن، سفر مدینہ، والدہ ماجدہ کی وفات، دادا عبدالمطلب و چچا ابو طالب کی کفالت، سفر شام اور بحیرا راہب کا قصہ، حرف فجار اور حلف الفضول میں شرکت، تعمیر کعبہ، تجارت اور تجارتی اسفار، تزویج خدیجہؓ، اجتناب شرک موحدین سے ملاقات اور احبابِ خاص کا ذکر ہے۔

اسی حصہ میں ”آفتابِ رسالت کا طلوع“ کے عنوان سے نبوت کے واقعات ہیں جس میں ہجرت کے پہلے کے تمام واقعات بہ ترتیب لکھے گئے ہیں۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کے مراسم جاہلیت، لہو و لعب سے فطری اجتناب، غار حرا کی عبادت، رویائے صادقہ سے نبوت کا آغاز، پہلی وحی، دعوت اسلام کا آغاز اور حضرت ابو بکر کا قبولِ اسلام وغیرہ کا بیان ہے۔ اس کے بعد قریش کو دین کی دعوت اور ان کی مخالفت و ایذا رسانیوں کا ذکر بعد ازاں حضرت حمزہؓ و حضرت عمرؓ کا قبول اسلام، تعذیب مسلمین، مسلمانوں پر ظلم و ستم اور ان کا استقلال، ہجرت حبشہ اور نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر کی تقریر اور اس کا اثر، واقعہ غرانیق، شعب ابی طالب کی محصوری، حضرت خدیجہؓ اور چچا ابو طالب کی وفات کا بیان ہے۔ اسی ضمن میں سفر طائف، مطعم بن عدی کی پناہ، تبلیغ دین اور کفار کی ایذا رسانیاں، مسلمانوں کی گھبراہٹ اور آپ کی تسلی، مدینہ منورہ، انصار اور انصار کی قدیم تاریخ نیز بیعت عقبہ اور

۱۔ سیرۃ النبی ج ۱، ص ۱۱۴۔

ثانی وغیرہ کی تاریخ لکھی گئی ہے۔

سنہ اھ کے ذیل میں ہجرت کے واقعات اور مدینہ منورہ میں قیام کی تفصیل ہے، اس میں ہجرت کی اجازتِ خداوندی، ہجرت کا ارادہ اور کفار کا محاصرہ اور اس کی ناکامی، غارِ ثور کی روپوشگی اور کفار کا تعاقب، مدینہ آمد اور اہل مدینہ کا جوشِ مسرت، قبا میں نزول اور تعمیر مسجد، پہلی نماز جمعہ و خطبہ، مسجد نبوی کی تعمیر، ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر، اذان کی ابتدا، مواخات اور طریقۂ مواخاۃ، انصار کا ایثار صفہ اور اہل صفہ اور مدینہ کے یہودیوں کے معاہدوں کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد اس سنہ کے متفرق واقعات بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔

سنہ وار ذکر میں تحویل کعبہ اور اس کے وجوہ، غزوۂ بدر، سویق، احد، بنو قینقاع، بنو نضیر، مریسیع، غزوۂ احزاب، بنو قریظہ وغیرہ کے تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے، اسی میں واقعہ افک کا بھی بیان ہے۔ سلسلہ وار ذکر میں حضرت زینب سے نکاح، صلح حدیبیہ، بیعت رضوان، سلاطین کو دعوت اسلام، خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبول اسلام، فتح خیبر، ادائے عمرہ، غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوۂ حنین، محاصرۂ طائف، واقعۂ ایلاء، غزوۂ تبوک اور حج اکبر کی تمام تاریخی تمدنی اور تہذیبی تفصیلات قلمبند کرنے کے بعد سلسلۂ غزوات پر دوبارہ نظر ڈالی ہے، جس سے اسلام کے اصول جنگ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ حصہ اول کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے سچ لکھا ہے کہ:

> "ان تمام حالات وواقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے متعلق ہوں یا میدان جنگ سے، خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں یا عام انسان کی حیثیت سے، دشمنوں سے متعلق ہوں یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اس طرح پیش کیا ہے کہ جس سے آپ کی پیغمبرانہ صداقت واخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور آپؐ کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپؐ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے"۔(۱)

اس حصہ میں مورخین یورپ کی غلط بیانیوں اور ان کے بے جا اعتراضات کا جابجا رد وابطال بھی کیا گیا ہے۔

۱- معارف سلیمان نمبر، ص ۱۸۱۔

حصہ دوم

سیرۃ النبیؐ کا دوسرا حصہ طبع جدید ۵۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کی آخری تین سالہ پُرامن زندگی کی تاریخ اور اس عہد زریں کے حالات وواقعات ہیں۔ شروع میں قیام امن کی کوششوں کا ذکر ہے اس کے بعد وفود عرب کی آمد، قبول اسلام، تاسیس حکومت الٰہی، مذہبی انتظامات، شریعت کی تاسیس و تکمیل، اسلامی عقائد، عبادات و معاملات، حلال و حرام، حجۃ الوداع اور شریعت کا اعلانِ عام، وفات نبویؐ، تجہیز و تکفین اور متروکات وغیرہ کی تفصیل ہے۔ اسی میں حضور اکرم ﷺ کے شمائل و معمولات، حلیہ، مہر نبوت، گفتگو، لباس، غذا، مرغوبات اور صبح سے شام تک کے معمولات کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد مجالسِ نبویؐ، خطابتِ نبویؐ، عبادتِ نبویؐ، اخلاقِ نبویؐ، ازواج مطہرات اور ان کے ساتھ برتاؤ اور اولاد وغیرہ عنوانات کے تحت بے شمار حالات وواقعات کے ذریعہ اس عہد زریں کی مرقع کشی کی گئی ہے جس سے آپؐ کی پیغمبرانہ شان اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔

اس دوسرے حصہ کی تکمیل سے پہلے ہی علامہ شبلی سفر آخرت پر روانہ ہوگئے اس لیے مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل اپنے بعض اضافوں کے ذریعہ کی۔ ان اضافوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

> "جلد دوم میں سید سلیمان ندوی نے اصل متن میں جو اضافے کیے ہیں وہ کتاب میں قیام امن، تبلیغ اشاعت اسلام، تاسیس حکومت الٰہی کے عنوان کے تحت شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مذہبی انتظامات، تکمیل شریعت، عقائد، عبادات معاملات اور حلال وحرام کے مباحث میں بھی سید صاحب نے معتدبہ اضافہ کیے ہیں۔ سال آخر (سنہ ۱۰ھ) سال وفات، متروکات اور شمائل نبویؐ وغیرہ میں سید صاحب نے کسی خاص اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن خطابت نبویؐ اور عباداتِ نبویؐ کے ابواب مکمل طور پر اور معمولات نبویؐ اور مجالسِ نبویؐ کے ابواب کافی حد تک سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ ہیں۔ اخلاقِ نبویؐ کے طویل باب میں استاذ وشاگرد دونوں کا اشتراک ہے، البتہ آخری تینوں ابواب (آنحضرت ﷺ کے ازواج واولاد) میں شاگرد نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے"۔(۱)

۱۔ اردو نثر میں سیرت رسولؐ، ص ۵۵۸۔

تحسین و تنقید

سیرۃ النبیؐ کا غلغلہ اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پورے ملک میں بلند ہو چکا تھا اور ہر شخص کی نگاہ سیرۃ النبیؐ پر لگی ہوئی تھی، چنانچہ جب سیرۃ النبیؐ طبع ہو کر آئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور اپنے اپنے ظرف کے پیمانوں میں ناپی گئی۔ بحیثیت مجموعی اہل علم کا یہ اعتراف ہے کہ آج تک اس موضوع پر سیرۃ النبیؐ جیسی معیاری اور بلند پایہ کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی جا سکی ہے۔

اس اعتراف عام اور خراج و تحسین کے باوجود اس پر متعدد اعتراضات بھی کیے گئے ہیں ان اعتراضات کو معاندانہ اور غیر معاندانہ دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

معاندانہ تنقید

علامہ شبلی نے جب سیرتِ نبویؐ کی تالیف کا اعلان کیا تو بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا"۔ مگر ایک آواز اس کے خلاف بھی آئی، مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن لاہور نے لکھا کہ "چونکہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری اس کے لکھنے کا ارادہ کر چکے ہیں اس لیے مولوی شبلی کو تکلیف کی ضرورت نہیں" (۱)۔ ظاہر ہے سیرت کے لیے یہ اعلان کس درجہ غلط اور مضحکہ خیز ہے؟ اس موقع پر سرسید احمد خاں کا یہ قول بھی حد درجہ برمحل اور معنی خیز ہے کہ "اگر ایک ہی موضوع پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی" (۲)۔ سرسید نے اپنی رائے سیرۃ النبیؐ کی تالیف سے پہلے ظاہر کی تھی۔ بہر حال مولوی انشاء اللہ خاں کی نامناسب اور ضعیف آواز علامہ شبلی کے عزم و حوصلہ کے سامنے گرد ثابت ہوئی مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کو یہ بات پسند نہ تھی کہ فرمانروائے بھوپال کی سرپرستی میں سیرتِ نبویؐ پر جو کتاب لکھی جائے وہ علامہ شبلی کے قلم سے ہو اور وہ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ اس کے منتظر تھے کہ سیرت نبویؐ کا کوئی صفحہ منظرِ عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کر دیں۔ (۳)

مولانا شبلی کی خواہش کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد نے مقدمہ سیرت کو الہلال میں اس مقصد سے شائع کیا کہ ارباب نظر دیکھ لیں کہ کتاب کس قدر تحقیق و تنقید اور تدقیق

۱۔ دیباچہ رحمۃ للعالمین حصہ سوم، ص ۷۔ ۲۔ بحوالہ حیات شبلی ص ۲۳۵۔ ۳۔ حیات شبلی، ص ۷۱۔

سے لکھی گئی ہے۔ انھوں نے یہ درخواست بھی کی کہ اہلِ علم بحث و مذاکرہ سے دریغ نہ کریں اور سیرت و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے علماء اپنے مفید مشورے دفتر سیرت یا الہلال تک پہنچائیں(۱)۔ اس سلسلہ میں دو مراسلے شائع ہوئے، ایک مراسلہ حکیم غلام غوث صاحب بہاولپوری کا تھا(۲) اور دوسرا مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے لکھا تھا(۳)۔ ان کے علاوہ کسی نے اس مذاکرۂ علمی میں حصہ نہیں لیا، مولانا آزاد نے اس پر اپنے تاسف کا بھی اظہار کیا(۴)، حالانکہ حکیم غلام غوث بہاولپوری نے علمائے دیوبند سے بھی اس میں حصہ لینے کی درخواست کی تھی(۵)، مگر معاندانہ طرز عمل رکھنے والوں نے اس علمی انداز کے بجائے دوسرا غیر علمی رُخ اختیار کیا۔ چنانچہ مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر النجم نے مقدمہ سیرت پر اپنے نقطہ نظر سے سخت تنقید کی، مخالفین نے جس میں دیوبند کے لوگ بھی شامل تھے اس تنقید کو دستاویز بنا کر بیگم بھوپال تک پہنچایا تاکہ سیرت کی امداد بند ہو جائے۔ مخالفین کے اس معاندانہ طرز عمل کا اندازہ بیگم بھوپال کو بھی ہو گیا کہ یہ چند مولویوں کی معاندانہ حرکتیں ہیں، اس لیے امداد جاری رہی مگر مخالفین نے بھی اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔ مصنف کو فتوئ کفر سے نوازا گیا، یہاں تک کہ مسودہ سیرت کے سرقہ کی بھی کوشش کی گئی۔(۶)

گو سرکار عالیہ کی خواہش تھی کہ معاندین کی ان تنقیدوں کا بھی جواب لکھا جائے مگر علامہ شبلی چونکہ ان اعتراضات کو مہمل اور معاندانہ تصور کرتے تھے(۷)، اس لیے ان کا جواب بھی دینا نہیں چاہتے تھے ہاں ان کی یہ خواہش تھی کہ مسودۂ سیرت کسی عالم کے پاس بھیج دیا جائے اور وہ دیکھ کر اپنی رائے دیں تاکہ ملک کے اعتماد کا باعث ہو۔ اس سلسلہ میں خود انھوں نے مولانا محمود حسن صاحب کا نام پیش کیا اور ان کی خدمت میں بھی اپنی خواہش پیش کی، مگر اس خواہش کا جو انجام ہوا وہ علامہ شبلی کی زبانی ملاحظہ ہو:

> "آج ان کا (مولانا عبیداللہ سندھی) خط آیا کہ وہ گئے لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ وہ مسودے کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں، دیوبند

۱- الہلال، مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء ص ۸۔ ۲- ایضاً، ۳۰ر اپریل ۱۹۱۳ء بعنوان سیرت نبویؐ

۳- ایضاً، ۲۱ و ۲۸ر مئی ۱۹۱۳ء بعنوان سیرت نبویؐ اور نقد روایات و آثار۔ ۴- ایضاً، ۳۰ر اپریل ۱۹۱۳ء ص ۱۰۔

۵- ایضاً۔ ۶- مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۲۰۹-۲۱۰ و ج ۲، ص ۱۶۱۔ ۷- ایضاً، ج ۱، ص ۲۵۶

کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہ الگ ہیں چنانچہ مولوی عبید اللہ سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنا دیا، لیکن مولوی محمود حسن صاحب سے ان کے تعلقات اب تک وہی ہیں۔ بہر حال اب غور کرنا چاہیے کہ کیا کیا جائے، چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے اس لیے سر دست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑیگا"۔(۱)

سیرۃ النبیؐ شاید اردو کی پہلی ایسی تالیف ہے جس کے مصنف پر قبل از اشاعت اس قسم کا دباؤ ڈالا گیا۔ معاندین کے اعتراضات ہمیں دستیاب نہ ہو سکے، مولانا شبلی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے علامہ شبلی پر بخاری و مسلم کی روایتوں کو ضعیف ثابت کرنے کا الزام عائد کیا تھا۔ مگر مولانا نے اس کی تردید کی ہے۔(۲)

غیر معاندانہ تنقید

معاندانہ تنقیدوں کے علاوہ بعض نقادوں نے سیرۃ النبیؐ کی ممتاز حیثیت اور مسلمہ فضیلت کے باوجود اس پر علمی انداز سے تنقیدیں کی ہیں۔ ذیل میں اس طرح کی چند تنقیدوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

فاضل نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ علامہ شبلی کے بڑے مداح اور ان کے کارناموں کے ثناخواں ہیں، مگر انھوں نے سیرۃ النبیؐ پر بعض اعتراضات وارد کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بار بار کے دعویٰ کے باوجود بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ ہے۔ شبلی نے مورخین یورپ کے اعتراضات سے دب کر آنحضرت ﷺ کے غزوات کے سلسلہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ معذرت کا لہجہ اختیار کیا ہے۔ اسی طرح غلامی اور تعدد ازدواج کے مسئلے کے تجزیے میں بہت کچھ دبے دبے نظر آتے ہیں اور ہر چند کہ وہ پیغمبر کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں بار بار مغربی نقادوں کی اس رائے سے مرعوب ہو کر چلتے ہیں کہ حضور کا ہر قول و فعل عام بشریت کے مطابق تھا۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ عام بشر نہ تھے

۱۔ مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۲۶۰۔ ۲۔ ایضاً ص ۲۶۱

خاص بشر تھے، کتاب کا وہ حصہ بھی قدرے تحقیق طلب ہے جس کا تعلق غزوات کے جغرافیے سے ہے۔ شبلی کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ ان مقامات کا خود مشاہدہ کرتے جہاں جنگیں ہوئیں"۔(۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے یہ اعتراضات دراصل سیرۃ النبیؐ کے بنیادی مقصدِ تصنیف پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تصنیف سے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسبِ موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطی اور بددیانتی کی ہے نہایت زور و شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے"۔(۲)

اس پردہ دری کو معذرت اور مدافعت سمجھنا درست نہیں۔ مورخین یورپ نے جس انداز سے کذب بیانی کی ہے اور جھوٹ ملایا ہے، آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی پہلو شاید ہی ان کی تنقیدوں سے محفوظ ہو۔ اگر ایک سیرۃ نگار مورخ اس کی تردید نہیں کرتا ہے تو اس پر مقصد سے گریز اور مورخانہ ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآنہ ہونے کا الزام عائد ہوگا۔ علامہ شبلی نے تو بالکل درست مورخانہ فریضہ انجام دیا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں ادیبوں اور نقادوں کا ایسا طبقہ سامنے آیا جس نے تردید و جواب کو مدافعت اور معذرت کہہ کر اس طرح کی مؤرخانہ کوششوں کی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی۔ دورِ حاضر کے مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:

> "اسلامی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حد تک پہنچ گیا تو اصلاحِ حال کے لیے بعض مسلمان مصنفین نے اپنا قلم اٹھایا، پر فریب ذہنوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے اس سارے لٹریچر کو جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا اور مطالعہ سے پہلے ہی ان مصنفین کے اندازِ تحقیق کو مشتبہ بنا دیا"۔(۳)

قدیم مورخین نے عموماً غزوات کے اسباب و علل پر روشنی نہیں ڈالی اور نہ اس

۱۔ فنِ سیرت نگاری پر ایک نظر، فکر و نظر اسلام آباد ۱۹۷۶ء ص ۸۳۱۔ ۲۔ مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۲۰۱۔
۳۔ شبلی بحیثیت مورخ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۲۱۰۔

سلسلہ میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ ان کی اس خامی کی وجہ سے مغربی مورخین نے معرکوں کی ابتداء اور جنگ و جدل کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اصول تاریخ کی رو سے جب واقعات کے اسباب و علل پر غور کیا خصوصاً غزوات کے سلسلے میں تو یہ حقائق سامنے آئے کہ غزوات کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ یہ سلسلہ کفار نے شروع کیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسباب و علل کی تلاش فلسفۂ تاریخ کی رو سے نہایت ضروری ہے، یہ اصول مغرب ہی کا ایجاد کردہ ہے۔ علامہ شبلی نے انھیں کے اصول پر عمل پیرا ہو کر انھیں کے اسلوب میں ان کا جواب دیا، اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ درحقیقت یہی مورخانہ اور حقیقت پسندانہ انداز نگارش علامہ شبلی کا امتیاز ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے اعتراضات تسلیم کرتے ہوئے اگر اسباب و علل کی تلاش نہ کی جائے تو مورخین یورپ کا یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے صحیح ثابت ہوگا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں اس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں۔ اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے"۔(۱)

ڈاکٹر صاحب نے عام بشر اور خاص بشر کی اصطلاحات کے ذریعہ جو اعتراض کیا ہے غالباً اس کی حقیقت سے وہ خود بھی واقف نہیں تھے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کی تفسیر اور اس کے اسرار و نکات کی جگہ اور ہے، یہاں یہ بے محل اور بے موقع ہی کہی جائے گی۔

جہاں تک مقام غزوات کے جغرافیے کے مشاہدہ کا تعلق ہے بلاشبہ علامہ شبلی نے ان مقامات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا لیکن ایک مورخ کے لیے تمام مقامات جنگ کا بچشم خود معائنہ کرنے کا اصول راقم کے خیال میں فن تاریخ میں قطعاً ضروری اور لابدی نہیں سمجھا گیا ہے، اس لیے یہ اعتراض بھی غور و فکر سے خالی اور بے وزن ہے۔

ایک اور ناقد ڈاکٹر سید شاہ علی نے سیرۃ النبیؐ میں اقتباس کی کثرت اور تضاد بیانی

۱- سیرۃ النبی ج ۱ مقدمہ ص ۳۹۔

ڈھونڈ نکالی ہے۔ علامہ شبلی کی کسی تصنیف پر اس طرح کا مہمل اعتراض خود ناقد و معترض کے بے بہرہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سیرۃ النبیؐ کی جامعیت کے بھی منکر ہیں(۱)۔ جب کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جامعیت کو سیرۃ النبیؐ کا سب سے بڑا وصف قرار دیتے ہیں(۲)۔ طبقۂ ناقدین کی اس تضاد بیانی کو کیا کہا جائے؟

ڈاکٹر سید شاہ علی کا یہ بھی اعتراض ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں آنحضرت ﷺ کی ابتدائی زندگی کے حالات کا فقدان ہے۔ تجارتی اسفار، موحدین اور احباب کا ذکر بھی تشنہ ہے، حالانکہ اسی سے بیرونی اثرات اور فطری رجحانات کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے(۳)۔ یہ اعتراض اگرچہ درست نہیں تاہم اگر کسی درجہ میں اسے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ علامہ شبلی نے اسے دانستہ نظر انداز کر دیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کے متعلق صحیح روایات کے فقدان کی وجہ سے انھوں نے بے سر و پا روایتوں کی تفصیل میں پڑنے کے بجائے اختصار کو ترجیح دیا ہے۔ شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ "انھیں میں یورپین سیرت نگار اسلام کے ماخذ ڈھونڈتے ہیں، اس لیے علامہ نے ان معاملات میں خاص احتیاط سے کام لیا ہے۔(۴)

خلاصہ یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ پر جو اعتراضات کیے گئے ان میں بیشتر جانبدارانہ مطالعہ اور معاندانہ روش کا نتیجہ ہیں، واقفیت اور معقولیت سے ان کا تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

مورخین یورپ کے جوابات

سیرۃ النبیؐ میں علامہ شبلی نے مستشرقین اور مورخین یورپ کی زہر افشانیوں کا خاص طور سے ردّ و ابطال کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات مقدس اور آپؐ کے اخلاق کریمہ پر مورخین یورپ نے متعدد اعتراضات و اتہامات وارد کیے تھے، علامہ شبلی نے ان اعتراضات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر ان کے جوابات کے لیے انھوں نے سیرۃ النبیؐ کا ایک جدا حصہ خاص کیا تھا اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسے نہ لکھ سکے، تاہم جلد اول میں انھوں نے جا بجا ان اعتراضات کی مدلل تردید کر دی ہے یہاں اس کی ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۲۔
۲۔ فکر و نظر اسلام آباد مارچ ۱۹۷۶ء ص ۸۲۵۔
۳۔ اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۴-۲۰۵۔
۴۔ یادگار شبلی ص ۳۴۰۔

آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی پر بھی مورخین یورپ نے اعتراضات کیے ہیں اور آپ کو پیغمبر کے بجائے فاتح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی پیغمبر اور فاتح کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عین اس وقت جب معرکہ کارزار گرم ہے تیروں کا مینہ برس رہا ہے تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں عین اسی حالت میں آنحضرت ﷺ کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکہ بدر میں حضرت علیؓ عین شدت جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے"۔(۱)

حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے بارہ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں، سامنے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے رہے لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُر جلال آواز آرہی ہے:

انا النبی لا کذب ـــــ میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اسی وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش تہور و جاں بازی، غیظ و غضب اب عجز و نیاز، تضرع وزاری اور خشوع و خضوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولینِ جنگ آکر بقیہ نمازیں

۱۔ سیرۃ النبی ج ۱، ص ۴۳۴۔

پوری کر لیتے ہیں، یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں امام (رسول) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے"۔(۱)

اسی طرح اور بھی متعدد اعتراضات کا انھوں نے جائزہ لیا ہے مثلاً سر ولیم میور کا یہ اعتراض کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے(۲)، یا مارگولیوتھ کی یہ ہرزہ سرائی کہ آنحضرت ﷺ کا خاندان مبتذل تھا(۳) اور آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب آپؐ کی طرف سے لاپرواہ تھے(۴)، یا یہ اعتراض کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہؓ سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا(۵)، یا عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی(۶)، یا یہ افسانہ کہ آپ نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹے اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی مکہ میں آیا تو وہ مکہ پر قابض ہو جائے گا، میرے ہاتھ کیا لگے گا، اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے(۷)، یا ڈریپر کی یہ تحقیق انیق کہ بصرہ کی خانقاہ میں بحیرہ راہب نے آپؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی تھی(۸)، اس قسم کے بے بنیاد لغو اور بے سروپا الزامات بلکہ اتہامات کا علامہ شبلی نے مستند حوالوں اور تاریخ کی روشنی میں ردّ و ابطال کیا ہے۔

سیرۃ النبیؐ اس نوع سے لکھی جانے والی پہلی کتاب سیرت ہے اور یہ اس کا خاص وصف و امتیاز ہے۔

سیرۃ النبی اصول تاریخ و سیر کی روشنی میں

علامہ شبلی نے تاریخ اور سیرت نگاری کے جو بلند اور معیاری اصول و ضوابط متعین کیے ہیں اور جن کا انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے ان پر خود وہ کہاں تک سیرۃ النبیؐ میں عمل پیرا رہے اور ان کا کس قدر پاس و لحاظ رکھا۔ یہاں ہم اسی حیثیت سے سیرۃ النبیؐ کا ایک جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلہ میں نقادوں نے سیرۃ النبیؐ پر جو اعتراضات کیے ہیں یا جن کمیوں کی نشاندہی کی ہے ان کی حقیقت و حیثیت کا بھی ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں:

۱- سیرت کے متعلق ہم نے علامہ کے نظریۂ تاریخ پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے

۱- سیرۃ النبی ج ۱، ص ۴۴-۴۳۵ م ۳۴۳۔ ۲- ایضاً ج ۱ حاشیہ ص ۱۰۸۔ ۳- ایضاً۔ ۴- ایضاً ص ۱۱۸
۵- ایضاً ص ۱۲۹۔ ۶- ایضاً ص ۱۳۰۔ ۷- ایضاً ص ۱۳۰۔ ۸- ایضاً ص ۱۳۰۔

کہ ان کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کے لیے کسی دوسرے ماخذ کی ضرورت نہیں۔ سیرۃ النبیؐ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان تمام واقعات میں جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اصل ماخذ قرآن مجید ہی کو بنایا ہے، عقائد اور اوامر ونواہی کا اصل مرجع قرآن مجید ہے، اس لیے ان میں خاص طور سے اس کا اہتمام کیا ہے، غزوۂ بدر، واقعہ ایلا اور دوسرے بہت سے واقعات میں قرآن مجید کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے، علامہ شبلی سے پہلے کسی سیرت نگار کے ہاں اس اصول کے اہتمام کی کوشش نظر نہیں آتی، یقیناً یہ علامہ شبلی کی اولیات وامتیازات میں خاص درجہ رکھتی ہے۔

۲- علامہ شبلی نے واقعاتِ سیرت کے متعلق قرآن مجید کے بعد احادیث صحیحہ کو اصل ماخذ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تاریخ اور سیر و مغازی کے مقابلہ میں احادیث کا سرمایہ زیادہ مستند ہے اس لیے انھوں نے تالیف سیرت میں تاریخ وسیر کی روایات کے مقابلہ میں احادیث صحیحہ کو فوقیت دی اور سیرۃ النبیؐ میں اپنے اصول کا خاص اہتمام کیا۔ ان سے پہلے اس طرح کی کوشش پروفیسر مارگولیوتھ نے اپنی کتاب محمدؐ میں کی تھی مگر علامہ شبلی پہلے مورخ ہیں جنھوں نے اس اصول وضابطہ کو واقعی اہمیت وحیثیت دی اور اسے سیرت کا بنیادی ماخذ قرار دیا کیونکہ وہ اپنے وسیع مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے "اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں (۱)، اور جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں (۲)۔ خود علامہ شبلی کو اس کا احساس تھا، چنانچہ ایک جگہ صاف لکھا کہ "ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کیے جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے" (۳)۔ مثلاً واقعہ غرانیق میں اربابِ تاریخ وسیر نے جو روایات نقل کی ہیں انھیں سرے سے اسی بنا پر مسترد کر دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی وغیرہ نے ان روایات کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

اسی طرح حضرت زینبؓ سے آنحضرت ﷺ کے نکاح کے بارے میں متعدد بے سروپا روایتیں اربابِ سیر نے نقل کی ہیں علامہ شبلی نے ان باطل روایات کو مسترد کر کے ان

۱- سیرۃ النبی ج۱، ص ۶۵۔ ۲- ایضاً۔ ۳- ایضاً۔

کے مقابلہ میں صحیح احادیث وروایات کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے علامہ شبلی پر ان کی خلاف ورزی کا الزام لگایا ہے اور اعداد و شمار کی روشنی میں لکھا ہے کہ "اس کتاب کے مواد و مشتملات کی تحقیق و تفتیش کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ سیرۃ النبیؐ میں غیر مستند یا کم مستند روایات کا تناسب کم از کم پچاس یا ساٹھ فیصد ہے(۱)۔ مگر چونکہ ڈاکٹر صدیقی نے علامہ شبلی کی خردہ گیری کے شوق میں ان کے اصول تاریخ وسیر کو پیشِ نظر نہیں رکھا اس لیے ان کو اس سعی لاحاصل پر ہی قناعت کرنی پڑی، حقیقتاً علامہ شبلی نے پورے طور پر غیر مستند روایات سے احتراز کیا ہے۔

۳- مآخذ سیرت سے متعلق علامہ شبلی نے یہ اصول بھی پیش کیا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے بعد تاریخ وسیر کا درجہ ہے چنانچہ انھوں نے روزمرہ اور عام واقعات میں تاریخ وسیر کی روایتیں نقل کی ہیں، ان میں بھی جو اہم واقعات ہیں ان میں اولاً احادیث صحیحہ کی تلاش کی ہے نہ ملنے پر تاریخ وسیر کی روایتیں نقل کی ہیں، لیکن اس میں بھی ان کا معیار کہیں فروتر نہیں ہے۔

۴- جیسا کہ نظریۂ تاریخ کے ضمن میں لکھا جاچکا ہے، علامہ شبلی نے مورخ کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ لکھے اس عہد کے تمام سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حالات قلمبند کرے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس اصول کے مدنظر عہد رسالت کے تمام سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حالات وواقعات کا استقصا کیا ہے اور خاص حضور اکرم ﷺ کے ذاتی حالات وسوانح اور آپؐ کی حیات طیبہ کی تمام تفصیلات اس طرح تحریر کی ہیں کہ عہد نبویؐ کا معاشرہ بلکہ ہر پہلو اور ہر گوشہ واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "شبلیؒ نے آپؐ کی شخصیت کی خارجی اور بشری جزئیات اتنی مفصل پیش کی ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کو اردو میں سوانحی ادب کی مکمل اور مفصل ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔ آپؐ کی خلوت اور جلوت کے باریک اور چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات، آپ کی عادات وشمائل کے لطیف پہلو ان سب باتوں سمیت جن کا اظہار عموماً نہیں کیا جاتا سیرۃ النبیؐ کے اوراق میں جمع ہو گئے ہیں"۔(۲)

۱- ترجمان الاسلام وارانسی جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء ص ۱۳۔

۲- سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۱۔

تاریخ کے اس بنیادی اصول سے لکھی جانے والی اردو میں سیرت کی یہ پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ اس سے پہلے عموماً تاریخ کی کتابوں میں کسی ایک ہی پہلو پر توجہ دی جاتی تھی۔ سیرت النبیؐ سے پہلے کی اردو تصانیف سیرت کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

> ''سیرت کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرت نبویؐ پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر مغازی واخلاق و شمائل نبویؐ پر مشتمل ہیں اور ان میں روایات کی صحت اور تحقیق و تنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب ویابس روایات کا مجموعہ ہیں''۔(۱)

۵-علامہ شبلی کے نزدیک مورخ کا ایک ضروری فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے صحیح لکھے اور واقعات کی صحت کے لیے ہر ممکن تحقیق و تنقید سے کام لے۔ چنانچہ خود علامہ شبلی از اول تا آخر اس اصول پر قائم نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنے پیش رو اسلامی مورخین کی بہ نسبت زیادہ چھان بین سے کام لیا ہے اور کوئی بھی واقعہ یا روایت بغیر صحت و صداقت کے نقل نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ جس واقعہ یا روایت میں کسی قسم کی کوئی کمی یا خامی نظر آئی اسے نظر انداز کر دیا، بعض مقامات پر اس کے اسباب بھی لکھ دیے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند اہل قلم نے اعتراضات بھی کیے ہیں، مگر وہ اعتراضات اصلاً فنِ حدیث اور تاریخ و سیر کے بنیادی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

۶-واقعات کی صحت کی تعیین کا ایک اسلامی اصول روایت ہے۔ علامہ شبلیؒ نے خاص طور پر مورخ کے لیے اس اصول کا بروئے کار لانا ضروری قرار دیا ہے اور روایتوں کو بلا بحث و تمحیص نقل کرنے کو رواۃ پرستی سے تعبیر کیا ہے(۲) اور خود سیرۃ النبیؐ میں روایت اور اس کے اصول و فروع اور جزئیات سے کام لے کر ہر ممکن کوشش کی ہے کہ واقعہ میں صحت کی تعیین ہو جائے۔ قدیم ارباب سیر و تاریخ کے ہاں اس کا التزام نظر آتا ہے، مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ عموماً ان حضرات نے یہ روایتیں حدیث کی کتابوں میں ان موقعوں پر تلاش کیں جہاں انھیں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے درج ہونا چاہیے اور جب وہ وہاں نہ ملیں تو کم درجہ کی روایتیں نقل کر دیں جس سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ خاص طور سے مورخین یورپ نے حضور

۱-معارف سلیمان نمبر ص۱۷۸۔ ۲-سیرۃ النبیؐ ج۱، ص۱۲۱۔

اکرم ﷺ پر جو اعتراضات کیے وہ انھیں کم درجہ روایتوں کی وجہ سے پیدا ہوئے جنھیں مغربی مورخین کی ملمع سازی نے مزید رنگ دے دیا، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> "یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا کل سرسبد یہی روایتیں ہیں"۔(۱)

۷- علامہ شبلی نے مورخ کے لیے صحت واقعہ میں روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے کام لینا بھی ضروری قرار دیا ہے بلکہ اپنے تمام اصولِ تاریخ نویسی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں اس اصول کی جلوہ گری پوری طرح نظر آتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مختلف واقعات میں ارباب تاریخ و سیر سے ان کے اختلاف کی وجہ اکثر یہی اصول درایت ہی ہے۔ مثلاً غزوۂ خیبر کے ذکر میں کنانہ بن ابی الحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امنِ عام دیا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں، لیکن کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے، یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی"۔ سادہ طور پر روایت نقل کرنے کے بعد ان کا درایتی معیار ملاحظہ ہو:

> "کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے رحمت للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے، وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکّوں کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے"۔(۲)

یہ روایت متصل اور صحیح ہونے کے باوجود چونکہ درایت کے معیار سے ناقابلِ فہم ہے اس لیے علامہ شبلی نے اسے نظر انداز کر دیا۔

اس طرح حضور اکرم ﷺ پر وحی نازل ہونے کی تفصیل صحیح بخاری کی دو روایتوں میں مذکور ہے پہلی روایت باب بدء الوحی میں جس میں فرشتہ غیب کا نظر آنا، اس کو دیکھ کر

۱- سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۳۹۱۔ ۲- ایضاً ج ۱، ص ۳۴۴-۳۴۵۔

آپؐ کا خوفزدہ ہو جانا، حضرت خدیجہؓ کا آپؐ کو تسلی دینا اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانا مذکور ہے، لیکن دوسری روایت جو باب التعبیر میں ہے، ان تفصیلات کے علاوہ اس میں مندرجہ ذیل اضافہ ہے:

"چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرادیں دفعتاً حضرت جبرئیلؑ نظر آتے تھے اور کہتے تھے اے محمدؐ تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو، لیکن جب پھر وحی کچھ دن کے لیے رُک جاتی تھی تو پھر آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرادینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرئیلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں"۔

دوسری روایت کے اس اضافہ پر علامہ شبلی درایت کی رو سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں بمقام (بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے اس کی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں جس سے بحیرا راہب نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا، جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کرتا تھا جب کہ صحاح ستہ میں موجود ہے کہ نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپؐ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرادینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرئیلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا، حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سنی کہ میں خدا ہوں تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا"۔(۱)

۸- جیسا کہ نظریہ تاریخ کے ضمن میں ہم لکھ آئے ہیں علامہ شبلی نے واقعات کے

۱- سیرۃ النبیؐ ج۱، ص ۱۳۷-۱۳۸۔

اسباب و علل کی تلاش اور اس سے صحیح نتائج مستنبط کرنے کو ضروری قرار دیا ہے اور انھوں نے خود واقعات میں سبب اور مسبب کی تلاش کی ہے اور استنباط نتائج میں روایت و درایت، عقلِ سلیم اور دلائل و براہین سے کام لیا ہے۔ علامہ شبلیؒ کے ایک نئے ناقد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ان کی اس خصوصیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

"سب سے اہم اور قابلِ ذکر چیز واقعات سیرت کے بیان میں مورخانہ اسباب و علل کی تلاش ہے۔ مولانا نے اس طرف خاص توجہ دی ہے اور سیرۃ النبیؐ میں جابجا مستقل عنوانات قائم کرکے بعض اہم واقعات اور ان کے اسباب سے متعلق بہت عمدہ بحثیں کی ہیں، جن کی مثالیں عام کتب سیرت میں نہیں ملتیں"۔(۱)

مثلاً قریش کی مخالفت، قریش کے تحمل، اسلام کی اشاعت، تحویل قبلہ، مسلمانوں کی فتح، غزوات اور کثرت سرایا کے اسباب و علل وغیرہ۔

۹- سبب اور مسبب کی تلاش کے بعد استنباط نتائج میں مورخ کو عموماً قیاس و اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔ علامہ شبلیؒ کا خیال ہے کہ اصل واقعہ اور مستنبط نتیجہ کو الگ الگ بیان کرنا چاہیے۔ چنانچہ خود انھوں نے سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد نتائج قلمبند کیے ہیں، خصوصاً غزوات کی بحث میں یہ اصول صاف کارفرما ہے۔

۱۰- علامہ شبلیؒ نے مورخ کے لیے ایک نہایت سخت اصول مقرر کیا ہے کہ وہ جس واقعہ کو لکھے مورخ اس کے فن سے بخوبی واقف ہو، ورنہ اس کی نظر واقعہ پر سطحی پڑے گی اور واقعہ کی روح تک نہ پہنچ سکے گا۔ ظاہر ہے یہ ایک مشکل امر ہے مگر علامہ شبلیؒ اپنے اس مشکل اصول پر بھی کاربند نظر آتے ہیں، وہ ایک جامع العلوم والکمالات مصنف تھے، اسی وجہ سے ہر واقعہ کی تہ اور اس کی اصل روح تک ان کی دوررس نگاہ پہنچ جاتی ہے۔

۱۱- علامہ شبلیؒ کے اصول غیر جانبداری پر بھی سیرۃ النبیؐ پوری اترتی ہے، باوجودیکہ اس سے علامہ شبلیؒ کے عشقِ رسولؐ کا واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے مگر ایسا کہیں نہیں ہوا کہ حق و صداقت کو بالائے طاق رکھ کر محض اخلاق و عقیدت کا نذرانہ پیش کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر سید شاہ علی کا لکھنا کہ "شبلی اپنے مذہبی جذبہ پر پوری طرح قابو نہیں پاسکے اور عشقِ رسولؐ کے زیر اثر

۱- ترجمان الاسلام وارانسی جنوری تا مارچ ۱۹۹۴ء ص ۱۷۔

مذہبی اور اخلاقی سرگرمیوں کا شکار ہوگئے(۱) اور یہ کہ سیرۃ النبیؐ میں کہیں کہیں محبت و عقیدت مدلل مداحی کی شکل اختیار کر گئی ہے(۲)، بجا نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ شبلی نے مذہب اسلام کے مصنفات کے ساتھ توراۃ وانجیل اور صحف سماوی سے استدلال کیے ہیں اور ماقبل بعثت عرب کے جو حالات لکھے ہیں وہ اس کی تردید کے لیے کافی ہیں ڈاکٹر انور محمود کا نقطۂ نظر بھی لائق توجہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”جو مصنف کسی ایسے شخص کی سوانح عمری لکھ رہا ہو جو نہ صرف اس کا اپنا محبوب نظر ہو بلکہ کروڑوں انسانوں کی عقیدت کا مرکز ہو، اس کے حالات رقم کرتے وقت جوش و جذبہ کا مظاہرہ ہونا کوئی خلاف حقیقت بات نہیں ہے۔ پھر صاحبِ سوانح مذہبی شخصیت ہو تو اس کی سوانح سے مذہب کیسے خارج کیا جاسکے گا، دیکھنا صرف یہ ہے کہ عقیدت کے غلو میں کہیں سوانح نگار مذہبی اور اخلاقی جذبے سے مغلوب تو نہیں ہوگیا، سیرۃ النبیؐ پڑھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ ایسا نہیں ہوا“۔(۳)

۱۳- علامہ شبلی نے مورخ کو اس بات سے بھی آگاہ کیا ہے کہ اس کا منصب سادہ واقعہ نگاری ہے انشاپردازی نہیں کیونکہ تاریخ اور انشاپردازی کی حدیں جدا جدا ہیں، اس لیے مورخ کو تاریخ میں انشاپردازی کا جوہر نہیں دکھلانا چاہیے۔ چنانچہ خود انھوں نے سیرۃ النبیؐ میں سادہ واقعہ نگاری سے کام لیا ہے اور کہیں بھی مورخ شبلی پر انشاپرداز شبلی کا غلبہ نہیں ہوا ہے۔ یہاں اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں واضح طور پر جو ادبی رعنائی و گلکاری کا احساس ہوتا ہے وہ انشاپردازی نہیں بلکہ علامہ شبلی کے ادبی اسلوب کا خاصہ اور جوہر ہے جس سے وہ خود بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے اور نہ اس کی وجہ سے وہ کہیں تاریخی اصولوں سے منحرف ہوئے۔ غرض یہ کہ سیرۃ النبیؐ میں ان کی فطری انشاپردازی ہے، اس کا تعلق تصنع اور بناوٹ سے نہیں ہے اور سیرۃ النبی کا ہر صفحہ اس کا شاہد ہے اس کے سرنامہ اور ظہور قدسی پر تو الہام کا شبہ ہوتا ہے۔ یہاں چند دوسرے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ علامہ شبلی کی فطری انشاپردازی اور تاریخی دیانتداری کا اندازہ ہوسکے۔

۱- خطبۂ فتح مکہ کے بعد کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

۱- اردو میں فن سوانح نگاری ص ۲۰۰۔ ۲- ایضاً ص ۲۰۵۔ ۳- اردو نثر میں سیرت رسولؐ ص ۵۸۵۔

"خطبے کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سناں نے پیکرِ قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ "شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے، ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"۔(۱)

۳- ارباب سیر و مغازی کی داستان سے مورخین یورپ کی خاص دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیا عجیب بات ہے کہ اربابِ سیر و مغازی کی داستان جس قدر دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش و نگار کے لیے چند قطرے نہیں چشمہائے خوں درکار ہیں"۔(۲)

۴- تاریخ نگاری میں سند اور حوالہ کے بارے میں علامہ شبلی کا نقطہ نظر پیش کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے سند اور حوالہ، مراجع و مصادر کا سیرۃ النبیؐ میں خاص اہتمام کیا ہے اور کوئی واقعہ بغیر سند اور حوالہ کے نہیں لکھا ہے۔ قرآن

۱- سیرۃ النبیؐ ج۱، ص ۳۶۳۔ ۲- ایضاً ج۱، ص ۲۰۷۔

پاک کے علاوہ حدیث، تفسیر، اصول حدیث، طبقات و تراجم تاریخ اور سیر و مغازی کی سیکڑوں کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ دراصل علامہ شبلی اردو کے پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے حوالہ اور ماخذ و مراجع کی نشان دہی کی ابتداء کی، ان سے پہلے اس اصول کا اس قدر اہتمام کسی اور مورخ نے نہیں کیا، اردو میں علامہ شبلی اس اصول کے موجد تصور کیے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں اپنے تاریخی اصولوں کا ہر ممکن پاس و لحاظ رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ جملہ سیرت نگاروں میں سب سے زیادہ قد آور اور بلند پایہ تسلیم کیے گئے ہیں اور اختر وقار عظیم نے اسی بنا پر یہ لکھا ہے کہ "آج تک سیرۃ النبیؐ سے زیادہ محققانہ عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسولِ کریم ﷺ پر نہیں لکھی گئی"۔(۱)

تاریخی مقالات

علامہ شبلی نے تاریخی تصانیف کے علاوہ متعدد تاریخی مقالات بھی سپرد قلم کیے ہیں جو اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تراجم کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان کے بعض مقالات ان کی زندگی ہی میں رسائل شبلی اور مقالات شبلی کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے تمام مقالات و مضامین اور تحریروں کو آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے مقالات شبلی کے نام سے شائع کیا۔ دو جلدوں (پنجم و ششم) میں خاص تاریخی مقالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ مقالات مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں چند اہم تاریخی مقالات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

تراجم

یہ طویل اور قیمتی مقالہ ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک پر علامہ شبلی نے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی علم دوستی اور معارف پروری کی داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی کون کون سی زبانیں سیکھیں اور دنیا کی دوسری قوموں کے کون کون سے علوم و فنون کی کتابوں کے اپنی زبان میں ترجمے کیے اور اس میں کس قدر شغف و انہماک اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

۱۔ شبلی بحیثیت مورخ ص ۱۲۳۔

اس مقالہ میں یورپ کے مورخین کے اس الزام کی تردید بھی کی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں غیر قوموں کے علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور ان کے آثار کو برباد کر دیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسروں کے علمی خزانوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی اس کے لیے دارالترجمے قائم کیے، فارسی، سریانی، سنسکرت، یونانی، لاطینی زبان کے ماہر مترجمین کا انتظام کیا اور مختلف علوم وفنون مثلاً فلسفہ یونان، ہیئت، جبر ومقابلہ، حساب، علم آلات، جغرافیہ، طب، جیومیٹری وغیرہ مختلف علوم وفنون کی اکثر اہم کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ اس کے بعد انھوں نے مترجمین اور ان کی مترجمہ کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے اور ان علوم وفنون سے مسلمانوں کی گہری دلچسپی کے واقعات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ:

> "عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا اور اگر مسلمانوں کا دنیا میں قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، فارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے ہوتے"۔(۱)

علامہ شبلی کی پہلی تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا ذکر گذر چکا ہے اس مضمون کو اس کا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتب خانہ اسکندریہ

اسلام اور مسلمانوں پر مورخین یورپ کے من گھڑت اور بے سروپا الزامات میں یہ الزام سب سے زیادہ بلند بانگ اور مشہور ہوا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے مصر واسکندریہ فتح کیا تو انھوں نے وہاں کے قدیم اور مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے قائم تھا اور صدیوں کا علمی خزانہ تھا جلا کر خاک کر دیا اور اس طرح دنیا کو ایک عظیم علمی میراث سے محروم کر دیا۔ اس کی آڑ میں دراصل یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام اور مسلمان علم کے دشمن ہیں۔ اس مفروضہ کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ اسے تاریخ کے مسلمات میں شمار کیا جانے لگا۔

اس بے سروپا الزام کے جواب میں علامہ شبلی نے مورخانہ قلم اٹھا کر بدلائل ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے تباہ وبرباد کر دیا تھا اور اس کی تباہی وبربادی میں عیسائیوں کے بڑے بڑے

۱۔ مقالات شبلی ج ۶، ص ۱۔

مذہبی پیشوا بھی شریک تھے۔ مسلمانوں نے جب مصر و اسکندریہ فتح کیا تو اس کتب خانہ کا وہاں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔

علامہ شبلی کا یہ مقالہ اتنا جامع مدلل اور محققانہ تھا کہ ساری علمی و تحقیقی دنیا میں ہلچل مچ گئی اس بیش قیمت تحریر نے مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا کر دیا اور مورخین یورپ کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں پر واقعتاً یہ سراسر غلط الزام تھا اور اس افتراء کا موجد چھٹی صدی عیسوی کا عیسائی مورخ ابوالفرج ملتی تھا، اسی کو کہتے ہیں

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

علامہ شبلی نے اس غلط اور بے بنیاد الزام کی تردید میں تاریخ اور اصول تاریخ سے نہایت دیانتداری سے کام لیا اور اصل واقعہ کی چھان بین میں اپنے وضع کردہ اصولوں سے غیر جانبداری کے ساتھ کام لیا۔

یہ مقالہ بہت مقبول ہوا اور کتابی صورت میں متعدد بار شائع ہوا دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے جن۔ اب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ مقالہ ۱۸۹۲ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا مگر آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلامی کتب خانے

اس میں علامہ شبلی نے کتب خانوں کی اجمالی تاریخ لکھی ہے اور عہد اسلامی کے بیشتر کتب خانوں کا تعارف ان کے انتظام اور ان کا طریقہ کار لکھا ہے اور کتب خانوں کی اہم کتابوں کا ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں جس کثرت سے کتبخانے قائم تھے اس کی نظیر کہیں اور ملنی مشکل ہے۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی نے خاص طور سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی یادگاروں کو محفوظ رکھنے اور ان کے حالات و واقعات لکھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جو ان کی رواداری اور وسیع النظری کا ثبوت ہے۔

یہ مقالہ اگرچہ تاریخ کے ایک پہلو پر مشتمل ہے تاہم علامہ شبلی نے نہایت تحقیق و تدقیق اور مورخانہ تلاش و تفحص کے ساتھ اصول تاریخ کا بھرپور خیال رکھا ہے اور کہیں اپنے تاریخی نظریہ سے انحراف نہیں کیا ہے۔

یہ تاریخی مقالہ ۱۸۹۲ء میں حیدر آباد دکن کے مشہور رسالہ "حسن" میں شائع ہوا تھا اور رسالہ کے دستور کے مطابق اس زمانہ میں علامہ شبلی کو اس پر ایک اشرفی انعام میں ملی تھی۔

اسلامی حکومتیں اور شفاخانے

اس میں عہد اسلامی کے شفاخانوں کی اجمالی تاریخ قلمبند کی ہے۔ علامہ شبلی جب علی گڑھ کالج میگزین کے ایڈیٹر بنائے گئے تو انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق متعدد عنوانات کے تحت تحقیقی و تاریخی مضامین لکھے جائیں تاکہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ کی ایک جھلک مرتب شکل میں سامنے آجائے، یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے(۱)۔ اس میں صرف پبلک ورکس کے ایک خاص پہلو شفاخانوں کے متعلق لکھا گیا ہے۔ تاریخ میں بکھرے ہوئے اس مواد کو اکٹھا کر کے عہد اسلامی کے شفاخانوں کا مرقع تیار کیا گیا اور ثابت کیا گیا ہے کہ عہد اسلامی عوامی اور رفاہی کاموں اور انسانی ہمدردی کے کاموں میں کسی سے کبھی پیچھے نہیں رہا۔ بعض شفاخانوں کے انتظام و انصرام سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے شفاخانوں سے وہ کسی طرح کم نہ تھے اور حکومت کے ذمہ داران کی پوری دیکھ بھال کرتے تھے۔

علامہ شبلی کا یہ قیمتی مقالہ علیگڑھ میگزین میں جولائی ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا اور اپنے انفرادی موضوع کی وجہ سے بڑا مقبول ہوا۔ اس مقالہ میں بھی علامہ شبلی کا نظریہ تاریخ اپنے معیار پر قائم ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے ان تہذیبی و تمدنی ترقیوں کا ذکر کیا ہے جو مغل حکمرانوں کی کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں ہوئیں۔ مقالے کا آغاز عہد مغلیہ سے قبل کے ہندوستان کے تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال سے کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بابر سے عہد عالمگیر تک ہندوستانی تہذیب و تمدن میں جو تبدیلی اور ترقی ہوئی ان کی نشاندہی کی گئی ہے اور ضروریات زندگی مثلاً زمین کی پیداوار، زمینوں کی پیمائش، آراضی کا بندوبست، صنعت اور مصنوعات، ترقی حیوانات اور ان کی افزائش، عمارات اور شاہراہ، رہن

۱۔ مقالات شبلی ج۶، ص۱۷۷۔

سہن، لباس، تعمیرات اور دیگر ایجادات و اختراعات میں جو تبدیلی و ترقی ہوئی اس کی تمام تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اس کے لیے تزک بابری، تزک جہانگیری، آئینِ اکبری اور مآثرالامراء جیسے مستند و معتبر مآخذ کو مرجع بنایا گیا ہے۔

الجزیہ (۱)

مغربی مورخین نے اسلام، بانیٔ اسلام، اسلامی تہذیب و تمدن، شریعت اور تاریخ اسلامی پر جو الزامات عائد کیے ہیں ان میں سب سے اہم جزیہ سے متعلق الزام ہے۔ جزیہ ایک خراج ہے جو اسلامی حکومت و سلطنت میں غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت کے عوض لیا جاتا ہے۔ یورپ کے مورخین نے جزیہ کے ذریعہ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ اسلام کی بھی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی۔ جزیہ کو ایک ظالمانہ اور توہین آمیز ٹیکس قرار دیا اور تشہیر کی کہ جزیہ کا موجد اسلام ہے اور مسلمان حکمراں اسے اپنی رعایا سے جبراً وصول کرتے ہیں اور یہ غیر قوموں کو مسلمان بنانے کا ایک قوی حربہ ہے۔

مورخین یورپ نے ہندوستان کی مسلم تاریخ پر خاص طور سے اس موضوع پر اس لیے توجہ دی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے برگشتہ کیا جائے، علامہ شبلی نے ان بے سروپا الزامات کے ردّ و ابطال میں یہ قیمتی مقالہ ۱۸۸۹ء میں سپرد قلم کیا اور ان اعتراضات کی پُرزور تردید کی۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی نے تین باتوں کا جائزہ اس طرح لیا ہے کہ ان کے ضمن میں سارے الزامات کی تردید ہو جاتی ہے:

> "جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب قائم ہوئی اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا"۔

چنانچہ علامہ شبلی نے ان سوالات کا مورخانہ اور تحقیقی جائزہ لینے کے بعد ثابت کیا ہے جزیہ فارسی لفظ گزیہ کا معرب ہے جس کے معنی خراج کے ہیں اور اس کا موجد اسلام نہیں بلکہ اسلام سے بہت پہلے نوشیرواں تھا۔ اس نے یہ خراج اس لیے مقرر کیا تھا کہ فوجی اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر ملک اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں یہ خراج ان کی محنتوں کا معاوضہ ہوگا۔

۱۔ مقالات شبلی ج۶، ص۲۲۱-۲۳۱

مسلمانوں نے جب غیر مسلموں کے علاقے فتح کیے تو انھوں نے نوشیر واں کے اس خراج کو معمولی تبدیلی کے ساتھ باقی رکھا۔ کیونکہ اسلامی حکومت میں ہر مسلمان فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جاتا ہے لیکن غیر مسلم اس کے لیے مجبور نہیں کیے جا سکتے۔ چونکہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کے ذمہ ہوتی ہے اس لیے ان سے ان کی حفاظت کا معاوضہ جزیہ کے نام سے لیا جاتا ہے گویا یہ ان کے تحفظ و بقا کا معاوضہ ہے۔

علامہ شبلی نے تاریخی حوالوں سے بھی ثابت کیا ہے کہ اگر کبھی غیر مسلم رعایا نے فوجی خدمت انجام دی تو ان سے جزیہ نہیں لیا گیا یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم نے کسی سال فوجی خدمت میں حصہ لیا تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا گیا۔

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے جزیہ کی مقدار پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بیس روپے سالانہ تھی۔ کسی کے پاس لاکھ روپے ہوں تو بھی اس سے زیادہ نہیں دینا پڑتا تھا جزیہ کہ عام شرح چھ روپے اور تین روپے سالانہ تھی، ۲۰ برس سے کم اور پچاس سے زیادہ عمر والوں کو جزیہ معاف تھا اس طرح عورتوں، مفلوجوں، معطل العضو، نابینا اور مجنوں پر کوئی خراج نہیں تھا مفلسوں یعنی جس کے پاس سو درہم سے کم ہو ان سے عموماً جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ (۱)

غرض علامہ شبلی نے اپنی اس نادر اور انتہائی بیش قیمت تحقیق سے یورپ کے مورخین کے الزامات کی قلعی کھول دی۔ یہ مضمون بہت مقبول ہوا سر سید احمد خاں نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا خود علامہ شبلی نے اسے عربی کا جامہ پہنایا، مصر کے مشہور اخبار و رسائل نے اس کے خلاصے اور اقتباسات شائع کیے۔

حقوق الذمیین (۲)

یورپ کے مورخین کے الزامات کی فہرست میں یہ فرد جرم بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ ہر طرح کی ظلم و زیادتی کو روا رکھا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ اسلام میں غیر مسلموں کے لیے کوئی اصول و ضابطہ اور قانون نہیں اس لیے یہ مظالم روا رکھے گئے۔ علامہ شبلی کے زمانہ میں اس اعتراض کی لے تیز تر ہو گئی تھی اور بار بار اس طرح کے الزامات کا اعادہ کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں لنڈن ٹائمز (۲ر جنوری

۱۔ مقالات شبلی ج ۶، ص ۲۳۱۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۸۵-۲۲۰۔

۱۸۹۵ء) میں پادری ملکم مال نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا جس میں بڑے طمطراق سے یہ ظاہر کیا کہ اسلام میں عیسائیوں کے لیے نہایت ظالمانہ قوانین ہیں اور مسلمان حکمراں ہمیشہ اسی پر عمل کرتے رہے۔ دلی کی عیسائی مشنری نے اس مضمون کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا اور اس کے دیباچہ میں لکھا کہ یہ مضمون اس قدر مدلل ہے کہ ٹائمز کا مسلمان مضمون نگار بھی اس کا جواب نہ دے سکا(۱)۔ علامہ شبلی کا خیال تھا کہ ''ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتم بالشان اور وسیع ہے کہ اگر اس کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا(۲)۔ چنانچہ انھوں نے اسی طلسم کو توڑنے کے لیے یہ مدلل مضمون سپرد قلم کیا اور ان اعتراضات کی پُرزور تردید کی اور نہایت مدلل انداز میں ثابت کیا کہ جزیہ کے ذریعہ خود آنحضرت ﷺ نے انھیں بے شمار حقوق واختیارات عطا کیے تھے۔ مثلاً اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی مدافعت کی جائے گی ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا ان کی جان ومال زمین اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی ان کے قافلے اور کاروان تجارت بھی محفوظ رہیں گے ان کی تمام چیزیں انھیں کے قبضے میں رہیں گی پادری، راہب اور گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں پر باقی رہیں گے اور انھیں برطرف نہیں کیا جائے گا، صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا ان سے عُشر لیا جائے گا نہ ان کے ملکوں میں فوج بھیجی جائے گی ان کا مذہب اور عقیدہ بھی نہ بدلوایا جائے گا یہ حقوق ان لوگوں کو بھی حاصل ہوں گے جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔

علامہ شبلی نے اس مقالہ میں بتایا ہے کہ مذکورہ بالا حقوق ذمیوں کو کم و بیش ہر دور میں حاصل رہے۔ خلفائے راشدین سے لے عہد شاہجہاں تک کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ذمیوں کو جو حقوق ملے ان کی مختصر تفصیل بھی علامہ شبلی نے اس میں پیش کی ہے اور بہت سے تاریخی واقعات سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ذمیوں کا اپنے دور حکومت میں پورا پورا خیال رکھا انھیں بڑے بڑے مناصب عطا کیے اور انھیں مذہب و عقیدہ کی بنیاد پر کبھی شرمسار نہیں ہونا پڑا۔

علامہ شبلی کا یہ گرانمایہ مقالہ علی گڑھ میگزین مارچ اپریل ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا اور بڑے شوق سے پڑھا گیا بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

۱- مقالات شبلی ص۱۸۶۔ ۲- ایضاً۔

ہمایوں نامہ (۱)

اس مضمون میں ہمایوں نامہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کی تصنیف ہے، گلبدن بیگم شہنشاہ بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپھی تھی یہ کتاب اکبر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اس میں ہمایوں کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی انگریز مصنفہ مس بیورج نے کئی سال کی تلاش و تفحص اور محنت و تدقیق سے مرتب کر کے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔ علامہ شبلی نے ہمایوں نامہ کے اسی نسخہ کا تعارف کرایا ہے اور اس کے لیے مصنفہ کی تعریف کی ہے۔

ہمایوں نامہ کے مشمولات کے حوالہ سے علامہ شبلی نے گلبدن بیگم کی مورخانہ صلاحیت اور سلیقہ تحریر و تصنیف کی بڑی تعریف کی ہے اور دکھایا ہے کہ گلبدن بیگم تاریخ نویسی کے تمام اصول و آداب سے بخوبی واقف تھی۔ چنانچہ اس نے جہاں سیاسی واقعات لکھے ہیں وہیں عہد ہمایوں کی تہذیبی و تمدنی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اس کی تحریر مورخانہ انشاء پردازی اور سادہ واقعہ نگاری کا نمونہ ہے۔ واقعات لکھنے میں پوری دیانتداری سے کام لیا ہے اور جو واقعات دوسروں سے سنے ہوئے لکھے ہیں ان کا حوالہ بھی دیا ہے جس سے اس کی مورخانہ ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمایوں نامہ کے تعارف کا مقصد بھی غالباً تاریخ ہند کے اہم مآخذ و مراجع کی نشاندہی اور تاریخ کے ذوق کو عام کرنا معلوم ہوتا ہے۔

مآثر رحیمی (۲)

اس مقالہ میں مآثر رحیمی جیسی معرکۃ الآرا کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے ہزار صفحات میں عہد اکبری کے علماء و فضلاء، ادباء و شعراء اور اہل علم کے حالات و واقعات ہیں۔ آخری ہزار صفحات میں اکبر کے سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں کی زندگی کے تمام حالات و سوانح قلمبند کیے گئے ہیں جس میں اس کی پیدائش، وطن، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات، فضل و کمال، شاعری و انشاپردازی کے علاوہ اس کے علمی ذوق، کتب خانہ، اہل علم کی قدر دانی، علم پروری، ادب نوازی وغیرہ کی تفصیلات ہیں

۱- مقالات شبلی، ص ۵۴-۶۵۔ ۲- ایضاً ج ۴ ص ۶۶-۸۱۔

اس مبسوط کتاب میں خان خاناں کے رفاہی و عوامی کاموں کا ذکر ہے۔ صنعت و زراعت، تعمیرات مثلاً باغ، حمام اور سرائیں تعمیر کرانے کا ذکر ہے نیز ایجادات و اختراعات مثلاً جہازوں کی تیاری اور ابری و عکسی کاغذات کے بنانے کا ذکر بھی ہے۔

یہ کتاب عہد اکبری کی تاریخ کا ایک معتبر مآخذ تصور کی جاتی ہے اس کے مصنف کا نام عبد الباقی ہے وہ ایران کا باشندہ اور ایک معزز خاندان کا فرد تھا۔

اس مضمون کا مقصد بھی تاریخی مآخذ کی نشاندہی اور ذوق تاریخ کو عام کرنا معلوم ہوتا ہے۔

مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ "اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں نکتہ چینی کا نام نہیں" مگر پھر اس کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ "یہ اس دور کا عام مذاق تھا"۔

جہانگیر اور تزک جہانگیری (۱)

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے جہانگیر پر مورخین یورپ اور ان کے مقلدوں کے عائد کردہ الزامات کا جائزہ تزک جہانگیری کے حوالہ سے لیا ہے۔ تزک جہانگیری جہانگیر کا روزنامچہ ہے اور اسی کے قلم سے ہے۔ شروع میں اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے اپنے تمام صحیح اور سچے واقعات لکھے ہیں تصنع بناوٹ اور ملمع سازی سے احتراز کیا ہے خوبیاں اور خامیاں دونوں کو ڈنکے کی چوٹ پر لکھا ہے اور کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی ہے اور ہر واقعہ کو انتہائی سادگی صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا ہے۔ جہانگیر کے حالات و واقعات بلکہ اس کے ہر قسم کے خیالات کو معلوم کرنے کا سب سے معتبر ماخذ یہی کتاب ہے۔ علامہ شبلی نے تزک جہانگیری سے جہانگیر کے حالات و واقعات مثلاً سلطنت کا کاموں سے دلچسپی، عدل و انصاف، رعایا کی دادرسی اور اس کی توجہ و خبر گیری، حکومت کی پالیسی، ہندوؤں سے تعلقات اور ان کے ساتھ حسن سلوک، علماء و فضلاء اور اہل علم کی بلا امتیاز مذہب و عقیدہ قدردانی وغیرہ کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ساتھ ہی اس کی علم دوستی معارف پروری اور اس کی ذاتی دلچسپی مثلاً علم الحیوان سے خصوصی شغف، مصوری سے لگاؤ جغرافیائی تحقیق، صناعی و صنعت گری، مذاق سپہ گری اور شجاعت و بہادری وغیرہ کے

۱- مقالات شبلی ج ۴ ص ۸۲-۱۱۴

واقعات کو بترتیب لکھا ہے اور پھر مورخین یورپ اور ان کے مقلدین کو باور کرایا ہے کہ جہانگیر بڑی خوبیوں کا مالک اور اسلاف کا نمونہ تھا اور اس پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں وہ بالکل لغو، بے سروپا اور کذب وافتراء کا نمونہ ہیں۔

اس کتاب کے تعارف کا مقصد بھی تاریخی ذوق کو عام کرنا تھا۔

مورخانہ شاعری

علامہ شبلی نے اردو نثر کے ساتھ اردو اشعار میں تاریخ نگاری کے فرائض انجام دیئے جو اصلاً ان کے مورخانہ ذہن ومزاج کی شاندار جلوہ گری ہے اور یہ خوبی ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار میں بھی تاریخی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے اختر وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "تاریخ نویسی کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر بات سیدھے سادے انداز میں بلا کسی لگی لپٹی کے کہہ دی جائے شاعر کو اس کی شاعرانہ تعلیاں مورخ کے منصب سے دور لے جاتی ہیں لیکن شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا جیسے وہ ایک واقعہ کو نثر میں بیان کرتے ہیں ویسے ہی پوری دیانتداری سے نظم بھی کر لیتے ہیں"۔(۱)

غرض یہ کہ علامہ شبلی اردو نثر میں تاریخ نگاری کے جس طرح بانی تصور کیے جاتے ہیں اسی طرح وہ اردو شاعری میں بھی تاریخ نگاری کے موجد ہیں۔

یہ مورخ شبلی کی شخصیت کے ایک پہلو کا تفصیلی جائزہ ہے ورنہ علامہ شبلی کی ہشت پہلو شخصیت کے کارناموں کے مفصل ذکر کے لیے ایک دفتر بے پایاں چاہیے۔ شیخ محمد اکرام نے سچ لکھا ہے کہ "قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ کسی معجزے سے کم نہیں"۔(۲)

۱- شبلی بحیثیت مورخ ص ۱۳۶۔ ۲- موج کوثر ص ۲۳۴۔

باب سوم

مولانا سید سلیمان ندوی کے تاریخی کارنامے

مولانا سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے لائق شاگرد، صحیح جانشین اور اردو زبان کے مایہ ناز مورخ تھے۔ تاریخی ذوق انھیں اپنے استاد علامہ شبلی سے ورثے میں ملا تھا انھوں نے اپنی محنت و کاوش، مطالعہ و تحقیق، دقت نظر اور فکر و تدبر سے اس میں مزید جلا پیدا کی۔

دراصل سید صاحب کی شخصیت مجموعہ کمالات تھی وہ ادیب و انشاپرداز، شاعر، مفسر، محدث، متکلم، سوانح نگار، مورخ، محقق، نقاد اور ماہر تعلیم تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سیرت نگار رسول اعظمؐ تھے۔ ان تمام موضوعات پر انھیں مجتہدانہ قدرت و مہارت حاصل تھی، اسی جامعیت اور علمی تبحر کی بنیاد پر علامہ اقبال نے ان کو استاذ الکل اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا تھا۔(۱)

انھیں فن تاریخ سے خصوصی لگاؤ تھا ان کا خیال تھا کہ ہر قوم کی تاریخ اس کی روح ہوتی ہے(۲)، ان کی بیشتر تصانیف میں یہی احساس کار فرما نظر آتا ہے۔

انھوں نے متعدد تصنیفات اور سیکڑوں تاریخی مقالات سپرد قلم کیے۔ تاریخ ہند کی تدوین کا منصوبہ بھی ان کے پیش نظر تھا، اپنی تحریروں میں وہ اکثر غلط تاریخ نویسی پر تنبیہ و تنقید کرتے رہے، مورخوں کو مفید اور قیمتی مشورے دیئے۔ تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے تعلق سے جب بھی مستشرقین اور ان کے ہمنوا مورخین نے غلط بیانی کی یا بے جا اعتراضات کیے تو ان کی تاریخی حسیت نے ان کو ردّ و ابطال کے لیے فوراً آمادہ کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے متعدد پہلوؤں کو انھوں نے تاریخ کی مدد سے روشن کیا یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا سید سلیمان ندوی ۲۲ر دسمبر ۱۸۸۴ء میں بہار کی مردم خیز سرزمین دیسنہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر سید مقصود علی صاحب اور اپنے بڑے بھائی سید ابو حبیب صاحب

۱- مولانا ضیاء الدین اصلاحی مشاہیر کے خطوط ص ۹۸، اقبال نامہ ص ۷۱، ۱۹۶۔ ۲- معارف شذرات جولائی ۱۹۳۶ء

سے حاصل کی۔ پھلواری شریف اور مدرسہ امدادیہ در بھنگہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے ۱۹۰۸ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ندوہ ہی میں عربی ادب کے استاذ مقرر ہوئے۔

علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے انھوں نے جوہر قابل سمجھ کر سید صاحب کی خصوصی تربیت کی اور تصنیف و تالیف کے سلیقہ اور ملکہ پر خاص توجہ دے کر ۱۹۰۷ء میں ماہنامہ الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا اور یہیں سید صاحب کی علمی زندگی کا آفتاب تابناک روشن ہونا شروع ہوا۔ انھوں نے اس رسالہ میں متعدد محققانہ تاریخی مضامین لکھے ان میں علم ہیئت اور مسلمان، عربی زبان کی وسعت (۱۹۰۷ء) ابن خلکان، جرجی زیدان کی تمدن اسلامی پر تنقید (۱۹۰۸ء) اسلامی رصد خانے، علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق (۱۹۰۹ء) اور کتب خانہ اسکندریہ (۱۹۱۰ء) وغیرہ نے اہل نظر کی توجہ اور داد حاصل کی۔

انھوں نے اسی زمانہ میں دروس الادب لکھی اور جدید عربی الفاظ کی لغت بھی لغات جدیدہ کے نام سے مرتب کیا جو بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی جدید عربی الفاظ کی پہلی ڈکشنری ہے۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے ندوہ میں شعبہ تصحیح اغلاط تاریخی قائم کیا جس کا مقصد تاریخ کی نصابی کتابوں میں ایسے واقعات کی اصلاح و تصحیح تھی جن میں مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے متعلق انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں کو قصداً شامل کیا گیا تھا جن کو پڑھ کر مسلمان طلبہ شرم و ندامت سے سر جھکا لیتے یا ان سے متاثر ہو کر گمراہ ہو رہے تھے۔ علامہ شبلی نے سید صاحب کو اس شعبہ کا سکریٹری بنایا چنانچہ سید صاحب نے نہایت دلچسپی سے اس کام کو انجام دیا۔ مختلف یونیورسٹیوں اور اسکولوں کے مسلمان اساتذہ سے اس کے بارے میں خط و کتابت کی۔ اخبارات میں مضامین لکھے اس سلسلہ میں ان کو تعاون بھی حاصل ہوا بعض حضرات نے قابل اعتراض کتابوں کے نام اور ان کے قابل اعتراض مقامات کی نشاندہی بھی کی۔

ابھی یہ کام اپنے دور آغاز میں ہی تھا کہ اسی خاکہ پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اغلاط تاریخی کے ایک منصوبہ کا اعلان کر دیا۔ چونکہ یہ ایک قومی کام تھا اور اشتراک و تعاون سے زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دیا جا سکتا تھا اس لیے سید صاحب نے باہمی تعاون سے اس کو انجام دینے کی کوشش کی۔ مگر کانفرنس کے ذمہ داروں نے اس کا حوصلہ افزاء جواب نہ دیا چنانچہ یہ کام شایان شان طریقہ سے ندوہ اور علی گڑھ دونوں جگہ انجام نہ دیا جا سکا۔

بہر حال سید صاحب نے اس موضوع پر جس شغف وانہماک سے کام کیا اس سے تاریخ سے ان کی دلچسپی اوران کے مورخانہ ذوق وشوق کا اندازہ ہوتا ہے۔یہی وہ زمانہ ہے جس میں علامہ شبلی نے سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کے عظیم الشان منصوبہ کا آغاز کیا اور سید صاحب کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔سید صاحب نے اپنی محنت و مطالعہ سے اس انتخاب کو جس طرح صحیح ثابت کیا اس کا اندازہ علامہ شبلی کے اس خیال سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اگر سیرت پوری نہ کر سکے تو سید سلیمان کر دیں گے۔

۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کی مخالفت کا طوفان برپا کیا گیا جس کے نتیجہ میں انھوں نے ندوہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔چنانچہ سید صاحب نے بھی لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر کلکتہ کا رُخ کیا اور الہلال سے وابستہ ہوگئے۔الہلال میں انھوں نے متعدد عمدہ مضامین سپرد قلم کیے،الہلال سے وابستگی کا یہ مختصر دور اس وقت ختم ہوا جب وہ پروفیسر عبدالقادر کی کوششوں سے دکن کالج پونا میں عربی وفارسی کے پروفیسر ہوگئے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں جب علامہ شبلی کا دم واپسیں بر سر راہ تھا تو انھوں نے تار دے کر سید صاحب کو بلوایا سید صاحب جب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو محبوب استاذ ومربی جانکنی کے عالم میں تھے اسی حالت میں تکمیل سیرت کی وصیت کی۔ علامہ شبلی کی وفات (۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء) کے بعد مولانا حمید الدین فراہی اور سید صاحب نے مجلس اخوان الصفا بنائی جس کا مقصد علامہ شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل تھا،سید صاحب اس مجلس کے ناظم مقرر ہوئے۔ چنانچہ وہ دکن کالج پونا کی پروفیسری چھوڑ کر استاذ مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے اعظم گڑھ آگئے یہاں انھوں نے سیرت نبویؐ کی تکمیل کی اور دارالمصنفین کے تخیل کو اس شان سے شرمندہ تعبیر کیا کہ وہ علامہ شبلی کے تخیل سے بھی بہت آگے بڑھ گیا۔

سید صاحب دارالمصنفین سے ۳۲ سال وابستہ رہے یہاں دو درجن سے زاید علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی کتابیں سپرد قلم کیں،اپنے رفقاء اور علامہ شبلی کے تلامذہ کو جمع کیا اور تصنیف و تالیف کی بے مثال تربیت گاہ قائم کردی جہاں خاص طور سے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب اور ان کے علوم وفنون کی متعدد گرانمایہ تحقیقی و تاریخی کتابیں طبع واشاعت سے ہم کنار ہوئیں۔ان کے زمانہ نظامت میں سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں،اس طرح سید صاحب نے اپنی مسلسل محنت اور پیہم کوششوں سے دارالمصنفین کو ملک بلکہ عالم اسلام کا سب سے مؤقر

علمی اور تصنیفی ادارہ بنادیا جس نے مسلمانوں کی علمی تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین کے ساتھ تاریخ نویسی کا لائق تقلید بلند معیار نمونہ بھی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

انھوں نے ۱۹۱۶ء میں علامہ شبلی کی خواہش کے مطابق دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف جاری کیا جس کے متعدد مقاصد میں ایک یہ بھی تھا کہ اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی تاریخ مرتب کی جائے اور اسے جدید اسلوب و انداز کے مطابق پیش کیا جائے(۱)۔ چنانچہ سید صاحب نے معارف میں خود بھی تاریخ اسلام اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے علمی و تمدنی اور تہذیبی پہلوؤں پر مقالات لکھے، مستشرقین اور ان کے ہمنوا مورخوں کی دروغ بیانیوں کی تردید کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے رفقاء کے علاوہ ملک کے دوسرے اہل علم و قلم کے بھی تحقیقی کارناموں کو شائع کیا۔

معارف کا فیضان آج بھی اپنی قدیم روایات کے ساتھ جاری ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی جو حیثیت اس رسالہ نے روز اول سے پالی تھی آج بھی وہ اسی پر قائم ہے۔ اس نے اوروں سے قطع نظر صرف مسلمانوں کے متعلق جو تحقیقی سرمایہ پیش کیا ہے اگر اسے جمع کر دیا جائے تو سیکڑوں معرکۃ الآرا کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ تاریخ اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی تاریخ کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو معارف کے ذریعہ اجاگر نہ کیا گیا ہو۔ اس کا اندازہ معارف کے اشاریہ سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس میں اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی تاریخ سے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں پچاسوں صفحات میں صرف ان کے عناوین درج ہیں۔

۱۹۴۶ء میں سید صاحب نے نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کی دعوت پر بھوپال کے دارالقضا اور عربی مدارس کی سربراہی قبول فرمائی جہاں وہ ۱۹۴۹ء تک چار برس رہے۔ اس زمانہ میں بھی دارالمصنفین سے ان کا قلبی و عملی تعلق باقی رہا اور اس کی نظامت بھی انھیں کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۹۴۹ء میں سید صاحب پاکستان چلے گئے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی وہاں وہ متعدد علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کے ممبر اور اسلامی بورڈ کے صدر بنائے گئے۔ چار سال بعد ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء میں علم و فن کے اس عاشق و شیدائی نے وفات پائی اور کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۱۔ معارف جولائی ۱۹۱۶ء، شذرات۔

تصانیف

سید صاحب مدۃ العمر تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق میں مصروف رہے اور تقریباً دو درجن کتابیں یادگار چھوڑیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) سیرۃ النبیؐ سوم تا ہفتم (پانچ جلدیں) (۲) ارض القرآن اول و دوم (دو جلدیں) (۳) سیرت عائشہؓ (۴) خیام (۵) عرب و ہند کے تعلقات (۶) عربوں کی جہاز رانی (۷) خطبات مدراس (۸) حیات مالک (۹) رحمت عالم (۱۰) لغات جدیدہ (۱۱) دروس الادب (۲ حصہ) (۱۲) بہادر خواتین اسلام (۱۳) رسالہ اہل السنّت والجماعت (۱۴) خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام (۱۵) برید فرنگ (۱۶) نقوش سلیمانی (۱۷) حیات شبلی (۱۸) ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں (۱۹) یادِ رفتگاں (۲۰) سفر نامہ افغانستان وغیرہ۔

مقالات

ان کتابوں کے علاوہ علم، ادب، تحقیق، تنقید اور تاریخ کے موضوع پر سیکڑوں مقالات بھی سپرد قلم کیے جو معارف کے علاوہ ملک کے دوسرے اہم علمی رسائل کے صفحات میں منتشر و محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض اہم علمی و تاریخی مقالات کو تین جلدوں میں مرتب کرکے مقالات سلیمان کے نام سے دار المصنفین نے شائع کیا ہے۔

منصوبہ تاریخ ہند اور بزم تاریخ

اپنی استعماری حکومت کو نعمت عظمیٰ اور رحمت الٰہی ثابت کرنے کے لیے انگریز مورخوں نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو خاص طور پر ظالم و جابر ثابت کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس مقصد سے ان کے ظلم و جبر کے فرضی قصے اور افسانے گڑھ کر انھیں ہندو کش، بت شکن اور ظالم و ستمگر ثابت کیا۔ خاص طور سے ان کی بُت شکنی کے فرضی واقعات لکھے تاکہ عام ہندوستانیوں کے دلوں میں ان مسلمان حکمرانوں کے لیے نفرت کے جذبات پیدا ہوں اور ردّ عمل میں وہ برٹش راج کو رحمت الٰہی تصور کرنے لگیں اور باہم دست و گریباں ہو جائیں اور متحد ہو کر کبھی ان کے خلاف صف آرا نہ ہو سکیں۔

اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے مروجہ نصاب تعلیم میں خاص طور پر تاریخ کی

تعلیم کو شامل کیا اور نصابی کتابوں میں اپنی مسخ و باطل تاریخ کے نمونے شامل کردیئے جن کو پڑھ کر مسلمان طلبہ شرم و ندامت سے سر جھکا لیتے تھے اور ہندو طلبہ میں مسلمان حکمرانوں کے تئیں نفرت کے جذبات پروان چڑھتے تھے، سید صاحب کی دوربین نگاہوں نے اس کے نقصانات و مضمرات کا اندازہ کرلیا چنانچہ انھوں نے معارف میں لکھا کہ:

> "سرکاری مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم کا اضافہ بظاہر علم کے اضافہ کے لیے ہے مگر درحقیقت جیسا کہ معارف میں بار بار کہا گیا ہے یہ اقوام ہند کے قدیم اختلافات و نزاعات کے اضافہ کے لیے کیا گیا ہے... حالانکہ ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہیے آج اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کیے اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کیے سوراج کی منزل میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا کیا ہمارے ہم وطن اس نکتہ کو سمجھیں گے... ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی ہی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ان دونوں قوموں کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو اور اس کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے ان دونوں قوموں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پیدا ہوں"۔(۱)

انگریز مورخوں کی ہمنوائی میں بعض ہندو مورخوں مثلاً جدوناتھ سرکار وغیرہ نے بھی قلم اٹھایا اور انگریز مورخوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو مزید رنگ و روغن کے ساتھ پیش کیا تو سید صاحب نے معارف میں ان کی بھی تردید کی اور صحیح تاریخ نویسی کی طرف متوجہ کیا اور انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریز مورخوں نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر تاریخ میں دانستہ خیانت کی ہے اسے ہوا دینے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کی آگ اور پھیلے گی اور وہ متحد ہوکر آزادی وطن کی کامیاب جدوجہد نہ کرسکیں گے۔

ایک مسلمان مورخ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے بھی انگریز مورخوں کے نقطہ نظر

۱-شذرات معارف اگست ۱۹۳۲ء۔

سے تاریخ ہند پر نصابی کتاب مرتب کی جس سے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی سید صاحب نے اس پر بھی تنقید کی اور اس ضمن میں مسلمان مورخوں کو یہ مشورہ دیا کہ ''وہ تاریخ ہند کی تالیف میں انگریز مورخوں کے بجائے ان ہندو مورخوں کی پیروی کریں جو اپنے دھندلے تاریخی خاکہ کو اپنی کتاب کے ہر نئے ایڈیشن میں زیادہ رنگین بنا کر اور ابھار کر دکھاتے ہیں اور اپنی تاریخ کو باوقار اور پر فخر بنانے میں نہیں شرماتے پھر ہم کیوں اپنی کمزوریوں پہ شرمائیں۔(۱)

سید صاحب نے صرف غلط تاریخ نویسی پر ہی تنبیہ و تنقید اور اس کے مضمرات کی نشاندہی نہیں کی بلکہ انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں کی تردید بھی وہ معارف کے ذریعہ برابر کرتے رہے، مولانا شاہ معین الدین ندوی رقمطراز ہیں:

''ہندو مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان کی تاریخ میں جو زہر بھرا تھا اس کی تصحیح واصلاح ہندوستان کے بہی خواہ مورخین کے ہمیشہ پیش نظر رہی۔ سید صاحب کا تو یہ خاص موضوع تھا وہ خود بھی اس پر لکھتے رہتے تھے اور دوسرے مورخین کو بھی توجہ دلاتے رہتے تھے''۔(۲)

مذکورہ اسباب کی بنا پر ہندوستان کی صحیح تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ سب سے پہلے پروفیسر عبدالقادر نے پونا سے اس اہم کام کی طرف سید صاحب کے نام ایک خط سے توجہ دلائی اور تاریخ ہند کی تدوین اور اغلاط کی تصحیح کے لیے ایک مجلس کے قیام کی تجویز پیش کی سید صاحب نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے معارف میں اس پر تبصرہ کیا اور لکھا کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی ایک محقق تاریخ لکھنا آج مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔ دارالمصنفین اپنے مقدور بھر اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے، لیکن ضرورت ہے کہ دوسرے دردمند اہل علم بھی ہمارے کاموں میں حصہ لیں اور اپنی سعی و تحقیق سے ممنون فرمائیں۔ ہمارے نزدیک یہ مناسب ہے کہ تاریخ ہند کے مختلف حصے کر دیئے جائیں اور ایک ایک حصہ ایک ایک ایسے شخص کو دیا جائے جس نے اس

۱۔معارف ستمبر ۱۹۳۰ء۔ ۲۔حیات سلیمان ص ۵۰۴۔

دور تاریخی پر کچھ تلاش و جستجو کی ہے اور اگر سرمایہ اجازت دے تو ان کو ان کے کاموں کا مالی معاوضہ بھی دیا جائے''۔(۱)

پھر سید صاحب نے تاریخ ہند کی تدوین کا ایک مکمل منصوبہ بنایا اور معارف کے ذریعہ اسے قوم کے سامنے پیش کیا انھوں نے لکھا کہ:

''ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین اسلام کی بادشاہی اور حکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی اور یہاں جو تمدن پیدا کیا ان سب کی ایک مفصل و مکمل اسلامی تاریخ کی ضرورت تاریخی علمی قومی اور سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے۔ ارباب نظر کی نگاہیں اس کے لیے برابر دارالمصنفین پر پڑ رہی ہیں دارالمصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لیے پہلو تہی کی کہ اس کے لیے گرانقدر مصارف کی ضرورت ہے جس کے لیے اس کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں۔ اس کام کے لیے اس کو جو ضرورت درپیش ہے اس کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے:

(۱) تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخوں کی فراہمی اس کی نقل اور ہو سکے تو اس کی خریداری۔

(۲) تاریخ کی جو مطبوعہ کتابیں ہیں ہمارے پاس نہیں ہیں ان کو حاصل کرنا۔

(۳) یورپین زبانوں میں قدیم یورپین سیاحوں نے مغلوں کے عہد کے جو احوال لکھے ہیں یا آج کل انگریزی میں ہندوستان کی جو قابل ذکر تاریخیں لکھی گئی ہیں ان کو خرید کر یا ہدیۃً حاصل کرنا۔

(۴) مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے اپنے عہد کے جو تاریخی مواد فراہم کیے ہیں ان کو جمع کرنا۔

(۵) مختلف کتب خانوں میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق جو نادر قلمی کتابیں موجود ہیں سفر کر کے ان کا مطالعہ اور ان سے مواد فراہم کرنا۔

۱۔معارف نومبر ۱۹۳۲ء۔

(۶) کتابوں کی ترتیب و تدوین کے لیے چند لائق اشخاص کی خدمت مناسب معاوضہ پر حاصل کرنا۔

(۷) تیار شدہ کتابوں کو چھاپ کر شائع کرنا۔(۱)

سید صاحب کا خیال تھا کہ تاریخ ہند کی تدوین پندرہ حصوں میں کی جائے جن میں عربوں، غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں، مغلوں کے علاوہ دکن، گجرات، مالوہ، خاندیش، کشمیر، ملتان، جونپور، بنگال، حیدرآباد، مرشد آباد، عظیم آباد، اودھ، روہیل کھنڈ، بیدر اور ارکاٹ وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ان کی علمی، تمدنی اور تہذیبی تاریخ بھی لکھی جائے۔

یہ منصوبہ تاریخ بہت پسند کیا گیا خود سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہم نے تاریخ ہند کی نسبت پچھلے دو پرچوں میں جو تجویز پیش کی تھی بحمد اللہ کہ اس نے بڑی ہردلعزیزی حاصل کی اور اکثر صاحبوں نے اس کی ضرورت کا اعتراف کیا اکثر اردو اور بعض انگریزی اخبارات میں اس کا خیر مقدم کیا گیا طلبہ میں خصوصیت کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تجویز کتنی ضروری اور اہم تھی''۔(۲)

سید صاحب کا خیال تھا کہ اس منصوبہ کی تکمیل میں تقریباً سترہ ہزار روپے خرچ ہوں گے، انھوں نے قوم سے اس کے مصارف کی اپیل کی۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے پچاس روپیہ ماہوار ایک سال تک دینے کا وعدہ فرمایا، خواجہ حسن نظامی نے ایک ہزار روپیہ قسط وار دینے کا وعدہ کیا، خان بہادر مولوی محمد حسین خاں سابق فائنانس منسٹر رامپور نے پانچ سو روپے ایک مشت عطا کیے۔ سید صاحب نے اسی قلیل رقم سے اس بڑے کام کا دارالمصنفین میں آغاز کیا اور اس کی تدوین و تکمیل کے لیے بزم تاریخ بنائی اور اس وقت کے ہندوستان کے مایہ ناز مورخوں سے اس میں حصہ لینے کی اپیل کی ان مورخوں کے نام یہ ہیں:

(۱) پروفیسر شیخ عبدالقادر دکن کالج پونہ (۲) پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۳) پروفیسر ہارون خاں شروانی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن (۴) پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اسماعیل کالج بمبئی (۵) مولانا سید ابو ظفر ندوی مولف تاریخ گجرات، احمد آباد

۱-معارف دسمبر ۱۹۳۴ء۔ ۲-ایضاً جنوری ۱۹۳۳ء۔

(۶) ڈاکٹر محمد ناظم محکمہ آثار قدیمہ دکن، مصنف تاریخ محمود (۷) پروفیسر سید عبدالقادر، اسلامیہ کالج لاہور (۸) حکیم شمس اللہ قادری، حیدر آباد (۹) مولوی سید ہاشمی مؤلف تاریخ ہند، حیدر آباد (۱۰) مولوی سید مقبول احمد مولف حیات جلیل الہ آباد (۱۱) مولوی اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مولف آئینۂ حقیقت (۱۲) مولوی سید ریاست علی ندوی (۱۳) علام عبداللہ یوسف علی (۱۴) ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، لاہور وغیرہ۔

اس منصوبہ تاریخ کی تدوین میں حصہ لینے اور اس کو انجام دینے کے لیے ڈاکٹر محمد ناظم مصنف تاریخ محمود، پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرتب رقعات عالمگیر، پروفیسر محمد ابراہیم عثمانیہ کالج اورنگ آباد، سید الطاف علی بریلوی مصنف حیات حافظ رحمت خاں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض فضلاء نے اپنی خدمات پیش کیں۔(۱)

سید صاحب نے تاریخ ہند کی تجویز کے سلسلہ میں انگریز مورخین کے ساتھ بعض ہندو مورخین کی غلط بیانیوں اور ہرزہ سرائیوں کی نشاندہی بھی کی تھی جس کو بعض ہندو اہل علم نے ناپسند کیا۔ پنڈت منوہر لال زتشی پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ نے ایک طویل خط سید صاحب کے نام لکھا جس میں بعض باتوں سے اپنا اختلاف ظاہر کیا سید صاحب نے ان کا خط معارف میں شائع کر کے ان کا مفصل جواب دیا اور معارف کے شذرات میں لکھا کہ:

> ”افسوس ہے کہ ہمارے بعض ہندو دوستوں کو ہماری گذشتہ تحریر بزم تاریخ ہند کے بعض فقروں یا اشاروں سے بدگمانی پیدا ہوئی۔ ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم ہندوستان کی ایسی تاریخ لکھیں جس میں یہاں کے مسلمان بادشاہوں کو معصوم و بے گناہ ثابت کریں بلکہ یہ مقصد ہے کہ ایسی تاریخ لکھیں اور ایسے طرز میں لکھیں جس سے ہندو مسلمانوں میں منافرت پیدا ہونے کے بجائے یکجہتی اور اتحاد پیدا ہو۔ تاریخ کچا مواد ہے اس سے بنانے والا جو چاہے بنا سکتا ہے، چنانچہ انگریزوں کے بعد جب سے ہندو مورخوں نے کتابیں لکھنی شروع کی ہیں انھوں نے ہندو دور کو جس آب و رنگ سے لکھنا شروع کیا ہے اس کو پڑھ کر ہر ہندو طالب علم میں اپنے بزرگوں کی اچھی تقلید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی چھوت چھات اور

۱- حیات سلیمان ص ۴۲۷، معارف دسمبر ۱۹۳۲ء۔

بودھ جینی وید کر اور آریہ دھرم کے درمیان اتحاد کا خیال بڑھتا ہے اور اس میں متحدہ ہندو قومی اسپرٹ پیدا کی جاتی ہے۔ کیا اتنی اصلاحوں کے بعد ہمارے ہندو مورخ اتنی اصلاح نہیں کر سکتے کہ واقعات کو اس رنگ میں لکھیں جس سے ہندو مسلم خلیج کا پاٹ بڑھنے کے بجائے گھٹتا جائے۔

مثال کے طور پر ہم یہاں ایک واقعہ لکھتے ہیں ڈاکٹر ایشوری پرشاد محمود غزنوی کے حملہ ہند کے سلسلہ میں جہاد کا لفظ بول کر اس پر حاشیہ لکھتے ہیں:

اہل اسلام کا خیال تھا کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ کافروں یعنی اسلام نہ ماننے والوں سے لڑائی کر کے یا تو ان کو دائرہ اسلام میں شامل کرے یا تلوار کے گھاٹ اتار دے اس لڑائی کو جہاد کہتے ہیں۔

(سٹوڈنٹس ہسٹری ص۱۲۸)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق بجائے خود کہاں تک درست ہے اس کو الگ رکھیے جس وقت یہ کتاب اسکول کے کسی درجہ میں پڑھائی جاتی ہوگی دونوں فرقوں کے لڑکوں کے جذبات پر اس تشریح کا کیا اثر پڑتا ہوگا اور مسلمان لڑکے یا تو شرم سے عرق عرق ہو جاتے ہوں گے یا غصہ میں آکر کتاب اور مدرس کتاب سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں گے۔ کیا ہم اپنے ہندو مصنفوں کو اس طریقہ تالیف کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کے ساتھ بدگمانی کرتے ہیں۔(۱)

بہر حال سید صاحب نے تاریخ ہند کی تدوین کا کام دارالمصنفین میں شروع کرایا اور تاریخ سندھ وغیرہ لکھوائی۔ مگر ارباب علم ودانش نے اس کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کے شدید احساس کے باوجود کوئی عملی حصہ اس منصوبہ میں نہیں لیا، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

"گو اس تجویز کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا لیکن یہ کام اجتماعی اشتراک وتعاون سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دارالمصنفین کے ذرائع نے جہاں

۱۔ معارف دسمبر ۱۹۳۲ء۔

تک اجازت دی اس نے اس کام کو جاری رکھا۔ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر مجوزہ خاکہ کے مطابق تو انجام نہ پاسکا لیکن دارالمصنفین نے تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر دور جن سے زیادہ کتابیں شائع کیں جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے"۔(۱)

ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت

دسمبر ۱۹۴۴ء میں ہسٹاریکل کانگریس کا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا جس کے شعبہ تاریخ ہند ازمنہ وسطیٰ کی مسند صدارت سید صاحب کو پیش کی گئی جسے سید صاحب نے نہ صرف قبول فرمایا بلکہ ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ ہند پر ایک قیمتی اور پر از معلومات خطبہ صدارت بھی پڑھا جس میں ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کے متعدد ماخذوں کی نشاندہی کی اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا اور کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"مجھے کہنا ہے کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے۔ اس لیے وہ لوگ جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے اور جن کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا اور بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہے اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے"۔(۲)

اور آخر میں مورخین کو یہ مفید اور قیمتی مشورہ دیا کہ:

"ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو توڑنا نہ ہو۔ حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لیے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ خوش آئند نہ ہو سکے"۔(۳)

آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی رکنیت اور اس کے اجلاس کی صدارت

آل انڈیا ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرح ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں آل پاکستان ہسٹاریکل

۱- حیات سلیمان ص ۴۲۷۔ ۲- مقالات سلیمان ج ۱، ص ۲۸۳۔ ۳- ایضاً ۳۰۴۔

سوسائٹی قائم ہوئی تو سید صاحب کو اس کا بھی رکن منتخب کیا گیا اور اس کے پہلے اجلاس کے شعبہ تاریخ اسلام کی کرسیِ صدارت ان کو پیش کی گئی جس میں سید صاحب نے صدارتی خطبہ کے علاوہ دیبل پر ایک مقالہ پڑھا۔ عجیب بات ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تحریر تھی اور اس کا تعلق تاریخ ہی سے رہا۔

نظریہ تاریخ

سید صاحب نے مدۃ العمر فن تاریخ کی خدمت کی اس سلسلہ میں وہ علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ کے مکمل متبع و پیرو رہے جس کا مفصل ذکر دوسرے باب میں کیا جاچکا ہے۔

سید صاحب کے قلم سے کوئی مسلسل تاریخ نہیں نکلی لیکن تاریخ کے متعدد پہلوؤں پر انھوں نے جو کچھ لکھا وہ فن تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے رواج کے مطابق تہذیبی و تمدنی تاریخ پر زیادہ توجہ کی، اپنے منصوبہ تاریخ ہند میں بھی انھوں نے سیاسی تاریخ کے ساتھ تہذیبی و تمدنی تاریخ لکھنے پر زور دیا اور خود اپنی تاریخی تصانیف میں تمدنی پہلوؤں ہی کو روشن کیا۔ ان کے سیکڑوں تاریخی مضامین میں صرف دو ایسے ہیں جن کا تعلق سیاسی تاریخ سے ہے بقیہ تمام مضامین چاہے وہ تاریخ اسلام سے متعلق ہوں یا تاریخ ہند سے سب کے سب تہذیبی و تمدنی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں ہر زمانے میں ملک کی عام علمی، تمدنی اور معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ لینا تاریخ کا اہم موضوع رہا ہے۔(۱)

ان کے سامنے ہمیشہ یہ حقیقت رہی کہ قدیم تاریخوں کا یہ بہت بڑا نقص رہا ہے کہ اس میں صرف سیاسی تاریخ لکھی گئی اور قدیم مورخوں نے اسی کو اصل تاریخ سمجھا جس سے تہذیب و تمدن کے بہت سے آثار مٹ گئے۔ ور جدید میں تہذیبی و تمدنی تاریخ ہی کو اصل تاریخ قرار دیا جاتا ہے، سید صاحب بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی روش کے مطابق سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ تہذیبی و تمدنی تاریخ لکھنے کو ضروری قرار دیتے تھے۔

یہاں سید صاحب کی تاریخی تصانیف کا تعارف اور تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی تصانیف میں فن تاریخ نویسی کا منہج و معیار کیا ہے اور خود سید صاحب کس درجہ بلند مورخ تھے۔

۱۔ مقالات سلیمان ج ۱ ص ۳۹۸

۱۔سیرۃ النبیؐ (جلد سوم)

علامہ شبلی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کی اہم ذمہ داری سید صاحب کے سپرد کی تھی۔ سید صاحب نے اوّلاً علامہ شبلی کے مسودہ سیرت کو دو جلدوں میں مرتب کیا اور اس کے بعض نامکمل ابواب پورے کر کے علی الترتیب ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد خود سیرت کی تیسری جلد لکھی جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ سیرۃ النبیؐ کا یہ حصہ ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ضخیم اور مبسوط جلد میں دلائل و معجزات کا بیان ہے شروع میں نفس معجزہ کی حقیقت و اصلیت اور اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیم و جدید، علم کلام اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے بھی خوارق عادات یا معجزہ میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے۔

اس کے بعد خصائص نبوت کی تفصیل ہے جس میں مکالمہ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رؤیا، معراج اور شرح صدر کا مفصل ذکر ہے۔ بعد ازاں ان آیات و معجزات کا بیان ہے جو قرآن مجید اور مستند روایات سے ثابت ہیں پھر معجزات کی غیر معتبر اور ضعیف روایات پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان تفصیلات معجزات کے بعد ان بشارات کا ذکر ہے جو قدیم الہامی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ آخر میں خصائص محمدی کا باب ہے جس میں ذات پاک ﷺ کے خصائص کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اسی طرح یہ حصہ سیرت کے علاوہ خود دلائل و معجزات کا معرکتہ الآرا مبحث ہے۔ اس میں مسلمان فلاسفہ فارابی، ابن سینا اور ابن مسکویہ کے علاوہ معتزلہ اور اشاعرہ کے ان نتائج فکر سے بھی استدلال کیا گیا ہے جو معجزات کے امکان و وقوع سے متعلق ہیں۔ معجزات کی حقیقت پر امام رازی، علامہ ابن تیمیہ، مولانائے روم اور امام غزالی کے دلائل کے ذریعہ بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس حصہ میں دلائل و معجزات اور فلسفہ جدیدہ کا پورا باب علامہ شبلی کے ایک اور شاگرد اور سید صاحب کے رفیق مولانا عبدالباری ندوی فلسفی کے قلم سے ہے جس میں دقیقہ سنجی اور نکتہ آفرینی خاص خوبی ہے اور یورپ کے دانشوروں اور فلسفیوں مثلاً ہیوم، بکسلے، جان اسٹارٹ مل، ولیم جیمز، شوپن ہار، اور ہیگل کی کتابوں سے استفادہ کر کے ان کے خیالات و افکار کا

مفصل جائزہ لیا گیا ہے جس سے اس بحث میں جدت اور عصر حاضر کے مزاج کی عکاسی بھی ہو گئی ہے۔ گویا مشرق و مغرب کے نامور عقلاء و فلاسفہ کے دلائل سے حقیقت معجزہ پوری طرح واضح کر دی گئی ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے بقول "اس جامعیت اور استقصا کے ساتھ معجزات پر بحث کی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور کوئی رُخ چھوٹنے نہیں پایا ہے"۔

۲- سیرۃ النبیؐ چہارم

سیرۃ النبیؐ کا یہ حصہ ۸۳۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، اس کا موضوع عقائد ہے، شروع میں نبوت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اہمیت وافادیت اور ضرورت کے علاوہ اس کے لوازم و شرائط کی تفصیل و تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ میں آنحضرت ﷺ کی بعثت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اور ان کی پستی و زبوں حالی بیان کی گئی ہے۔ خاص طور سے عرب کے حالات واقعات مذہبی و اخلاقی حالات اور ان کے تنزل کی تفصیل ہے نیز عربوں کی اصلاح و تربیت میں آنحضرت ﷺ کو جو دشواریاں اور دقتیں پیش آئیں اور بالآخر آپؐ نے جو عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا اس کا مفصل بیان ہے۔

اس کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، رسل و ملائکہ، کتب الٰہی اور آخرت پر ایمان سے متعلق سیر حاصل مباحث ہیں۔ اخروی زندگی کے باب میں برزخ، قیامت، سزا، جزا، جنت اور دوزخ اور قضا و قدر کا بھی تذکرہ ہے، آخر میں ایمان کے نتائج کا بیان ہے، عقائد کے ان دقیق اور نازک مسائل کو جن کو محض عقل و فہم سے سمجھنا دشوار تھا بقول شاہ معین الدین احمد ندوی "ایسے حکیمانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قلب سلیم کی تشفی کے لیے بالکل کافی ہے"۔(۱)

۳- سیرۃ النبیؐ جلد پنجم

۴۵۶ صفحات پر مشتمل یہ حصہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اس حصہ کا موضوع عبادات ہے۔ شروع میں اعمال صالحہ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے اقسام بھی بیان کیے گئے ہیں، پھر عبادت کا مفہوم واضح کیا گیا ہے اس کے بعد فرائض خمسہ یعنی نماز، روزہ،

۱- معارف سلیمان نمبر ص ۱۸۲۔

زکوٰۃ، حج، کے علاوہ جہاد کی تاریخی اہمیت وافادیت اور حکمت و مصالح بیان کیے گئے ہیں۔

جسمانی عبادات کی فضیلت و حکمت اور ان کے مصالح بیان کرنے کے بعد قلبی عبادات کا بیان ہے اور بقول مصنف "اول الذکر عبادات کی روح کا درجہ رکھتی ہیں"۔ ان میں تقویٰ، اخلاص اور صبر و شکر کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے اور خاص طور پر تقویٰ کا بیان نہایت جامع اور مفصل ہے۔

ان تمام عبادات کے مباحث کو نہایت حکیمانہ اور دلنشیں انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ فرائض خمسہ کی پوری تاریخ ان کی اہمیت وافادیت اور فضائل ہر شخص کے دل پر نقش ہو جائیں۔

۴۔ سیرۃ النبیؐ ششم

سیرۃ النبیؐ کا یہ حصہ ۸۲۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اس کا موضوع اخلاق ہے۔ یعنی اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی مرقع آرائی کی گئی ہے اور اخلاق کے ہر پہلو پر مفصل اور بہ دلائل بحث کی گئی ہے تاکہ اخلاق کی سچی تعلیمات اور اس کی اہمیت و افادیت واضح ہو جائے۔ ابتداً اسلامی اخلاق کے اوصاف و امتیازات گنوائے گئے ہیں پھر دنیا کے تمام معلمین اخلاق میں حضور اکرم ﷺ کے امتیازی اوصاف کو بیان کیا گیا ہے بعد ازاں اسلام کے فلسفہ اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا یہود و نصاریٰ کے فلسفہ اخلاق سے موازنہ کر کے اخلاق اسلامی کی خوبیاں اور دوسروں کی خامیاں دکھائی گئی ہیں اور اخلاق اسلامی کی نمایاں خصوصیت بے غرضی، حسن نیت، رضائے الٰہی، عدل وانصاف، احسان، عفوودرگذر اور برائی کے بدلہ نیکی بتائی گئی ہے۔ ضمناً اسالیب اخلاق اور تعلیمات اخلاق کے اقسام، حقوق و فرائض اور اخلاق کے فضائل ورزائل کے مباحث بھی ہیں۔

حقوق و فرائض کے ضمن میں اسلام میں والدین اولاد و ازواج، قرابت داروں، یتیموں، ہمسایوں، بیواؤں، حاجت مندوں، بیماروں، غلاموں، عام مسلمانوں نیز جانوروں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔

فضائل اخلاق کے ضمن میں صدق، سخاوت، عفت وپاکبازی، امانت ودیانت، شرم و حیا، رحم اور عدل و انصاف، احسان، عفو و درگذر، ایفائے وعدہ، حلم و بردباری، تواضع

وانکساری، خوش گفتاری، ایثار، اعتدال و میانہ روی، خودداری و عزت نفس، شجاعت و دلیری، استقامت و حق گوئی اور استغناو بے نیازی وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

رزائل اخلاق میں کذب بیانی، وعدہ خلافی، خیانت و دغابازی، غداری، چغل خوری، بہتان طرازی، غیبت و بدگوئی، خوشامد، بخل، حرص و طمع، چوری و بے ایمانی، رشوت ستانی، سود خوری، شراب نوشی، بغض و کینہ، ظلم و تشدد، ریا، فخر و غرور، خود بینی و خود نمائی، فضول خرچی، حسد، فحش گوئی کے مضرات و نقصانات کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

آخر میں اسلامی آداب معاشرت کا ذکر ہے جس میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، مجلس، ملاقات، گفتگو، لباس خوشی و غمی کے تمام اسلامی اصول و آداب کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔

اس حصہ میں اسلام کے نظام اخلاق کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے تہذیب و شائستگی کے لیے کس قدر بلند و بالا اصول پیش کیے ہیں اور جس کی بنیاد پر ایک ایسا صالح معاشرہ بنایا جاسکتا ہے جو انسانی معیار کا مثالی نمونہ ہو۔

اس میں بعض مقامات پر فقہی مسائل کا ذکر آگیا ہے مگر مصنف نے عموماً فقہی جزئیات میں الجھنے سے گریز کیا ہے۔

اخلاق کے فضائل ورزائل کے بعض حصے مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہیں۔

اخلاقیات کے موضوع پر بلاشبہ اردو میں یہ سب سے عمدہ، جامع اور بلند پایہ تحقیقی تصنیف ہے۔ سید صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے سلسلہ سیرت میں اخلاقیات کے ان تمام پہلوؤں کو روشن ترین سیرت نبوی کا مؤثر ترین مجموعہ بنادیا۔

۵- سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم

سید صاحب سیرۃ النبیؐ میں معجزات، عقائد، عبادات اور اخلاق کے بعد معاملات کا حصہ بھی لکھنا چاہتے تھے جس کا انھوں نے معارف میں اعلان بھی کیا تھا مگر سیرۃ النبیؐ کا یہ آخری حصہ ان کی دیگر مصروفیات اور بعض ذاتی مسائل کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ اس میں سید صاحب معاملات اور سیاسیات کے متعلق اسلامی تعلیمات کو واضح کرنا چاہتے تھے، معاملات سے سید صاحب کی مراد وہ مسائل ہیں جن کی حیثیت قانون کی ہے جس میں سلطنت اور اس

کے آداب نیز اسلام کے معاشرتی، تمدنی، اجتماعی اور اقتصادی ہر قسم کے قوانین آجاتے ہیں۔
افسوس کہ یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی صرف چند ہی ابواب لکھے جا سکے جو سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی کوششوں سے سید صاحب کی وفات کے ۲۷ سال بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئے لیکن مبادی و بنیادی مباحث کے لحاظ سے اس کتاب کو ناقص و نامکمل نہیں کہا جا سکتا۔
یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اسلام میں حکومت کی اہمیت و حیثیت واضح کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں عہد نبویؐ کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں سلطنت اور دین کے تعلقات کا ذکر ہے، چوتھے باب میں امت مسلمہ کی بعثت اور اس کے فرائض کی تفصیلات ہیں، پانچویں باب میں قوت عاملہ و آمرہ کے مباحث ہیں، آخری باب میں حاکم حقیقی کی حاکمیت کو واضح کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ جب تک زمین پر قانون الٰہی کا نفاذ نہیں ہوگا انسانیت عدل و انصاف سے محروم رہے گی۔
کتاب کے شروع میں دو مقدمے ہیں پہلا مقدمہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے دوسرا مقدمہ سید صاحب کے قلم سے ہے جس میں معاملات کی تعریف اور اس کے حدود بتائے گئے ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریر کتاب کے ابواب سے پہلے ہی سپرد قلم کی گئی تھی۔
ناتمامی کے باوجود اس میں معاملات سے متعلق تمام اصولی مباحث سمٹ آئے ہیں اور اسلام کے سیاسی نظام کے اصول و مبادی کا ایک ایسا جامع مرقع سامنے آگیا ہے جو سید صاحب کی علمی و تاریخی فہم و بصیرت کا بہترین نمونہ ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

سیرت کے موضوع پر داد تحقیق دینے والا ایک طبقہ سیرت کے موضوعات کے انتخاب پر نکتہ چیں ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سید شاہ علی نے یہ اعتراض کیا کہ آخر عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کا سیرت سے کیا تعلق ہے سیرت تو صرف آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ اور آپؐ کے اخلاق و کردار اور شمائل و معمولات پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ تخیل کی کوئی وسعت اور پرواز ان چیزوں کو سوانح عمری کے دائرے میں نہیں لا سکتی (۱)،
لیکن سید صاحب کو بھی اس اعتراض کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے سیرۃ النبیؐ جلد پنجم میں

۱- اردو میں سوانح نگاری ص ۲۰۱-۲۰۵۔

واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ:

"اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی و سیر کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور پر سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مطلب ان دو سوالوں کا جواب ہے کہ اسلام کا پیغمبر کون تھا اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب ہیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں"۔(۱)

ڈاکٹر سید شاہ علی اور ان کے ہمنواؤں کو جن جزئیات پر اعتراض ہے وہی جزئیات دراصل تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ انھیں سے عہد رسالت کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور سیرت کے ساتھ تاریخ بھی ہو جاتی ہے اور دور جدید کے مورخین انھیں جزئیات کو اصل تاریخ قرار دیتے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ اصول تاریخ وسیر کی روشنی میں

علامہ شبلی ہی کی طرح سید صاحب نے بھی سیرت کا بنیادی ماخذ قرآن مجید اور احادیث صحیح کو قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"سیرت نبویؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبویؐ اس کے نقش و نگار ہیں"۔(۲)

چنانچہ سیرۃ النبیؐ میں انھوں نے قرآن مجید اور احادیث صحیح سے مکمل استفادہ کیا ہے اس خوبی کا اعتراف بھی کیا گیا، مشہور عالم و مصنف مولانا مجیب اللہ ندوی لکھتے ہیں:

"اردو کیا عربی میں بھی سیرت نبویؐ پر جتنا ذخیرہ موجود ہے کوئی بھی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے خالی نہیں ہے مگر اس سیرت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ساری بنیاد یا تو قرآن پر ہے یا پھر صحیح اور مستند احادیث نبویؐ پر"۔(۳)

اس بنیادی ماخذ کے علاوہ سیرت و تاریخ کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے لیکن انھیں واقعات میں جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث صحیح میں نہیں ہے۔ لیکن اس میں یہ

۱-مقدمہ سیرت النبیؐ جلد پنجم۔ ۲-مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۲۔ ۳-معارف سلیمان نمبر ص ۲۶۹۔

خاص احتیاط برتی گئی ہے کہ کوئی غیر مستند واقعہ نہ آنے پائے اور صحت ماخذ کے تمام مورخانہ اور محدثانہ اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ چنانچہ روایت ودرایت کے اصول خصوصیت سے پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

تاریخ میں حقیقت و واقعیت تک پہنچنے کے لیے اسباب و علل کی تلاش نہایت ضروری ہے، چنانچہ سید صاحب نے اسباب و علل کی تلاش کا فریضہ بھی انجام دیا ہے اور مورخین مغرب کے برعکس مفید اور صحیح نتائج مستنبط کیے ہیں۔

اسباب و علل کی تلاش کے بعد قیاس واجتہاد سے جو نتائج مستنبط کیے ہیں مورخین مغرب کے برعکس ان کو اصل واقعہ میں خلط ملط نہیں کیا گیا ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی مذکورہ جلدوں میں سادہ واقعہ نگاری یعنی تاریخی اسلوب نگارش سے کام لیا گیا ہے اور مصنف نے اپنے فطری اسلوب نگارش سے کہیں بھی تجاوز نہیں کیا ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں"۔(۱)

استناد وحوالہ اور مراجع ومصادر کی نشاندہی کا جس قدر اہتمام کیا گیا ہے اردو کی شاید ہی کسی اور کتاب میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہو اگر اس کے مآخذ کی فہرست تیار کی جائے تو وہ خود ایک مستقل تصنیف ہو جائے۔

سید صاحب نے علامہ شبلی ہی کی طرح یورپ کے مورخین اور اہل قلم کے کذب و افتراء اور لغو بیانی کا جس مدلل انداز میں ردّ وابطال کیا ہے اس کی مثال کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ان خصوصیات کی بنا پر بجا طور پر کہا گیا ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں اس کا جواب نہیں ہے۔(۲)

۱- سیرۃ النبیؐ ج ۴، ص ۱۹۲۔ طبع سوم ۱۹۵۱ء۔ ۲- معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸۔

۶-ارض القرآن

یہ سید صاحب کی پہلی تصنیف ہے اور قیام دارالمصنفین کے فوراً بعد ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ سید صاحب جب دفتر سیرت نبویؐ میں اسسٹنٹ تھے یہ مواد اسی زمانہ میں سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ کے لیے جمع کیا تھا۔ بعد میں اسی کو ارض القرآن کے نام سے شائع کیا گیا بجا طور پر سید صاحب نے اسے سیرت نبوی کا مقدمہ قرار دیا ہے۔(۱)

جغرافیائی تاریخ کی اردو زبان میں یہ پہلی مستقل تصنیف ہے خود سید صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا کہ قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی"۔(۲)

اس کتاب کی تالیف کا مقصد اور اس کی غرض وغایت عرب کی قدیم تاریخ وجغرافیہ کی تحقیق اور قرآن مجید کے تاریخی اور جغرافیائی بیانات اور مستشرقین یورپ کے اعتراضات کا جواب ہے۔

قرآن پاک میں عبرت ونصیحت کے لیے قدیم عرب کی اقوام اور ان کے انبیاء ورسل اور ان کے اماکن وآبادیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا یورپ کے مورخین نے قدیم آثار وکتبات اور جدید اثری انکشافات وتحقیقات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ مگر نتائج مستنبط کرنے میں نہایت بددیانتی سے کام لیا ہے اور قرآن پاک کے بیانات کو مشتبہ اور غلط ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ ان کی غلط کاری کے کئی اسباب ہیں، چونکہ قدیم تاریخ عرب کا ماخذ عربوں کی زبانی روایات اور اسرائیلیات ہیں جن میں بہت سی بے سروپا روایتیں عام ہیں اور انھیں روایات کو بعد کے مفسروں نے پس منظر کے طور پر اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے جس سے یورپ کے مورخین کو کھل کھیلنے کا پورا موقع حاصل آگیا۔ لیکن اس غلط بیانی کا سب سے بڑا سبب ان کا وہ قدیم مذہبی وآبائی تعصب ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے تئیں روا رکھا گیا ہے۔

۱-ارض القرآن اول مقدمہ ص ۲۔ ۲-ایضاً ص ۴۔

سید صاحب نے ارض القرآن میں مورخین یورپ اور مستشرقین کی تحقیقات کا جائزہ لیا ہے اور تحقیق و تدقیق سے قرآن پاک کے بیانات کی صداقت ثابت کی ہے جو مستشرقین کی تحقیقات کے بھی مطابق ہیں اس سلسلہ میں انھوں نے یورپ کے مورخین کی بدیانتیوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کی ابتداء میں ۸۲ صفحے کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں قدیم عرب کی تاریخ و جغرافیہ کے قدیم و جدید ماخذ یعنی قرآن مجید، تفسیری روایات، اسرائیلیات، انساب عرب، کلام عرب اور عرب کے قدیم تاریخ و جغرافیہ پر اسلامی رومی اور یونانی مصنفین کی کتابوں اور عرب کی قدیم روایتوں اور جدید اثری اکتشافات پر بحث و تنقید کی گئی ہے۔

اس کے بعد قدیم عرب کا مفصل جغرافیہ اور اس کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے نیز قرآن پاک میں جن اقوام و قبائل مثلاً مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسماعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش وغیرہ اور مقامات اور آبادیوں کا ذکر ہے اور اثری تحقیقات کی روشنی میں ان کی تاریخ لکھی گئی ہے۔

دوسرے حصہ میں قرآن پاک، توراۃ، رومی و یونانی مصنفین کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کی اسلام سے پہلے کی تجارت اور ان کے مذاہب کا مفصل حال لکھا گیا ہے نیز قرآن پاک کے بیانات کی جدید مآخذوں سے تائید و توثیق اور مستشرقین کے غلط بیانات کی تردید کی گئی ہے۔

اس کتاب سے قدیم عرب کی پوری جغرافیائی تاریخ سامنے آجاتی ہے اور قرآن پاک کی صداقت اور اس کی تاریخی حیثیت بھی پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔

سید صاحب کی یہ پہلی تصنیف اپنے موضوع پر گو حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے تاہم قریباً ایک صدی گذرنے کے بعد جدید تحقیقات کی روشنی میں اب اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے۔

ارض القرآن اور نظریہ تاریخ

ارض القرآن کو علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ کا بہترین عملی نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے

اس میں سید صاحب نے تاریخ کے تمام بنیادی اصولوں سے کام لیا ہے تحقیق و تدقیق سے سید صاحب نے جس قدر اس تصنیف میں کام لیا ہے وہ ان کی دوسری مایہ ناز تصانیف سے کسی طرح کم نہیں۔

جہاں روایت کی تمام جزئیات سے کام لیا گیا ہے وہیں درایت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے صحت واقعہ کے لیے جتنی تحقیق و جان سوزی ممکن تھی سید صاحب نے ان سے دریغ نہیں کیا ہے۔ قیاس و اجتہاد سے کام لینا مورخ کے لیے یقیناً ناگزیر ہے مگر اس کے بعد نتائج مستنبط کرنے میں احتیاط بھی اسی درجہ مقدم ہے مورخین یورپ نے قدیم عرب کی جغرافیائی تاریخ میں یہیں ٹھوکر کھائی ہے، سید صاحب کی مورخانہ ژرف نگاہی سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے قیاس و اجتہاد سے تاریخ میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے درست اور مثبت نتائج مستنبط کیے۔ سند و حوالہ کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے، تاریخی اسلوب کا قدم قدم پر لحاظ رکھا ہے بے شک یہ کتاب نظریہ تاریخ کا بہترین نمونہ ہے۔

سید صاحب کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور کئی بار طبع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل چکی ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

مولانا سید سلیمان ندوی کی تاریخی تصانیف میں عرب و ہند کے تعلقات نہایت عمدہ کتاب ہے۔ یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۲۲، ۲۳ر مارچ ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر الہ آباد میں دیئے تھے۔ اکیڈمی نے پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع کیا اور سید صاحب کو انعام سے نوازا۔

سید صاحب کی یہ تصنیف چونکہ اپنے موضوع پر پہلی تصنیف تھی اس لیے بہت مقبول ہوئی اب تک اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ جناب سعید الحق دیسنوی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو اسلامک کلچر حیدر آباد میں قسط وار ۳۳-۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے حکومت پاکستان نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد صلاح الدین استاذ جامعہ عثمانیہ نے کیا جسے انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈلسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدر آباد نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

ابتدائی تاریخ

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں عربوں کے ہندوستان سے ابتدائی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر لفظ ہند پر بحث کی گئی ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس ملک کا نام ہندوستان کب اور کیوں پڑا۔ اس کے بعد تاریخی شواہد سے بتایا گیا ہے کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فنیشین عرب تھے جو شام کے ساحل پر آباد ہو گئے تھے اور ان کے اثرات ظہور اسلام سے صدیوں پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ اور فتح سندھ کی اجمالی تاریخ کے بعد مسلمان سیاح و جغرافیہ نویس مثلاً ابن خرداذبہ (۲۵۰ھ) سلیمان تاجر (۲۳۷ھ) ابوزید حسن سیرافی (۲۶۴ھ) ابودلف مسعر بن مہلہل (۳۳۱ھ) بزرگ بن شہریار (۳۰۰ھ) مسعودی (۳۰۳ھ) اصطخری (۳۴۰ھ) ابن حوقل (۳۳۱ھ) بشاری مقدسی (۳۷۵ھ) البیرونی (۴۰۰ھ) ابن بطوطہ (۷۷۹ھ) وغیرہ کی کتابوں سے قدیم ہندوستان کے حالات قلمبند کیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ ان مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے ہندوستان کی اس دور میں تاریخی خدمت انجام دی۔ اسی میں ضمناً ہندوستان کے عام حالات کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں ان مورخین اور جغرافیہ نویسوں کا تذکرہ ہے جو اگرچہ ہندوستان نہیں آئے مگر اپنی کتابوں میں اس کے حالات لکھے ہیں ان میں ابن رستہ (۲۹۰ھ) قدامہ بن جعفر (۲۹۶ھ) بلاذری (۲۷۹ھ) ابن الندیم (۳۷۰ھ) شمس الدین دمشقی (۷۲۸ھ) ادریسی (۵۶۰ھ) زکریا قزوینی (۶۸۲ھ) ابوالفداء (۷۳۲ھ) یاقوت حموی (۶۲۷ھ) نویری (۷۲۳ھ) اور شہاب الدین عنبری (۷۴۸ھ) کے حالات اور ہندوستان سے متعلق ان کی تاریخی خدمات اور کارناموں کا ذکر ہے۔

تجارتی تعلقات

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عرب تاجروں کی اہمیت کے ساتھ تجارتی راستوں، منزلوں اور بندرگاہوں کی تفصیل ہے۔ بعد ازاں دوسری اقوام کی تجارت اور ہندوستان کی پیداوار، مصنوعات اور سامان تجارت، تجارتی درآمد و برآمد عرب کے ہندوستانی تاجروں، بحر ہند میں چلنے والے جہازوں کی وسعت

ہندوستان کی بحری تجارت اور یہاں کی دولت و ثروت کا مفصل ذکر ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بحر روم کو چھوڑ کر افریقہ کے پشت سے بحر ہند میں داخل ہونے کے راستہ کی تلاش کا سہرا واسکوڈی گاماں کے سر باندھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس راستے کی تلاش سب سے پہلے عربوں نے کی اور واسکوڈی گاماں کو ہندوستان پہنچانے والا بھی ایک عرب تاجر ابن ماجد تھا جس کا لقب اسد البحرین یعنی سمندروں کا شیر تھا۔(۱)

علمی تعلقات

تیسرے باب میں عربوں کے ہندوستان سے علمی روابط کا تذکرہ ہے اور دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان سے علمی روابط کا آغاز اگرچہ بنوامیہ کے دور سے شروع ہوا مگر اصل علمی تعلقات کا آغاز عہد عباسی میں خاندان برامکہ کے ذریعہ ہوا۔ برامکہ کی کوششوں سے ہندو فضلاء بغداد پہنچے اور انھوں نے ہندوستان کے مختلف علوم و فنون کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ برامکہ کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ ایرانی مجوسی تھے مگر سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ "برامکہ بدھ مذہب کے پیرو تھے اور ان کا اصل تعلق ہندوستان سے تھا نہ کہ ایران سے"۔(۲)

برامکہ کے زوال کے بعد مامون کے عہد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا سید صاحب نے اس باب میں طب، نجوم، جوتش، ہیئت، ریاضی، موسیقی، جنگ و سیاسیات، منطق و کیمیا، جفر و رمل، قصص و حکایات اور اخلاق و حکمت کی جو کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں اور جن ہندو فضلاء نے بغداد میں یہ خدمت انجام دی ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اس باب کے آخر میں البیرونی کے حالات لکھے ہیں البیرونی نے ہندوستان کی وہ خدمت انجام دی جو اس عہد کے کسی ہندو فاضل سے بھی نہ ہو سکی، سید صاحب رقمطراز ہیں:

> "بیرونی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علمی سفارت کا کام انجام دیا اس نے عربوں اور ایرانیوں کو ہندوؤں کے علوم سے اور ہندوؤں کو عربوں اور ایرانیوں کی تحقیقات سے آگاہ کیا اس نے عربی جاننے والوں کے لیے سنسکرت سے اور سنسکرت جاننے والوں کے لیے عربی سے کتابیں ترجمہ کیں اور اس طرح وہ فرض ادا کیا جو ہندوستان کا مدت سے عربی زبان کے علوم و فنون پر چلا آرہا تھا"۔(۳)

۱- عرب و ہند کے تعلقات ص ۹۲۔ ۲- ایضاً ص ۱۱۴۔ ۳- ایضاً ص ۱۷۷۔

مذہبی تعلقات

چوتھے باب میں مذہبی تعلقات کی تفصیل ہے۔ سید صاحب نے پہلے ان خیالات کی تردید کی ہے جو عام طور سے انگریز مورخوں نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے بارے میں مشہور کر رکھے تھے۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں اگرچہ مسلمان تھے مگر وہ مجموعی طور پر اسلام کے نمائندہ نہ تھے اور نہ ان کی حکومت اسلامی حکومت تھی یہاں تک کہ ان کے افسر اسلام کے صلح و جنگ اور حاکم و محکوم کے قوانین سے بھی واقف نہ تھے (۱)۔ اس لیے ان کے اعمال و افعال کو مذہب سے جوڑنا اور اس سے اسلام پر تنقید کرنا کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

سید صاحب کا خیال ہے کہ اسلام کے اصل نمائندے عرب تھے ان کا نظام حکومت اسلامی نظام حکومت تھا اور ان کے عہد حکمرانی میں ظلم و زیادتی کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی ان کے اندر بڑی مذہبی رواداری اور فراخدلی تھی انھوں نے اپنے محکوم قوموں کے مذہبی رسم و رواج میں کوئی مداخلت نہیں کی اور نہ ان کی عبادت گاہوں پر کہیں ہاتھ لگا اور جزیہ کے بعد ان کو مسلمانوں کے برابر درجہ دیا۔ سندھ کی حکومت اسی روش پر قائم رہی اور ہندوؤں کو اہل کتاب کے مشابہ قرار دے کر ان کی عورتوں اور ذبیحہ کے سوا ہر چیز میں انھیں اہل کتاب کے برابر حقوق دیئے۔ اسی ضمن میں سید صاحب نے کافر و مسلم، اہل کتاب اور جزیہ جیسے اہم مسائل و مباحث زیر بحث لا کر ان امور کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کی ہیں۔

ان مباحث کے بعد اصل مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور سید صاحب نے دکھایا ہے کہ عربوں کے ہندوستان سے گوناگوں تعلقات ہی کی وجہ سے عرب سیاح مورخین کو یہاں کے مذاہب کی تحقیقات کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے نہایت تلاش و تفحص اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ یہاں کے مذاہب کا حال لکھا۔ اوپر جن عرب مصنفین، مورخین اور سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا ذکر ہوا ان کے علاوہ ابن الندیم، طاہر مقدسی، ابوالعباس ایرنشہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی وغیرہ نے خاص طور سے اپنی تصانیف میں ہندو مذاہب، ان کے فرقے، عقائد، مذہبی رسم و رواج، علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور ثقافت کے بارے میں تفصیل سے لکھا، سید صاحب نے انھی کے بیانات کی روشنی میں علمی

۱- عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۸۷

تعلقات کی مرقع کشی کی ہے۔

فرقہ سمینیہ کا ذکر عربی تاریخ و تذکروں میں موجود ہے اس پر سید صاحب نے بڑی محققانہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فرقہ سمینیہ دراصل بدھ تھے اور ہندوستان میں ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ میں جن علاقوں سے مسلمانوں کا خاص تعلق رہا وہاں زیادہ تر بدھ ہی آباد تھے۔

اس باب میں سید صاحب نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک دوسرے پر اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے چنانچہ انھوں نے مذہبی تعلقات کے ضمن میں دکھایا ہے کہ اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان پر پڑا، بعض ہندو راجہ مسلمان ہوئے اور ان کے درمیان مذہبی روابط اس قدر بڑھے کہ سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کرایا۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں توحید خالص کا تصور بھی اسلام کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے، اسی طرح مسلمان بھی جس طرح ہندوؤں سے متاثر ہوئے سید صاحب نے ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔

فتوحات اسلامی سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادیاں

پانچویں اور آخری باب میں سید صاحب نے ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے قبل مسلمانوں کی آبادیوں کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ باب دراصل گذشتہ ابواب کے مباحث کا ماحصل ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ دکن اور جنوبی ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں سب سے آخر میں قائم ہوئیں وہاں مسلمان پہلے ہی سے آباد تھے اور وہاں کا کوئی ساحلی اور تجارتی شہر مسلمانوں سے خالی نہ تھا۔ یہاں تک کہ بعض شہروں میں ان کی آبادیاں کئی کئی ہزار تھیں اور وہاں کے ہندو راجاؤں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا اور وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور ان کو ہر طرح کی سہولتیں بھی فراہم کرتے تھے۔ مسلمانوں کی یہ آبادیاں مسجدوں سے معمور تھیں یہی نہیں جہاں زیادہ آبادیاں تھیں وہاں ان کا مذہبی نظام اس طرح قائم تھا کہ وہ اپنے باہمی معاملات و مسائل کا فیصلہ اسلامی قوانین کے ذریعہ کرتے اور اس کے لیے باقاعدہ ائمہ وقضاۃ مقرر تھے۔

اس باب میں مسلمانوں کی آمد تاریخ اور ان کی اہم آبادیوں کے مفصل حالات لکھے گئے ہیں ان میں مالدیپ، سراندیپ، ملیبار، کولم (ٹرانکور) کارومنڈل، صیمور (چیمبور)، تھانہ (بمبئی)، کھمبایت، گاری گندھار (بھروچ کے قریب)، بیرم، گوگہ (بھاؤنگر کے پاس)، چندابور (گوا کے قریب)، ہنور (احاطہ بمبئی)، ملیبار میں ابی سرور باکنور (موجودہ برکور)،

منگلور، ہیلی (کناکور کے قریب)، جرپٹن (سری کنداپورم)، دہ پٹن، بدھ پٹن، کالی کٹ، جالیات، سیلون، گاڑی، دوا سمندر (میسور کا قدیم دارالسلطنت) وغیرہ خاص قابل ذکر ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی آمد، ان کی نظام معاشرت اور ہندوؤں سے ان کے تعلقات کی تمام تفصیلات نہایت تحقیق سے قلمبند کی گئی ہیں۔

باب کے آخر میں سندھ و ملتان کے مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ لکھی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ سے پہلے بھی یہاں کئی سو مسلمان آباد تھے۔

دولت عباسیہ کے ابتدائی ادوار تک سندھ میں مسلمانوں کی تاریخ واضح انداز میں ملتی ہے مگر اس کے بعد وہاں کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ غیر واضح ہے۔ غزنویوں اور غوریوں سے پہلے یہاں کئی دوسرے مسلمان خانوادوں نے حکمرانی کی بلکہ ایک ایک وقت میں دو دو حکومتیں قائم رہیں۔ سید صاحب نے ان خانوادوں کے حالات نہایت تلاش و تفحص کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ کے بعض اہم شہروں کے مختلف قسم کے حالات بھی لکھے گئے ہیں اور بعض قدیم شہروں کے جائے وقوع کی تعیین بھی کی گئی ہے جن کے نام اب صرف تاریخوں میں ملتے ہیں۔

آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں سید صاحب نے نئی معلومات پیش کی ہیں اس میں ایک مسلمان آبادی سوپارہ، جاٹ طبیب اور سندھ کے شاہانہ جوتوں کا تذکرہ ہے۔

یہ پوری کتاب انگریزوں کے اس الزام کی کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ اور حملہ آورانہ تھا تردید معلوم ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب سے یہ پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملہ سے بہت پہلے ہندوستان سے ان کے علمی، تجارتی، مذہبی وغیرہ متنوع تعلقات و روابط قائم تھے۔

یہ کتاب سید صاحب کی بیس سال کی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے۔ اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں تھی۔ آج گو اس موضوع پر بڑا لٹریچر تیار ہوگیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب بھی اس کی انفرادیت واہمیت قائم ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں جو کچھ لکھا تھا اس کی تائید حال میں دریافت ہوئے (GENIZA RECARDS) سے بھی ہوتی ہے۔(۱)

۱- مطالعہ سلیمانی ص ۵۹۔

اصول تاریخ کے تناظر میں

یہاں عرب وہند کے تعلقات کا علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا ہے کیونکہ سید صاحب اسی نظریہ کے متبع و پیرو تھے۔

۱- یہ کتاب کسی عہد کی مسلسل تاریخ نہیں ہے اس کے باوجود ہندوستان سے عربوں کے ابتدائی تعلقات کی تاریخ کے ساتھ تجارتی، علمی اور مذہبی اور سیاسی ہر طرح کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے ضمناً تہذیب و تمدن، ثقافت اور طرز معاشرت کا بھی اجمالی ذکر ہے ڈاکٹر عبدالباری نے لکھا ہے کہ:

> ''عرب وہند کے تعلقات کلچرل روابط کے مخصوص فن پر ایک ایسی تفصیلی اور تحقیقی اسلام کی پہلی باضابطہ تمدنی تاریخ ہے جس کی نظیر ہمیں خود اسلامی تاریخ نویسی میں کہیں نہیں ملتی''۔(۱)

۲- حقائق بیان کرنے میں بڑی صداقت و صراحت سے کام لیا گیا ہے اور اصل واقعہ کی چھان بین کرنے اور اس کی روح تک رسائی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے واقعات نقل کرنے میں روایت و درایت کے اصولوں سے بھی پوری طرح کام لیا گیا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب میں سید صاحب روایت کے ساتھ درایت کے اصول پر بھی سختی سے پابند رہے ہیں۔ وہ جب تک کسی روایت کو اچھی طرح پرکھ نہ لیتے اس کو قبول نہ کرتے ... عرب وہند کے تعلقات میں ان کی درایت کی بہت سی مثالیں ملیں گی''۔(۲)

۳- واقعات کے اسباب کی تفتیش کو علامہ شبلی نے ایک مورخ کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ سید صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اس اصول تاریخ سے بھی کام لیا ہے، یہاں طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

محمد بن قاسم ثقفی نے صرف چند ہزار فوج کی مدد سے سندھ پر حملہ کیا اور ہندوستانی راجاؤں کی بہادری و دلیری کی روایت کے باوجود پہلے ہی حملہ میں وہ سندھ پر قابض ہو گیا۔ سید صاحب نے اس کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ جب مسلمان سندھ کی سرحد پر تھے اس

۱- مطالعہ سلیمانی ص ۱۵۸-۱۵۹۔

۲- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۳۱۹۔

وقت بدھوں اور برہمنوں کے درمیان جنگ تھی، بدھوں نے خود کو برہمنوں کے مقابلہ میں بے دست وپاپاکر مسلمانوں کی طرف صلح ومحبت کا ہاتھ بڑھایا اور ہر جگہ ان کا شاندار استقبال کیا اور ساتھ بھی دیا اس لیے پہلے ہی حملہ میں سندھ پر قبضہ ہو گیا۔(۱)

۴-واقعات میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے مورخ کو قیاس سے کام لینا ہوتا ہے تاکہ تاریخ کو مربوط ومنظم انداز میں پیش کیا جائے۔ سید صاحب نے قیاس واجتہاد سے بھی کام لیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کتاب اصلاً قیاس واجتہاد کی ہی متقاضی تھی ورنہ بہت سے واقعات بے ربط معلوم ہوتے اور اس عہد کی تاریخ اتنی وضاحت وترتیب سے سامنے نہ آپاتی۔

۵-واقعات کا تعلق جن فنون سے ہو مورخ کو اس کا واقف کار ہونا چاہیے ورنہ وہ واقعہ کی روح تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا ہے۔ سید صاحب ان فنون سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے جو واقعات لکھے ہیں ان میں بڑی باریک بینی کے ساتھ ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

۶-اس کتاب میں سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مورخانہ غیر جانبداری صاف عیاں ہے۔ جہاں انھوں نے اسلام سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہیں ہندوستان سے اپنی وطنی محبت کے اظہار میں کمی نہیں آنے دی ہے۔اس طرح پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد کہیں یہ تاثر قائم نہیں ہوتا کہ سید صاحب نے طرفداری کو راہ دی ہو۔

۷-کتاب کے اسلوب نگارش کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ قطعی مورخانہ ہے تحصیل حاصل ہے۔اس میں کہیں بھی انشاپردازانہ اسلوب سے کام نہیں لیا ہے اور نہ بیجا لفاظی سے کام لیا بلکہ ہر لفظ کو شعوری طور پر استعمال کیا گیا ہے جس سے سید صاحب کے انتخاب الفاظ کی بے مثال صلاحیت بھی آشکارا ہوتی ہے۔

سید صاحب نے ماخذ ومراجع کی نشاندہی میں بھی غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔ جن مراجع سے اخذ معلومات کیے گئے ہیں یا جن کا حوالہ دیا گیا ہے اگر ان کی فہرست نقل کی جائے تو ایک مضمون تیار ہو سکتا ہے۔

غرض یہ کہ پوری کتاب اصول تاریخ کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔

۱-عرب وہند کے تعلقات ص۲۱-۲۳۔

انگریز مورخین کا ردّ وابطال

انگریز مورخین کے ہفوات کا ردّ و ابطال دبستان شبلی کے مورخین کا ایک اہم وصف ہے۔ سید صاحب اس دبستان کے گل سر سبد تھے چنانچہ انھوں نے اپنی دوسری تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی انگریز مورخوں کے غلط خیالات کی تردید کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

مثلاً سید صاحب نے پوری تحقیق کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ تاریخ کے مشاہدات سے پہلے ہی ہندوستان میں عربوں کی آمد ورفت جاری تھی(۱)، اور مسلمانوں کے حملہ سے کہیں پہلے ہندوستان سے ان کے تجارتی، علمی، مذہبی اور سیاسی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔

ہندوؤں کے بارے میں مشہور مورخ الفنسٹن نے لکھا کہ انھوں نے کسی سمندر کو پار کرنے کی ہمت نہیں کی(۲)۔ سید صاحب نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ ہندوؤں میں ایک ایسی ذات تھی جو جہاز بناتی، چلاتی، کھیتی اور دریاؤں کو پار کرتی تھی(۳)۔

اس طرح کے انگریزوں کے اور بھی متعدد غلط بیانات کی جابجا تردید سید صاحب نے کی ہے۔ ضمناً ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے اور ان میں نفرت و عداوت اور نفاق پیدا کرنے کے لیے تاریخ میں جس انداز کو روا رکھا گیا ان سب کی سید صاحب نے تردید کی اور اپنی تحریر کو اس انداز سے پیش کیا کہ اس کے صفحہ صفحہ سے قومی یکجہتی، اتحاد، موانست اور وطن دوستی کے جذبات جھلکتے ہیں۔

عربوں کی جہاز رانی

یہ کتاب سید صاحب کے ان تاریخی خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے حکومت بمبئی کے محکمہ تعلیم کی فرمائش پر انجمن اسلام بمبئی میں ۱۸-۲۱ر مارچ ۱۹۳۰ء میں دیئے تھے جسے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے ۱۹۲۵ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس میں عربوں کی جہاز رانی کی ابتدا اور ارتقا، ان کی بحری ایجادات واختراعات، بحری تصنیفات اور تمام بحری سرگرمیوں کے عروج وزوال کی تاریخ نہایت تحقیق و تدقیق سے قلمبند کی گئی ہے۔

۱-عرب وہند کے تعلقات ص ۷۔ ۲-ایضاً ص ۸۲۔ ۳-ایضاً ص ۸۳۔

یہ کتاب موضوع کی انفرادیت اور بلند پایہ تحقیق و دیدہ ریزی کا نمونہ ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ اسی زمانہ میں بعض اخبارات نے پوری کتاب قسط وار شائع کیا، ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ یہ ان خوش نصیب کتابوں میں ایک ہے جسے متخصصین اور عوام دونوں نے پسند کیا۔(۱)

کتاب کی ابتداء ایک مختصر سی تمہید سے ہوئی ہے جس میں موضوع کی اہمیت، افادیت اور جہاز رانی سے عربوں کی دلچسپی کے اسباب لکھے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ "عرب چونکہ تین طرف سے دریاؤں سے گھرا ہے، چند ساحلی صوبوں کو چھوڑ کر عرب ایک خشک بے آب و گیاہ اور بنجر ملک ہے اس لیے وہاں کے باشندے فطری طور پر تجارت پیشہ بننے پر مجبور ہوئے(۲)، اور تجارتی اسفار نے انھیں بحری معلومات ایجادات اور اختراعات سے ہمکنار کیا اور وہ دنیا کے بہترین جہاز راں اور دریا پیما قوم ہوئے۔ سید صاحب عربوں کی بحری سرگرمیوں کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کو اس فن میں اسلام سے پہلے بھی درک تھا اسلام نے آکر جہاں ان کے ہر قسم کے قویٰ کو نشو و نما اور ترقی بخشی وہیں ان کی بحری جرأت و ہمت کو بھی بڑھایا اور اپنے پرچم کے زیر سایہ ان کو دنیا کے تمام گوشوں میں پہنچادیا"۔(۳)

اس کے بعد سید صاحب نے عہد جاہلیت میں عربوں کی بحری دلچسپیوں کی مثالیں تلاش کی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لغات عرب، اشعار جاہلیت اور قرآن مجید سے دلائل و شواہد فراہم کیے ہیں:

لغات عرب سے دریا، سمندر، کشتی، جہاز راں، جہاز رانی اور بندرگاہوں سے متعلق سیکڑوں الفاظ نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ "اگر ان الفاظ پر غور کیا جائے تو عربوں کی جہاز رانی، اس کی ترقی، اس کی وسعت اور اس کے ذریعہ مختلف قوموں سے ان کے میل جول اور اختلاط کی پوری تاریخ مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے اور یہ الفاظ پتہ دیتے ہیں کہ عربوں کو اسلام کے پہلے بھی جہاز رانی سے شغف تھا۔(۴)

اس کے بعد جاہلی شعراء کے کلام سے استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ عربوں کی

۱- عربوں کی جہاز رانی ص ۲۰۳۔ ۲- ایضاً ص ۱۔ ۳- ایضاً ص ۳۔ ۴- ایضاً ص ۱۸-۱۹

اسلام سے پہلے کی تاریخ کا واحد اور تنہا ذریعہ ان کے اشعار ہیں(۱)۔ اس لیے انھوں نے جاہلی شعراء کے کلام میں بحری تلمیحات، تمثیلات اور استعارات کی مثالیں پیش کر کے ان سے عربوں کی بحری واقفیت پر استدلال کیا ہے۔ آخر میں قرآن مجید کی آیات سے استدلال کیا ہے جو عربوں کی قبل از اسلام تاریخ کا سب سے زیادہ معیاری مآخذ ہے۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ بحریات سے متعلق قرآن مجید میں اس قدر تفصیلات ہیں جن کا یہاں سمیٹنا مشکل ہے پھر انھوں نے قرآن مجید کی اٹھائیس آیات پیش کر کے ان سے ثابت کیا ہے کہ عرب قبل از اسلام جہاز رانی سے بخوبی واقف تھے۔

اس کے بعد عہد رسالت، خلفائے راشدین، بنوامیہ، بنو عباس، فاطمین مصر اور اندلسی بنوامیہ کے ادوار میں جو بحری ترقیات ہوئیں اور عرب جہاز راں جس اوج کمال پر پہنچے اس کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اس فن پر باقاعدہ توجہ دی گئی، ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو جہازوں کے ساتھ سواحل شام پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے اپنے بحری بیڑے کی مدد سے اس کو پسپا کر دیا۔(۲)

بنوامیہ کے دور میں اس فن نے مزید ترقی کی اس عہد میں جہاز رانی کا از سر نو جائزہ لیا گیا اور اسے ترقی دینے کی کوشش کی گئی بحری بیڑوں ہی کی مدد سے بحر روم کے جزیرے سسلی اور اسپین وغیرہ کو فتح کیا گیا۔ اسی دور میں تجارتی جہاز لوٹنے کی پاداش میں سندھ پر مسلمان حملہ آور ہوئے اور اسے فتح کیا۔ اس طرح کی بعض اور دوسری بحری جنگوں کی تفصیلات میں سید صاحب نے لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ عہد بنوامیہ میں عربوں کی جہاز رانی عروج پر تھی۔

اس کے بعد بعض دوسرے عہد کی بحری سرگرمیوں کا ذکر ہے ان مباحث میں ضمناً عربوں کی بحری معلومات واختراعات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ان کی دریاؤں، سمندروں اور ان کے راستوں سے واقفیت، سمندروں کی پیمائش، نشان میل اور متعدد بندرگاہوں کا بھی ذکر ہے ان میں بصرہ، سیراف، عدن، صحار، شحر، قیس، بحرین، ہرمز، جدہ، جادہ، ایلہ، غافقہ اور عیذاب وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔ بعض دوسرے ملکوں کی بندرگاہوں کا بھی ذکر ہے جن تک عربوں کی رسائی تھی اور جہاں عربوں کے تجارتی بیڑے آمدورفت رکھتے تھے۔ اس میں

۱- عربوں کی جہاز رانی ص ۳۱۔ ۲- ایضاً ص ۴۹۔

ہندوستان، افریقہ، روم، سسلی اور اندلس کے بندرگاہ اشبیلہ، دانیہ اور دہران وغیرہ کا بھی بیان ہے، غرض عربوں کی جہازرانی کی ابتداء سے لے کر دسویں صدی ہجری تک عربوں کی جہازرانی کی پوری تاریخ، عہد بہ عہد ارتقاء اور ان کی جہازرانی کی خصوصیات وامتیازات کو مستند مآخذ سے قلمبند کیا گیا ہے۔

ایک باب میں جہازرانی کے آلات اور ساز وسامان کی تفصیلات ہیں ان میں جہاز کے ساتھ بحری نقشوں، لائٹ ہاؤس، صور کواکب، قطب نما اور بعض دوسرے فلکی آلات کی ایجاد و ترقی ان کی شکل و ہیئت اور ان کے طریقہ استعمال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاز، جہاز سازوں اور متعدد جہازرانوں کا تعارف اور ان کے مختصر حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ اسی باب میں عربوں کی جہازرانی کے تنزل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ جب دوسری قوموں نے اس فن سے دلچسپی لی اور ترقی کی تو اپنے اپنے علاقوں پر انھوں نے اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیا اور عربوں کی جہازرانی کا آہستہ آہستہ خاتمہ ہوگیا۔

آخری باب عربوں کی بحری تصنیفات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں یہ فن سینہ بہ سینہ موروثی تھا، نویں صدی ہجری سے پہلے اس فن میں کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ سید صاحب نے اس فن کی ابتدائی تحریریں ان نقشہ جات کو قرار دیا ہے جو عرب جہازرانوں نے ستاروں کی شناخت، ہواؤں کی دریافت، ساحلی ممالک اور جزیروں سے واقفیت اور سواحل کے طول و عرض و بلد اور سمندروں کی پیمائش کے متعلق تیار کیے تھے۔ نویں صدی ہجری میں اس فن کو مدون کرنے کی کوشش کی گئی اسد البحرین ابن ماجد پہلا شخص ہے جس نے اس فن سے متعلق نظم و نثر میں تقریباً پچیس کتابیں تصنیف کیں۔ سید صاحب نے اس کی ۱۶ کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ ایک دوسرے مصنف سلیمان مہری کی چار کتابوں کا بھی تعارف ہے۔ ان تعارفی مباحث سے عربوں کی بحری ترقی کی تاریخ کے بعض پہلو سامنے آجاتے ہیں اس سلسلہ کی بعض دوسری کتابوں کا بھی ذکر ہے۔

عرب وامریکہ

کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا دو ضمیموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلا ضمیمہ سید صاحب کا ایک مضمون عرب وامریکہ ہے یہ دراصل اسی کتاب کا حصہ تھا جو

طباعت کے وقت بعض تحقیقات کے تشنہ رہ جانے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا تھا۔ اس میں امریکہ کی دریافت اور عربوں سے اس کے روابط پر بحث کی گئی ہے، عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو ۱۴۹۸ء میں کولمبس نے دریافت کر کے پرانی دنیا کو نئی دنیا سے متعارف کرایا مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا پر پرانی دنیا کے کسی شخص کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ سید صاحب نے قدیم و جدید تحقیقات اور بعض سیاحوں کے بیانات اور جدید مورخین کے آراء و خیالات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے پہلے افریقی عرب وہاں پہنچ چکے تھے اور آج بھی وہاں ان کی آبادیاں موجود ہیں جن کا علم خود امریکہ کو بھی بہت بعد میں ہوا۔(۱)

ڈاکٹر حمید اللہ کا استدراک

دوسرا ضمیمہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا وہ استدراک ہے جو انھوں نے پہلے ایڈیشن پر لکھا تھا جسے پہلے معارف میں سید صاحب نے شائع کیا(۲)۔ اس میں انھوں نے بعض مفید مشورے دیئے ہیں کچھ کتابوں کی نشاندہی اور بعض غلط فہمیوں کی طرف سید صاحب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثلاً سید صاحب نے داری کے معنی ملاح کے بتائے تھے(۳)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ کیا اس سے حضرت تمیم الداری کو قبیلہ بنی الدار کی نسبت کے بجائے بحری سفروں کی وجہ سے ملقب سمجھا جائے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے مزید تحقیق کا مشورہ دیا ہے اور علامہ مقریزی کے ایک رسالہ کی نشاندہی کی ہے جو اسی موضوع پر ہے۔

سید صاحب نے عربوں کی بحری دلچسپی کے شواہد لغات عرب سے پیش کیے ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں ان لغات کی بھی ورق گردانی ہونی چاہیے تھی جن میں فن وار الفاظ جمع کیے گئے ہیں اس سلسلہ میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بعض لغات اور رسائل کی نشاندہی کی ہے۔

سید صاحب نے عربوں کی بحری سرگرمیوں پر لغات عرب اشعار جاہلیت اور قرآن مجید سے استدلال کیا تھا مگر احادیث سے مطلق تعرض نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں حدیث کے وسیع ادب کو ہاتھ لگائے بغیر چھوڑ دینا کم از کم طالب علمانہ احتیاط کے خلاف ہے اس سے متعدد شواہد و ثبوت پیش کیے جا سکتے تھے جس سے عربوں کی بحری شغف و انہماک اور ان کی مہارت کی مزید وضاحت ہو جاتی۔

۱- عربوں کا جہاز رانی ص ۱۶۴-۲۰۲۔ ۲- معارف ج ۷ ۳ شمارہ ۵-۶۔ ۳- عربوں کی جہاز رانی ص ۸۔

عربوں کی جہاز رانی میں لغات عرب سے صرف الفاظ نقل کر کے شواہد پیش کیے گئے تھے ڈاکٹر صاحب نے اسے سرسری قرار دیتے ہوئے بعض دوسری تصانیف سے جو سید صاحب کے مطالعہ میں نہ آسکی تھیں بعض اور الفاظ نقل کر کے ان کے معانی اور اس سے عربوں کی بحری دلچسپی پر روشنی ڈالی ہے اور کتابیات کی کمی پر اظہار افسوس کیا ہے۔

عربوں کی جہاز رانی اور نظریہ تاریخ

سید صاحب نے جب یہ کتاب لکھی تھی اس وقت اس موضوع پر اور کوئی مستقل تصنیف نہ تھی۔ سید صاحب نے جو کچھ لکھا تھا وہ ان کے وسیع مطالعہ و معلومات اور انتہائی تلاش و تحقیق کا نتیجہ تھا اور چونکہ بہت کم وقت میں انھوں نے حکومت بمبئی کے محکمہ تعلیم کی فرمائش پوری کی تھی اس لیے بعض تحقیقات تشنہ رہ گئی تھیں۔ اس کے باوجود یہ نظریہ تاریخ کی رو سے سید صاحب کی گرانمایہ تصنیف ہے اس سے مسلمانوں کا ایک تمدنی پہلو پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

تحقیق کا کارواں پیہم سرگرم سفر ہے اس لیے آج ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی جائے اور جدید ماخذ و تحقیقات سے مسلمانوں کی تاریخ کے اس تمدنی پہلو کو اور واضح کیا جائے۔ یہاں "عربوں کی جہاز رانی" کا نظریہ تاریخ کی روشنی میں ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ سید صاحب نے اس تصنیف میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا اور اس راہ میں کس دیدہ ریزی اور دقیقہ رسی سے کام لیا۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ عیاں ہے کہ سید صاحب نے قدیم و جدید مآخذ و مصادر سے مکمل استفادہ کیا اور اصل ماخذ کے علاوہ دوسرے ذرائع و مصادر سے بھی استفادہ کیا جن تک شاید کسی اور محقق کی نظر نہ پڑتی۔ انھوں نے واقعات کی صحت و صداقت کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور اس سلسلہ میں روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں سے خاص طور سے کام لیا۔

قیاس و تخمین سے سلسلہ معلومات پیدا کر کے مفید نتائج مستنبط کیے اور مسلمانوں کی تاریخ کے اس پہلو کو محسوس صورت میں پیش کیا۔

پوری کتاب مورخانہ اسلوب میں لکھی گئی ہے اور انشاء پردازی، لفاظی اور الفاظ کے بیجا استعمال سے گریز کیا گیا ہے۔ یہ ان کی تاریخ نویسی کا بڑا وصف ہے کہ انھوں نے تاریخ اور

ادب کی حدوں کا فرق ہمیشہ ملحوظ رکھا، سند اور حوالہ کا بھی خاص اہتمام کیا اور جو باتیں لکھیں ان کا حوالہ معتبر و مستند ماخذوں سے دیا اور کوئی بھی پہلو بغیر مستند حوالہ کے پیش نہیں کیا عربوں کی جہاز رانی میں بھی یہ خوبیاں پوری طرح پائی جاتی ہیں۔

عام طور پر سید صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، اس کتاب میں بھی انھوں نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مغربی مورخین کے بعض بے سروپا خیالات کی تردید بھی کی ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سید صاحب کی یہ تصنیف اپنے موضوع پر اردو میں سب سے معیاری اور بلند پایہ تصنیف ہے۔

غیر تاریخی تصانیف میں تاریخ کے عناصر

سید صاحب نے خالص تاریخی تصانیف کے علاوہ دیگر جن موضوعات پر تصنیفات و مضامین سپرد قلم کیے ہیں ان میں جابجا تاریخ نویسی کے عناصر موجود ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''ان کو مورخانہ فکر و نظر کا جو عطیہ قدرت الٰہی کی طرف سے ملا تھا اس کی بدولت تاریخ کے علاوہ جو چیز بھی لکھتے اس میں مورخانہ تجسس کے ساتھ مورخانہ تجزیہ کا رنگ خود بخود پیدا ہو جاتا تھا جس سے ان کی کتابوں اور تحریروں میں ایک امتیازی شان پیدا ہو جاتی تھی''۔(۱)

یہاں ان کی غیر تاریخی تصانیف میں اسی مورخانہ تجسس، تجزیہ نگاری اور تاریخی پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

حیات امام مالکؒ

سید صاحب نے ۱۹۰۷ء میں ماہنامہ الندوہ میں مشہور محدث امام مالکؒ کے احوال اور علمی مرتبت پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ زیر نظر کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے جسے سید صاحب نے دارالمصنفین سے اگست ۱۹۱۷ء میں اضافوں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔

۱- مقالات سلیمان ج ۱ مقدمہ ص ۳۔

اس میں امام مالکؒ کے نام و نسب، خاندان، ولادت و وطن، اخذ و استفادہ، شیوخ، درس و تدریس، مجلس درس، افتاء، تلامذہ اور وفات تک کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں نیز ان کے فضل و کمال اور علوئے مرتبہ کا ذکر اور ان کی تصانیف خصوصاً مؤطا پر بحث و تحقیق کی گئی ہے البتہ اجتہادات امام مالکؒ کا حصہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے رہ گیا۔

یہ کتاب گو مکمل و مبسوط سوانح کے درجہ میں نہیں ہے لیکن اختصار کے باوجود اس میں جامعیت ہے۔ ہم اس کو علامہ شبلی کی تصانیف الغزالی اور سوانح مولانا روم کے سلسلہ کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں۔ کہیں کہیں تو علامہ شبلی کے تتبع کا رنگ صاف غالب نظر آتا ہے، مثلاً امام مالکؒ کی وفات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''گریہ جاری تھا، لب متحرک تھے کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اب بھی اسی طرح ارد گرد طلبہ و علماء کا ہجوم تھا لیکن صدر نشین بزم اب حیات جاوید کے بستر پر آرام کر رہا تھا''۔(۱)

اس کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو علم حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی موطاء سے بدرجہ غایت عقیدت رہی ہے۔ اسی کا اثر تھا جس نے مجھے اس فرض کے انجام دینے پر آمادہ کیا''(۲)

کتاب کا مقصد تالیف سید صاحب کے نزدیک علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ملک میں تاریخ کا مذاق کسی قدر پیدا ہو گیا ہے مسلمانوں کی بے راہ روی دور کرنے اور انھیں اسلامی علوم سے واقف کرانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اس ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی جائے''۔(۳)

اس طرح اس سوانحی کتاب میں تاریخ کا حصہ خود مصنف کے پیش نظر رہا جس سے اس عہد کی علمی و تعلیمی حالت کا اندازہ ہوتا ہے اور بعض دیگر جزئیات تاریخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب اگر حسب منشاء مکمل ہو جاتی تو تاریخی سوانح عمریوں میں ایک گرانقدر اضافہ

۱-حیات مالک ص ۸۱۔ ۲-ایضاً دیباچہ۔ ۳-ایضاً

ہوتا، گو موجودہ شکل میں بھی اس کی افادیت کم نہیں۔

دراصل حیات مالکؒ سید صاحب کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے اس کے بارے میں انھوں نے علامہ شبلی سے بھی مشورہ کیا مگر علامہ شبلی اس کی تالیف کے حق میں نہ تھے۔ سید صاحب نے حیات مالکؒ کے متعلق ابتداء میں ایک خط کے ذریعہ علامہ شبلی کو مطلع کیا تو انھوں نے لکھا کہ:

"تم نے شروع کر دیا خیر، ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے۔ مجھے اس شخص کے سامنے رازی و غزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں"۔(۱)

اور غالباً اس رائے نے سید صاحب کو متاثر کیا اور کتاب نامکمل رہی۔ سید صاحب نے اگرچہ اس کے نامکمل رہ جانے کے اسباب اپنی دوسری مصروفیات اور استاذ کی وفات اور سیرت کی تالیف بتایا ہے مگر علامہ شبلی کا مذکورہ خط بھی اس کا ایک سبب ہو سکتا ہے کہ سید صاحب علامہ شبلی کی ایک ایک ادا پر جان دیتے تھے۔

سیرت عائشہؓ

سید صاحب کی یہ کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی اس کی ابتداء بھی انھوں نے زمانہ طالبعلمی میں کی تھی اس کے لیے علامہ شبلی نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی برابر مفید مشورے دیتے رہے اور بعض کتابیں بھی بہم پہنچائیں(۲)۔ مگر یہ کتاب علامہ مرحوم کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی ان کی وفات کے بعد احباب کے تقاضوں اور بیگم صاحبہ بھوپال کی خواہش پر سید صاحب نے اسے مکمل کیا۔

سیرت عائشہؓ کی تصنیف میں خود سید صاحب کے شوق و عقیدت کا بھی دخل ہے انھوں نے لکھا ہے کہ:

"سیرت عائشہؓ کا آغاز گو مصنف نے صرف اپنے شوق سے کیا تھا لیکن الحمد للہ کہ اس کا انجام اس کے آغاز سے بہتر ہوا"۔(۳)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس سوانح حیات میں ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، نکاح، رخصتی، ازدواجی زندگی، خانہ داری، سوکنوں کے ساتھ برتاؤ، واقعہ افک، تحریم، ایلاء، تخییر، بیوگی اور وفات کے حالات و واقعات نیز ان کے اخلاق و عادات، علم و اجتہاد،

۱- مکاتیب شبلی ج ا، ص ۱۹۳۔ ۲- مکاتیب شبلی ج ۲ خط نمبر ۴۱-۵۸، ۷۰ تا ۷۳۔ ۳- مقدمہ سیرت عائشہؓ ص ۱۵۔

فضل و کمال اور حدیث و فقہ و قیاس، کلام و عقائد، اسرار دین، طب، تاریخ، ادب و شاعری، تعلیم، افتاء اور ارشادات وغیرہ کی تفصیلات اس طرح قلمبند کی گئی ہیں کہ ان کی زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ آخر میں صنف نازک پر ان کے احسانات کی نشاندہی اور طبقہ نسواں میں ان کے مقام و مرتبہ کی تعیین کی گئی ہے۔ دنیا کی مشہور ترین خواتین اور ان کے اسباب شہرت بیان کرنے کے بعد حضرت عائشہؓ کے بارے میں سید صاحب رقمطراز ہیں:

> "صدیقہ کبریٰ کے سوا دنیا کی کون خاتون ہے جس نے مذہب، اخلاق اور تقدس کے ساتھ مذہبی، علمی، سیاسی، معاشرتی غرض گوناگوں فرائض انجام دیئے ہوں اور جس نے اپنی زندگی کے کارناموں سے خدا پرستی کے نمونوں سے، اخلاق کی عملی مثالوں سے روحانیت کی پاک تعلیموں سے اور کسی دین و شریعت اور قانون کی تعلیم و تشریح سے دنیا کی کروڑوں عورتوں کے لیے ایک کامل زندگی اور گراں بہا عملی نمونہ چھوڑا ہو اور جس نے اس عظیم الشان تعداد انسانی کو اپنے مذہبی، اجتماعی اور علمی احسانات سے گراں بار کیا ہو"۔(۱)

سیرت عائشہؓ کا مقصد تصنیف اصلاح و تربیت ہے۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا ایک بڑا سبب عورت ہے۔ وہم پرستی، قبر پرستی، جاہلانہ مراسم، مسرفانہ مصارف اور جاہلیت کے دوسرے آثار مسلمانوں کے گھروں میں صرف اس لیے نظر آتے ہیں کہ ان کی خواتین اسلامی تعلیمات سے ناآشنا ہیں اور اس کا سبب سید صاحب کے الفاظ میں "یہ ہے کہ ان کے سامنے ایک مسلمان عورت کی زندگی کا کوئی مکمل نمونہ نہیں" چنانچہ سید صاحب نے عورتوں کی اصلاح اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو انحطاط سے بچانے کے لیے ایک ایسی خاتون کی سوانح لکھی جو نبوت عظمٰی کی نہ سالہ مشارکت زندگی کی بنا پر خواتین خیر القرون کے حرم میں کم و بیش ۴۰ برس تک شمع ہدایت رہی۔(۲)

سیرت عائشہؓ میں ایک عورت کو اپنی زندگی کے بہتر بنانے کا ہر اسوہ موجود ہے اور اس کی زندگی میں جو بھی موڑ آسکتے ہیں حضرت عائشہؓ نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ سید صاحب رقمطراز ہیں:

۱- سیرت عائشہؓ ص ۲۹۹۔ ۲- ایضاً ص ۱۲-۱۳

"ایک مسلمان عورت کے لیے سیرت عائشہؓ میں اس کی زندگی کے تمام تغیرات، انقلابات اور مصائب، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر، سوکن، لاولدی، بیوگی، غربت، خانہ داری، رشک وحسد غرض اس کے ہر موقع اور ہر حالت کے لیے تقلید کے قابل نمونے موجود ہیں۔ پھر علمی، عملی، اخلاقی ہر قسم کے گوہر گرانمایہ سے یہ پاک زندگی مالا مال ہے اس لیے سیرت عائشہؓ اس کے لیے آئینۂ خانہ ہے جس میں صاف طور سے یہ نظر آئے گا کہ ایک مسلمان عورت کی حقیقی تصویر کیا ہے"۔(۱)

سیرت عائشہؓ دراصل حضرت عائشہؓ کی محض سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس عہد کی ایک تاریخ بھی ہے۔ اس عہد کے بہت سے اہم علمی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی حالات وواقعات کا ذکر بھی اس میں آ گیا ہے مثلاً حضرت عائشہؓ کی مذہبی زندگی دراصل اس عہد کی مذہبی تصویر ہے۔ اسی طرح ان کی معاشرتی زندگی اور ان کے اخلاق وعادات سے اس عہد کی معاشرت اور طرز زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دعوت واصلاح، علم واجتہاد، احادیث کی نشر واشاعت، درس وتدریس، فقہ وقیاس، کلام وعقائد کے مباحث، دین کے رموز واسرار کی تشریح وتعبیر، افتاء وارشادات اور طب وتاریخ اور ادب وشاعری سے دلچسپی وغیرہ کے مباحث سے اس عہد کی علمی وتمدنی اور تہذیبی تاریخ نمایاں ہوتی ہے اور بعض سیاسی واقعات مثلاً واقعہ افک اور جنگ جمل وغیرہ سے اس عہد کی سیاسی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے غرض یہ کہ سیرت عائشہؓ سوانح کے ساتھ تاریخ اسلام کا ایک حصہ ہے۔

سید صاحب کا خیال تھا کہ سوانح کے لیے سب سے زیادہ کار آمد ماخذ تاریخ کی کتابیں ہوتی ہیں مگر اس کتاب کا بنیادی ماخذ کتب احادیث ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"سوانح عمریوں کے لیے عموماً تاریخ کی کتابیں کار آمد ہوتی ہیں لیکن اس وقت جس زمانہ کے واقعات لکھنا ہیں اس کی تاریخ صرف حدیث کی کتابیں ہیں۔ یہ تمام ذخیرہ درحقیقت جناب سرور کائنات ﷺ امہات المومنین اور اصحاب کبار کی مقدس زندگیوں کی عملی تاریخ ہے، اس بناء پر میرے معلومات کا ماخذ صرف احادیث کی کتابیں ہیں"۔(۲)

۱- سیرت عائشہؓ ص ۱۲-۱۳۔ ۲- ایضاً۔

سید صاحب کا اسلوب نگارش بھی پوری طرح مورخانہ ہے روایت و درایت کے اصولوں کے مطابق صحت و صداقت کا ہر ممکن پاس و لحاظ رکھا گیا ہے(۱)۔ واقعات کے اسباب و علل کی بھی تلاش و جستجو کی گئی ہے اور قیاس و اجتہاد سے واقعات میں تسلسل بھی پیدا کیا گیا ہے۔ استناد و حوالہ کا بھی پوری طرح اہتمام کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب سید صاحب کے مورخانہ شعور و آگہی کا بہترین نمونہ ہو گئی ہے۔

سوانح میں صاحب سوانح کے دونوں رُخوں (محاسن و معائب) کو پیش کرنا اہل مغرب نے ضروری قرار دیا ہے اس اصول کو مقدس اشخاص کی سوانح میں بروئے کار لانا آسان نہیں، سید صاحب اس پل صراط سے بھی بخوبی گذر گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی بعض ایسی اجتہادی غلطیوں کی نشاندہی جس پر خود حضرت عائشہؓ نادم تھیں انھوں نے جس طرح کی ہے وہ احتیاط و توازن کا بہترین نمونہ ہے۔(۲)

حسب معمول مغربی مورخین اور اہل قلم کے ان بے بنیاد اعتراضات کی بھی تردید کر دی گئی ہے جو انھوں نے حضرت عائشہؓ کے بعض اوراق زندگی پر وارد کیے تھے(۳)۔ غرض یہ کہ سید صاحب نے فن سوانح نگاری کے ہر جزئیہ کا پاس و لحاظ رکھا ہے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ جہاں تک سوانح نگاری کے فن کا تعلق ہے اس کے معیار پر یہ پوری اترتی ہے۔(۴)

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی اور امتیاز یہ بھی ہے کہ اردو زبان میں کسی خاتون کی یہ پہلی سوانح عمری ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کو یہ کتاب خاص طور پر پسند آئی انھوں نے سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

> "سیرت عائشہؓ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمہ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا"۔(۵)

سیرت عائشہؓ دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب ہے اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن طبع ہو کر نکل چکے ہیں۔ جناب اطہر علی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا جسے دارالمصنفین ہی نے شائع کیا ہے۔

۱- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۱۴۶-۱۴۷۔ ۲- سیرت عائشہؓ ص ۴۳۔
۳- ایضاً ص ۹۴ وغیرہ۔ ۴- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۱۴۷۔
۵- مشاہیر کے خطوط ص ۱۱۲۔

خطبات مدراس

یہ کتاب سید صاحب کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف دی سودرن انڈیا کی فرمائش پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق انگریزی اسکولوں کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے لالی ہال مدراس میں دیئے تھے۔ اس سلسلہ میں سید صاحب لکھتے ہے:

> "مدراس میں کچھ برسوں سے ایک امریکن عیسائی کی فیاضی سے مدراس یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے کوئی نہ کوئی ممتاز عیسائی فاضل حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و سوانح اور مسیحی مذہب کے متعلق چند عالمانہ خطبات دیتا ہے۔ یہ خطبے سال بہ سال ہوتے ہیں اور نہایت دلچسپی سے سنے جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مدراس کے چند مخلص تعلیمی کارفرما مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ یہاں کے انگریزی مدارس کے مسلمان طالب علموں کے لیے بھی مسلمانوں کی طرف سے اس قسم کی کوشش کی جائے۔ یعنی سال بہ سال کسی مسلمان فاضل کی خدمات حاصل کی جائیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر طلبائے انگریزی کے ذوق اور موجودہ رنگ کے مطابق خطبات دے سکے... یہ میری سعادت ہے کہ اس اہم اور مقدس کام کے لیے سب سے پہلے میری حقیر ذات کا انتخاب عمل میں آیا اور اس طرح مجھے موقع ملا کہ میں اس عظیم الشان سلسلہ کی کڑی بن سکوں"۔(۱)

چنانچہ سید صاحب نے اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں کل آٹھ خطبات دیئے۔ پہلے خطبہ میں سید صاحب نے دکھایا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں ہی سے ہو سکتی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ سلاطین، حکمرانوں، سیاستدانوں، قانون دانوں اور فلسفیوں نے اپنی کشور کشائی، عقل و فہم، تدبیر مدن اور فلسفہ سے دنیا کا تو نقشہ بدل دیا مگر انسانیت کی حقیقی خدمت انجام دینے سے وہ قاصر رہے۔ چنانچہ دنیا میں جہاں بھی اخلاق، روحانیت اور انسانیت، کا پرتو نظر آتا ہے وہ صرف انبیائے کرام کا فیض ہے۔

۱- خطبات مدراس ص ۴-۵۔

دوسرے خطبہ میں حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے دائمی اور عالمگیر نمونہ عمل ہونے پر بحث کر کے سیرت محمدیؐ کے تاریخی و تکمیلی پہلوؤں اور اس کی جامعیت اور عملیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ آج جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں ان میں صرف حضور اکرم ﷺ ہی کے مستند و معتبر حالات معلوم ہیں اور آپؐ کی ایک ایک ادا محفوظ ہے اور اس میں ہر شعبہ ہائے زندگی کے لیے عملی نمونہ بھی محفوظ ہے۔

تیسرے خطبہ میں سیرت نبویؐ کے تاریخی پہلو پر مفصل بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ حضورؐ کی سیرت پر جتنا تاریخی مواد موجود ہے اتنا مواد دنیا کے کسی بھی انسان کے حالات و سوانح میں نہیں مل سکتا۔ سید صاحب نے اس سلسلہ میں سیرت کے تمام ماخذوں قرآن مجید، احادیث، سیر و مغازی نیز تاریخ و تراجم اور شمائل کے پورے ذخیرہ کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور مذکورہ علوم و فنون کی تاریخ بھی اس ناقدانہ تبصرہ میں پیش کر دی گئی ہے اور بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ''ان بحثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی سیرت پر جتنا مستند ذخیرہ معلومات موجود ہے اس کے عشر عشیر غیر مستند حالات بھی کسی پیغمبرؑ کے نہیں مل سکتے۔ (۱)

چوتھے خطبہ میں آپؐ کی کاملیت پر مفصل بحث کر کے دکھایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کی ایک ایک ادا کامل و مکمل طریقے پر محفوظ اور لائق تقلید ہے۔

پانچویں خطبہ میں آپؐ کی جامعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں آپؐ کے سوا کسی پیغمبر کی زندگی جامعیت کے ساتھ مکمل موجود نہیں اور آپؐ کی زندگی میں ہر طبقہ انسانی اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر رخ کے لیے اسوہ عمل موجود ہے۔

چھٹے خطبہ میں آپؐ کی سیرت کے عملی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اسلام نے جو اخلاقی تعلیمات دیں آپؐ خود اس کا عملی نمونہ تھے۔ چنانچہ سید صاحب نے سیرت نبویؐ کے تمام اخلاق فاضلہ کے واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

ساتویں خطبہ میں دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں پیغام محمدیؐ کی جامعیت، کاملیت عالمگیریت اور اسلام کی اصلاحات اور انقلاب انگیز خصوصیات پیش کی گئی ہیں اور واضح کر دیا گیا ہے کہ آپؐ کا پیغام ہی دنیا کو فلاح و کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

۱- ماہنامہ معارف سلیمان نمبر ص ۱۸۷۔

آٹھویں خطبہ میں پیغام محمدیؐ کی بنیادی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اسی پیغام محمدیؐ ہی نے دنیا کو انسانی معراج کمال تک پہنچایا۔ شاہ معین الدین صاحب اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت و عظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے ثبوت کے لیے کافی ہے“۔(۱)

اس کتاب کا موضوع اگرچہ خالص سیرت نبویؐ ہے تاہم یہ ایک اہم تاریخی تصنیف بھی ہے۔ سید صاحب نے مورخانہ شعور و تجربہ اور فن تاریخ نویسی کے اصولوں کا جس قدر خیال اس کتاب میں رکھا ہے وہ عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہازرانی جیسی خالص تاریخی تصنیفات سے کم نہیں۔

سید صاحب کی یہ تصنیف بھی بہت مقبول ہوئی جس زمانہ میں یہ خطبات دیئے گئے تھے مدراس کے اردو انگریزی اخباروں نے اس کے خلاصے شائع کیے۔ خاص طور سے ”ہندو“ اور ڈیلی اکسپریس مدراس نے اپنے کالموں میں ہر ہفتہ جگہ دی۔ اسی زمانہ میں ان خطبات کو کتابی صورت میں شائع کرنے پر اصرار کیا گیا چنانچہ سید صاحب نے ۱۹۲۶ء میں اسے مرتب کر کے دارالمصنفین سے شائع کیا تیسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں سید صاحب لکھتے ہیں:

> ”خدا کا شکر ہے کہ ان خطبات کو جو سرسری طور پر لکھے گئے تھے حد سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے ہر طبقہ میں وہ یکساں ذوق و شوق کے ہاتھوں سے لیے گئے اور عقیدت کی آنکھوں سے پڑھے گئے اور ان سے فائدہ اٹھایا گیا“۔(۲)

اب تک ہندو پاک سے اس کے بیسیوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد و شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی۔(۳)

خیام

یہ کتاب درحقیقت سید صاحب کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں پیش کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں متعدد اضافوں

۱- معارف سلیمان نمبر ص ۱۹۰۔ ۲- خطبات مدراس ص ۲۔ ۳- ہم نفسان رفتہ ص ۲۸۔

کے ساتھ دارالمصنفین نے شائع کیا۔ اس میں مشہور حکیم صوفی اور فلسفی عمر خیام کے حالات و کارناموں کا نہایت محققانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

عمر خیام کو مشرق سے زیادہ مغرب میں جتنی مقبولیت ملی شاید اس قدر کسی اور مشرقی شاعر کو مقبولیت نہ ملی ہوگی۔ اس کی رباعیات کا انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے باوجود خیام کے بارے میں متعدد غلط فہمیاں بھی مغربی اہل قلم نے ہی پیدا کیں۔ مثلاً یہ کہ وہ شراب اور عورتوں کا دیوانہ تھا، وہ بڑا ہی آزاد خیال اور مذہب کا تمسخر اڑانے والا شاعر تھا۔ لارڈ ٹینسن نے لکھا کہ عمر خیام ایک عظیم کافر تھا، طامس کارلائل نے اس کو ایک ایرانی بدمعاش کی حیثیت سے پیش کیا، ایک پادری نے اسے ابلیس کا سفیر اور قاصد قرار دیا تھا(۱)۔ غرض یہ کہ خیام کی شخصیت کو یورپ نے اس قدر مبہم اور داغدار کر کے پیش کیا کہ اس کی اصل شخصیت پر پردہ پڑ گیا۔ ہندوستان میں خیام کی شخصیت پر سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب شعر العجم میں روشنی ڈالی، اس کے بعد سید صاحب نے یہ مبسوط اور جامع کتاب لکھ کر مغربی اہل قلم کے خیالات کی کج مج بیانی پوری طرح واضح کر دی اور واقعتاً عمر خیام کو نئی زندگی بخشی۔ جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

> "اس کتاب کی اشاعت سے اہل یورپ کے اس خیال کی بالکل تردید ہوگئی کہ خیام ایک عیاش، بدمست رند لاابالی شاعر تھا جو ہمہ تن شاہد و شراب میں غرق رہتا تھا اور جس کے لیے زندگی عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ایک بڑا فلسفی ہیئت و نجوم وریاضیات کا بڑا عالم اور فلسفی قسم کا صوفی شاعر تھا۔ مذہبی حیثیت سے ایک دیندار مسلمان تھا اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا اور اس کی زندگی زاہدانہ تھی"۔(۲)

۵۰۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب تحقیق و تدقیق کا شاہکار نمونہ ہے۔ شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے اس کے بعد خیام کے حالات و سوانح اور کارناموں کے اہم مآخذ و مصادر پر مفصل ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں تمام مشرقی و مغربی ماخذوں کا جائزہ لینے کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ:

۱- مولانا شبلی اور عمر خیام۔ بھانجی والا بمبئی۔ ۲- مولانا سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۱۷۔

"خیام کے سوانح کے اصلی اور قدیم ترین مآخذ صرف تین ہیں۔
ایک بیہقی کی کتاب تاریخ الحکماء جس کا مصنف خیام سے کمسنی میں ملا تھا اور اس کا باپ خیام کا دوست تھا اور خیام کا داماد خود اس کا دوست تھا۔ دوسری کتاب چہار مقالہ ہے جس کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی ۵۰۶ھ میں اور اس کے پس و پیش میں خیام سے ملتا رہا تھا۔ اور تیسری کتاب خریدۃ القصر ہے جس کا مصنف عماد کاتب اصفہانی غالباً خیام کی زندگی میں ۵۱۹ھ میں سلجوقیہ کے دار السلطنت اصفہان میں پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ بقیہ تمام کتابیں جن میں خیام کے حالات ہیں کم و بیش انھیں سے بعینہ یا حذف و اضافہ کے ساتھ منقول ہیں"۔(۱)

خیام کی معاصرت کے بارے میں بھی بڑی غلط فہمیاں تھیں مثلاً مغربی اہل قلم نے خیام کو نظام الملک اور حسن بن صباح کا معاصر اور ہمدرس بتایا تھا۔ سید صاحب نے تحقیق و تدقیق سے ثابت کیا ہے کہ معاصرت کے بارے میں یہ خیال پوری طرح غلط ہے۔ اس کے بعد سید صاحب نے خیام کی زندگی کے صحیح سنین کی تحقیق و تفتیش کی ہے اور وفات، ولادت اور معاصرت کے متعلق تحقیق کر کے صحیح سنین کی تعیین کی ہے اور نام و نسب، اہل و عیال، تعلیم و تربیت، فضل و کمال، سلاطین و امراء اور معاصرین سے تعلقات کی تفصیلات بھی قلمبند کی ہیں نیز خیام کے مشرب و مسلک بھی واضح کیا ہے۔ آخر میں خیام کی تصانیف پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے جس سے خیام کی علمی عظمت اور بلند پایگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب میں خیام کے سات نادر فلسفیانہ رسالوں کو جن میں چھ عربی زبان میں ہیں اور ایک فارسی میں تصحیح و تحشیہ اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شامل کیا گیا ہے بعد ازاں استدراک و اشاریہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے خیام کی زندگی کی مکمل اور صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک تحقیق و تفتیش اور تلاش و تدقیق کا بہترین نمونہ ہے اور موضوع کے لحاظ سے اسے حرف آخر کی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے سچ لکھا تھا کہ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔(۲)

۱-خیام ص ۱۰۔ ۲-اقبال نامہ ص ۱۷۸-۱۷۹۔

سید صاحب کی یہ تحقیقی کاوش بہت مقبول ہوئی اس کی داد ہندوستان کے علاوہ ایران اور افغانستان کے ارباب علم وکمال نے بھی دی۔ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف بھیجے تھے ان میں ایک تحفہ یہ کتاب خیام بھی تھی۔

خیام کو عموماً ادب کی کتاب خیال کیا جاتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں ہے مگر اس کا بڑا حصہ فن تاریخ سے متعلق ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب کا طرز تحریر، انداز تحقیق، تلاش و تفحص اور مورخانہ تجزیہ و تحلیل اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب ادبی ہونے کے ساتھ تاریخی بھی ہے۔ یوں بھی مشرق میں سوانح تاریخ کا حصہ ہوتی ہیں خاص طور سے اردو میں سوانح نگاری کے جو اصول ہیں وہ وہی ہیں جو تاریخ نگاری کے بنیادی عناصر ہیں۔

خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام

یہ کتاب سید صاحب کی مستقل تصنیف نہیں بلکہ اس سلسلہ مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے خلافت اور دنیائے اسلام کے نام سے معارف میں نومبر ۱۹۲۱ء سے اپریل ۱۹۲۲ء تک کئی شماروں میں لکھے تھے۔

۱۲۶ صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب کو مکتبہ سیاسیات مشرقیہ دہلی نے غالباً ۱۹۲۳ء میں شائع کیا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خلافت ایک اسلامی جمہوریت کی عظیم الشان نشانی ہے اور خلیفہ اسلام، اسلام کی عزت وناموس کا امین ونگہبان، تمام مذہبی مقامات وشعائر کا محافظ اور غیر اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کے مسائل کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ خلافت اسلامیہ اپنے ان فرائض سے کبھی غافل نہیں رہی مگر جب کمزور ہوئی تو مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر بے اثر ہو گئی، لسان الدین خطیب نے اس سے متاثر ہو کر ایک دردناک قصیدہ کہا جس کے ایک شعر کا یہ مفہوم ہے کہ زمین کے ہر ٹکڑے میں ایک ایک بادشاہ بن بیٹھا ہے اور ہر شاخ پر ایک ایک مرغ اپنی آواز لگا رہا ہے۔ اس کے بعد یورپ کی عیاری ومکاری بیان کی گئی ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو منتشر وپارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہوئے اس کے بعد دولت عثمانیہ کے خلیفہ سلطان سلیم کے اس کارنامہ پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس نے کس طرح تمام مختلف اور منقسم اسلامی ریاستوں کو متحد کر کے ایک مرکز اسلامی کی خلافت کے پرچم تلے اکٹھا کیا۔ سید صاحب نے سلطان سلیم کے ان تمام کارناموں کو جو اس نے مسلمانوں کو متحد کرنے کے سلسلے میں

انجام دیے تفصیل سے بیان کیا ہے اور خلافت عثمانیہ نے عرب و ہند کے سواحل اور بحر عرب کے اسلامی جزائر کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کا بھی ذکر ہے۔

آخر میں خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام و مسیحیت کے اعتراف کے عنوان سے نہایت موثر طریقے سے ثابت کیا گیا ہے کہ گذشتہ چار صدیوں تک مسلمان اور ترک دونوں مترادف الفاظ سمجھے جاتے رہے۔ ترکی سے جنگ، اسلام سے جنگ تصور کی جاتی تھی اور واقعتاً روئے زمین پر ناموس اسلام کی نگہداشت، مظلوموں کی دادخواہی اور فریادرسی، شعائر اسلام کا قیام اور مملکت اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت جیسے فرائض خلافت عثمانیہ نے جس طرح بحسن وخوبی انجام دیئے اس کی وجہ سے وہ بجا طور پر اس کے سربراہ امیر المومنین اور امام المسلمین کے القاب کے مستحق ہوئے۔

خلافت کے سلسلہ میں فضلائے یورپ کے بعض اعتراضات کے ساتھ اعترافات کو نقل کیا گیا ہے۔ اعتراضات کی تردید اور اعترافات کو حجت الزامی کے طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔

چونکہ سید صاحب نے یہ مضامین اس وقت لکھے تھے جب دولت عثمانیہ رو بہ زوال تھی یورپ اس کے آخری وجود کے درپے تھا اس لیے اس میں بقول صباح الدین صاحب "سید صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دولت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان سلیم کے زمانے سے مسلمانوں کے خلیفہ سمجھے جاتے رہے اگر یورپ کی مسیحی حکومتوں نے اپنی دشمنی اور سامراجیت میں ان کی خلافت کو ختم کیا تو دنیا کے مسلمانوں کو بڑا دکھ پہنچے گا۔ (۱)

تحریک خلافت کے پس منظر میں لکھے گئے اس کتابچہ کو صباح الدین صاحب نے پروپگنڈا لٹریچر قرار دینے کے باوجود لکھا ہے کہ:

> "یہ بظاہر اس زمانہ کی خلافت تحریک کے پروپگنڈا کے لیے ایک لٹریچر تھا لیکن آج بھی اس کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ سید صاحب کی مورخانہ ژرف نگاہی اور بصیرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کسی تحریک کی ہنگامہ آرائیوں کے وقت لکھا گیا ہے بلکہ یہ ایسا تاریخی مواد ہے جو ہر زمانہ میں مسلمانوں کے لیے درس عبرت کا سامان فراہم کر سکتا ہے"۔ (۲)

۱- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۲۴۴۔ ۲- ایضاً ص ۲۳۵۔

درحقیقت یہ کتاب آج بھی خلافت کی تاریخ کا ایک بنیادی مآخذ قرار دیئے جانے کے لائق ہے۔

نقوش سلیمانی

یہ بھی سید صاحب کی مستقل تصنیف نہیں ہے مگر اپنے بلند پایہ مشتملات و مباحث اور انتہائی محققانہ تحریروں اور بہترین اسلوب نگارش کے باعث ایک بیش قیمت تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو زبان و ادب کے متعدد موضوعات پر یہ خطبات، مقالات اور مقدمات سلیمانی کا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا گو یہ خالص ادبی کتاب ہے مگر اس کا بیشتر حصہ اردو زبان و ادب کی تاریخ سے متعلق ہے اس لیے اسے بجا طور پر اردو زبان و ادب کی تاریخ کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں اردو زبان و ادب کے دوسرے موضوعات کے ساتھ اردو کے مولد کی تعیین اور اس کے آغاز و ارتقاء اور عہد بہ عہد کی ترقیوں کو اس دقت نظر اور ژرف نگاہی سے پیش کیا گیا ہے کہ بقول صباح الدین صاحب "اس کو پڑھ کر اردو زبان کا بڑے سے بڑا ادیب، انشاپرداز اور نقاد اردو زبان و ادب پر ان کی گہری نگاہ کا قائل ہوگا(۱)۔ ہمارے نزدیک نقوش سلیمانی خالص ادبی تصنیف ہونے کے ساتھ اردو زبان و ادب کی ایسی جزوی تاریخ بھی ہے جس سے تاریخ زبان اردو کا طالب علم صرف نظر نہیں کر سکتا۔

رحمت عالم

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کے بعد سید صاحب نے رحمت عالم لکھی سید صاحب کے احباب کا تقاضا تھا کہ سیرت نبویؐ پر ایک مختصر اور جامع کتاب بچوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے لکھی جائے اور وہ مدارس کے نصاب میں بھی داخل کی جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں سید صاحب نے رحمت عالم لکھی اس میں آنحضرت ﷺ کے خاندان، حسب و نسب اور ولادت باسعادت سے وفات تک کے مختصر حالات نہایت آسان زبان میں لکھے گئے ہیں بعض صحابہ کرامؓ کا بھی ذکر ہے آخر میں آپ کے اخلاق و عادات کریمہ کا بیان ہے۔

سیرت نبویؐ کے تعلق سے یہ خالص تاریخی کتاب ہے گو اس میں آنحضرت ﷺ کے عہد کے حالات بہت کم زیر بحث آتے ہیں تاہم جن کا ذکر سیرت نبویؐ میں ضروری تھا

۱- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۲۳۔

ان کو تشنہ بھی نہیں چھوڑا گیا ہے بہر حال یہ تاریخ نہیں فن سیرت نگاری کا نمونہ ہے۔

حیات شبلی

یہ عہد جدید کے معلم اول، سیرت نگار رسول اعظمؐ اور بانی دار المصنفین علامہ شبلی کی سوانح عمری ہے۔ سید صاحب کے الفاظ میں "پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے ۳۲ برس (۱۸۸۲ء سے ۱۹۴۱ء) تک ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پُر شور رکھا"۔(۱)

علامہ شبلی کی سوانح عمری ان کی زندگی ہی میں حیات النذیر کے مصنف انتخاب عالم مارہروی نے لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ شبلی کو متعدد خطوط بھی لکھے تھے مگر علامہ شبلی یہ کہہ کر ٹال گئے کہ "میری لائف میرے بعد لکھیے گا ورنہ مکمل لائف کیونکر ہوگی"(۲)۔ لیکن مارہروی صاحب نے ایک بار پھر سید صاحب کے ذریعہ یہ سفارش کرائی کہ علامہ شبلی اپنی سوانح عمری لکھنے کی اجازت دے دیں مگر علامہ نے اس کے جواب میں فروری ۱۹۱۴ء میں سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

> "انتخاب عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا"۔(۳)

دراصل علامہ شبلی کی یہ خواہش تھی کہ ان کی سوانح حیات سید صاحب ہی لکھیں کہ واقعی اس کے اہل اور اصل مستحق سید صاحب ہی تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے محبوب استاذ کے انتقال کے ۲۶ سال بعد ۱۹۴۰ء میں اس فرض و قرض کی ادائیگی کا آغاز کیا اور تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۹۴۲ء میں اسے مکمل کیا ۱۹۴۳ء میں یہ دار المصنفین سے شائع ہوئی۔ یہاں یہ لائق ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی خواہش کے عین مطابق سید صاحب نے دوسرے تصنیفی امور سے فارغ ہو کر یہ کتاب مرتب کی اور یہی ان کی آخری تصنیف ثابت ہوئی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بعد میں اس کی ضخامت کے پیش نظر دبستان شبلی کے ایک نامور ادیب و انشاء پرداز پروفیسر عبد الرزاق قریشی نے اس کی تلخیص کی جو مختصر حیات شبلی کے نام سے عثمانیہ بکڈپو بمبئی سے شائع ہوئی۔

۱-حیات شبلی ص ا۔ ۲-مکاتیب شبلی ج ا، مکتوب نمبر ۲۴۔ ۳-ایضاً ج ۲، ص ۱۰۷۔

علامہ شبلی کی زندگی اور ان کے کارناموں پر بے شمار علمی و تحقیقی کتابیں اور مضامین مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب کا مرجع وماخذ حیات شبلی ہی ہے ۸۵۰ صفحات پر مشتمل اس ضخیم سوانح عمری میں علامہ شبلی کے احوال بلکہ ان کے معاصر عہد کے واقعات کو بتمام وکمال جمع کر دیا گیا ہے۔ شروع میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اشخاص وافراد پیدا کرتا ہے اور جس طرح مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد شہید، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا کرامت علی جونپوری، مولوی چراغ علی اور سر سید احمد خاں نے اپنے عہد کے فتنوں کا مقابلہ اور اسلام کا دفاع کیا اسی طرح علامہ شبلی کو بھی اللہ تعالیٰ نے وقت اور زمانہ کے مطابق پیدا کیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> "جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے"۔(۱)

دیباچہ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنھوں نے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض وبرکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیوں کر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈال دی"۔(۲)

ابتدائی دیباچوں کے بعد ۵۲ صفحات پر مشتمل ایک گرانقدر مقدمہ ہے جس کا معنی خیز آغاز علامہ شبلی کی اس مشہور عبارت سے کیا ہے کہ "اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت

۱-حیات شبلی ص ۱۷۔ ۲-ایضاً ص ۲۵۔

تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی(۱)۔ اس مقدمہ میں اسلامی ہند کے مسلمانوں کی پوری علمی، دینی اور قومی جدوجہد کی طویل داستان کی مختصر تاریخ آگئی ہے۔ خاص طور سے دیار پورب اور خطہ اعظم گڑھ کی علمی، ادبی، ثقافتی اور دینی تاریخ اس طرح پیش کی گئی ہے کہ یہ اپنے موضوع پر اولین کاوش کے باوجود حرف آخر ہے۔ بجا طور پر یہ مقدمہ بذات خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور پروفیسر آل احمد سرور نے البتہ یہ تنقید کی ہے کہ اس طویل مقدمہ کی کوئی ضرورت نہ تھی(۲)۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی اپنے تحقیقی مقالے میں اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مذکورہ بالا راویوں سے اس لیے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ حیات شبلی کے اس مبسوط مقدمہ کی وجہ سے اس کتاب میں جو وزن اور وقار پیدا ہوا وہ اردو کی کسی اور سوانح عمری میں نہیں پایا جاتا اس مقدمہ سے خطہ پورب کی جو روشن تصویر سامنے آتی ہے اور معلومات کا جو چشمہ شیریں ابلتا ہے وہ اس کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیتا"۔(۳)

ابتدائی ابواب میں اعظم گڑھ اور اس کے قدیم قصبات کی مختصر تاریخ اور علامہ شبلی کے حسب و نسب، خاندان، ولادت و وطن، تعلیم و تربیت، ابتدائی مشاغل، تصانیف، شعر و شاعری، وکالت اور بعض ذاتی حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ نیز علی گڑھ سے وابستگی وہاں قیام اور اس دور کے علماء، ادبی اور تصنیفی خدمات کا مفصل ذکر ہے پھر دو ابواب میں ان کی تصانیف کا تعارف، علی گڑھ کالج کی ترقی میں ان کا حصہ اور علیحدگی اور اس کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ حیدر آباد سے وابستگی اور اس دور کے علمی و ادبی کاموں، تصانیف اور ان کی دیگر مصروفیات کا بھی مکمل ذکر کیا گیا ہے پھر ایک نسبتاً طویل باب میں تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ ہے اس میں علامہ شبلی کی تحریک ندوہ سے دلچسپی، ندوہ کی معتمدی اور اس کی ترقی میں ان کی جدوجہد اور دوسرے علمی مشاغل کا ذکر ہے۔ ایک مختصر باب میں ماہنامہ الندوہ کا اجراء، مقاصد، اہمیت وغیرہ بیان کی گئی ہے۔ بعد ازاں دارالعلوم ندوۃ العلوم کی تعمیر و ترقی میں علامہ شبلی کی اہم مساعی کا بیان ہے، علامہ شبلی کے پیر کے حادثہ کی پوری روداد اور اس سلسلہ میں شعراء کے مراثی وغیرہ بھی نقل کر

۱۔ شعر العجم حصہ اول ص ا معارف پریس اعظم گڑھ طبع چہارم ۱۹۴۰ء۔ ۲۔ تنقیدی نقوش ص ۳۳۔ و تنقیدی اشارے ص ۱۹۶۔ ۳۔ علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات ص ۱۸۶۔

دیئے ہیں۔ ایک باب میں علامہ شبلی کی سیاسیات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے، ندوہ میں علامہ شبلی کی مخالفت کا بھی مفصل جائزہ لیا گیا ہے، علامہ شبلی کے بھائی مولوی اسحاق (وکیل ہائی کورٹ) کی وفات کا سانحہ پیش آیا اس کی پُر اثر داستان بھی ہے جس میں علامہ شبلی کا مشہور مرثیہ اسحاق بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ اعظم گڑھ میں شبلی اسکول کی ابتداء اور عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تفصیل اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی مختصر تاریخ اور اس سے علامہ شبلی کی دلچسپیوں کا بھی الگ الگ ذکر ہے۔ دارالمصنفین کے ابتدائی تخیل سے وجود میں آنے تک کی تاریخ بھی ہے۔ اس میں سیرت نبویؐ کے عظیم الشان منصوبہ کی بھی تاریخ آگئی ہے جو علامہ شبلی کے انتقال تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ علامہ شبلی کی وفات، اولاد اور اخلاق و عادات کو بھی بیان کیا گیا ہے اور ان کی وفات پر لکھے جانے والے اہم مراثی و قطعات کو بطور ضمیمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اس ضخیم کتاب میں علامہ شبلی کی زندگی کے تمام حالات و واقعات اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے اسلامی ہند کی علمی و عملی جدوجہد کی پوری تاریخ اس میں سمٹ آئی ہے۔ خود سید صاحب رقمطراز ہیں:

> "یہ نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں بہت سے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا۔ شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے"۔ (۱)

حیات شبلی علی العموم پسند کی گئی۔ چونکہ اس میں علامہ شبلی اور سرسید کے اختلافات کے ضمن میں علامہ شبلی کو حق بجانب ٹھہرایا گیا تھا اس لیے سرسید کے بعض عقیدت مندوں کو اس سے ٹھیس پہنچی اور انھوں نے عقیدت کے جوش و غلو میں حیات شبلی پر سخت ردّ عمل کا اظہار کیا۔ آل احمد سرور نے اسے سرکاری سوانح عمری قرار دیا (۲)، رشید احمد صدیقی نے اسے نذرانہ عقیدت بتایا (۳)، اور چونکہ علامہ شبلی نے سرسید کی سوانح عمری

۱- حیات شبلی ص ۱۰۔ ۲- تنقیدی اشارے ص ۱۹۳۔ ۳- ہم نفسان رفتہ ص ۷۲۔

حیات جاوید کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی قرار دیا تھا(۱)، اس لیے محمد ابراہیم ڈار نے حیات شبلی پر طویل تبصرہ کرتے ہوئے اسے بھی جواباً کتاب المناقب اور مدلل مداحی قرار دیا(۲)۔ ان دونوں بزرگوں کے متعلق شبلی کے ایک سوانح نگار شیخ اکرام کی رائے سے اہل علم بخوبی واقف ہیں انھوں نے شبلی نامہ میں حیات شبلی پر تیز و تند تنقید کی اور اپنی دانست میں اس کتاب کی کمیوں اور خامیوں کا ڈھیر لگا دیا(۳)۔ لیکن غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے حیات شبلی سرکاری سوانح عمری، نذرانہ عقیدت اور کتاب المناقب اور مدلل مداحی جیسے طنز و تعریض والے خطابات کے برعکس مشرقی سوانح عمری کی بہترین مثال ہے اور جس تاریخی سوانح عمری لکھنے کی روایت کی ابتداء علامہ شبلی نے کی تھی سیرت عائشہؓ اور پھر حیات شبلی اس علمی روایت کی ایک کڑی ہے جس کی افادیت کا انکار سطحی اعتراضات سے نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ محمد اکرام نے بالآخر اس کا اعتراف یہ لکھ کر کیا کہ یہ ہماری زبان کی سب سے مفصل اور وقیع سوانح عمری ہے، مزید یہ کہ "سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو حیات جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا"۔(۴)

علامہ شبلی اور سرسید کے اختلافات سے چشم پوشی کرنا یقیناً بددیانتی ہوتی۔ لیکن سید صاحب نے چشم پوشی نہیں کی بلکہ انھوں نے ان اختلافات اور ان کے اسباب کو وضاحت سے بیان کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس موازنہ میں انھوں نے شبلی کو حق بجانب ٹھہرایا اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی منصف مزاج شخص اس بحث کو پڑھے گا تو شبلی کو حق بجانب ہی ٹھہرائے گا۔ مگر سرسید کے مذکورہ عقیدت مندوں نے اس بحث سے شبلی کو سرسید کا مدمقابل سمجھ لیا(۵)، حالانکہ بقول خود آل احمد سرور شبلی کی تحریک کا مقصد سرسید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی اصلاح کرنا تھا۔(۶)

مذکورہ عقیدت مندوں کی کم فہمی نے علامہ شبلی کے بارے میں ردّعمل کے طور پر متعدد غلط فہمیاں پھیلائیں۔ مولوی عبدالحق کا مقدمہ خطوط شبلی، امین زبیری کی کتاب ذکر شبلی اور عبدالوحید قریشی کی کتاب شبلی کی حیات معاشقہ اسی ردّعمل کا نتیجہ ہیں جو ان کی کج فہمی اور کج نیتی کی وجہ سے وجود میں آئیں۔ حالانکہ خود سید صاحب نے بھی حیات شبلی کے

۱- مکاتیب شبلی ج ا، ص ۱۲۵ و ۱۳۴۔ ۲- مضامین ڈار ص ۲۴۰۔ ۳- شبلی نامہ ص ۷-۱۱۔
۴- ایضاً۔ ۵- ایضاً۔ ۶- تنقیدی اشارے ص ۱۵۳۔

دیباچہ میں یہ اعتراف کیا تھا کہ:

> "خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمری کے صحیح اصولوں پر پوری منطبق ہے۔ تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے۔ مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں اس لیے کوئی سوانح نگار اپنی معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہو سکتی ہیں، کیونکہ محبت و عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیات فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں بہر حال شبلی شبلی تھے جنید و شبلی نہ تھے"۔(۱)

راقم کے خیال میں اس وضاحت کے بعد اس مصنوعی غیض و غضب کی کوئی ضرورت نہ تھی جو حیات شبلی پر برپا کیا گیا۔ محمد ابراہیم ڈار نے شدید نقد و جرح کے باوجود یہ لکھا ہے کہ:

> "ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح بھی موجود ہے اس کتاب کی کامیابی کا ایک سبب مصنف کا علمی تبحر ہے جس کا ثبوت کتاب کے صفحات پر جا بجا ملتا ہے۔ حیات شبلی کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت مفید اور قیمتی ہیں"۔(۲)

ڈاکٹر عبدالقیوم نے بھی حیات شبلی کو اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ قرار دیا ہے۔(۳)

۱- حیات شبلی ص ۸-۹۔ ۲- مضامین ڈار ص ۲۴۲۔ ۳- تنقیدی نقوش ص ۲۳۔

سوانح نگاری میں صاحب سوانح کے محاسن کے ساتھ معائب کا بیان بھی ضروری قرار دیا ہے۔ حیات شبلی اس اصول سوانح نگاری پر پوری اترتی ہے۔ چنانچہ سید صاحب نے حیات شبلی میں علامہ شبلی کے محاسن کے ساتھ نقائص اور خامیوں کے بیان سے اغماض نہیں برتا مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع اور تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے، نہیں تھا"(۱)

مگر یہ سچ ہے کہ محاسن کے مقابلہ میں معائب کا پلہ ہلکا ہے۔ ممکن ہے حیات شبلی میں اور بھی کچھ فنی خامیاں ہوں لیکن اس کی تاریخی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں:

"حیات شبلی میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے اور دیار پورب کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے اس کے احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے"۔(۲)

سفر نامہ افغانستان

۱۹۳۳ء میں افغان فرمانروا نادر شاہ نے مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو افغانستان آنے کی دعوت دی تاکہ افغانستان کے نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ لے کر اس کو مزید بہتر بنایا جائے۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ان حضرات نے اسی مقصد سے افغانستان کا سفر کیا۔ سید صاحب نے واپس آکر اس سفر کی مفصل روداد معارف میں کئی قسطوں میں شائع کی زیر نظر کتاب میں اس سفر نامہ کو یکجا شائع کیا گیا ہے۔ افغانستان کے علمی و ادبی، تہذیبی و معاشرتی اور تمدنی و تاریخی حالات کے اس مرقع کا تعارف عبدالقدوس ہاشمی نے اس طرح پیش کیا ہے:

"اس میں سوانح بھی ہیں اور تذکرے بھی، احوال بھی ہیں اور افکار بھی، تاریخی اسناد بھی ہیں اور جغرافیائی معلومات بھی مدارس و مساجد کا حال بھی اور اخبارات و رسائل کی فہرست بھی"۔(۳)

۱-حیات شبلی ص ۳۲ دیباچہ۔ ۲-شبلی نامہ ص ۱۱۔ ۳-سیر افغانستان پیش لفظ ص ۴۔

سید صاحب کا یہ سفر نامہ سیر افغانستان کے نام سے اولاً د ۱۹۴ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا، بعد ازاں ۱۹۹۲ء میں دارالمصنفین نے سفر نامہ افغانستان کے نام سے شائع کیا۔

سفر نامے گو بذات خود تاریخ نہیں ہوتے لیکن تاریخ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے انکا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا خصوصاً ازمنہ قدیم کی تاریخ کا تصور بغیر سفر ناموں کے ممکن نہیں۔ سید صاحب کا یہ سفر نامہ بھی افغانستان کے نادر شاہی عہد کی تاریخ کا مفید ماخذ ہے۔

اس سفر نامہ کا ایک اہم وصف اس کا اسلوب نگارش ہے جو خالص ادبی ہے۔ سید صاحب نے جس جوش و سرمستی کے ساتھ یہ سفر نامہ لکھا ہے اس سے اس کے پڑھنے میں حلاوت محسوس ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے ساتھ خود قاری بھی افغانستان کے کوہ دمن میں محو سفر ہے۔

برید فرنگ

یہ سید صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے یورپ سے لکھے تھے اور اس کے مکتوب الیہم تحریک خلافت کے ذمہ دار مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا شوکت علی اور اعزہ واحباب مثلاً مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید عبدالحکیم دسنوی اور مولانا سید ابو ظفر ندوی تھے۔

۲۹ر جنوری ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا ایک وفد لندن گیا اس نے یورپ کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور اپنے اغراض و مقاصد سے وہاں کے ارباب سیاست و حکومت کو آگاہ کیا۔ اس وفد میں سید حسین ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ اور مولوی ابوالقاسم شامل تھے بعد میں شیخ مشیر حسین قدوائی بھی اس میں شامل ہو گئے مولانا محمد علی جوہر اس وفد کے سربراہ تھے، سید صاحب کی شمولیت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک سے ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ سید صاحب اس حقیقت کو پُر زور طریقہ سے پیش کریں کہ اگر خلافت ختم کر دی گئی تو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح اور مشتعل ہوں گے یہ ذمہ داری بھی سید صاحب کے سپرد کی گئی کہ یورپ کے اخبارات میں اسلام اور خلافت پر جو مضامین شائع ہوں ان پر وہ نظر رکھیں اور ہر ہفتہ پابندی کے ساتھ وفد کی روداد لکھ کر ہندوستان بھیجتے رہیں۔ وفد نے آٹھ ماہ یورپ میں قیام کیا اس عرصہ میں سید صاحب نے

بحسن و خوبی اپنے فرائض ادا کیے انھوں نے نجی طور پر احباب کے نام بھی خط لکھے جو اسی زمانہ میں ہندوستان کے مشہور اخبارات ہمدم لکھنؤ، زمیندار لاہور، خلافت بمبئی اور وکیل امرتسر وغیرہ میں شائع ہوئے۔

سید صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان خطوط کو مرتب کر کے ۱۹۵۲ء میں مکتبہ الشرق کراچی سے شائع کیا اور اس پر ایک گرانقدر مقدمہ بھی لکھا جس میں بقول مولانا ماہر القادری اس زمانہ کی سیاسیات کے بحر ذخار کو چند صفحوں میں سمودیا ہے۔(۱)

۲۲۷ صفحات پر مشتمل برید فرنگ کو یورپ کا سفر نامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں وفد نے جو کچھ کیا، جن لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور جو کچھ دیکھا، محسوس کیا سید صاحب نے بے کم وکاست اس کی روداد لکھ دی ہے۔ آج ان خطوط کی حیثیت اس صدی کے دور اول کے ہندوستان، یورپ اور عالم اسلام کے متعدد سیاسی حالات کی تاریخی دستاویز جیسی ہے خود سید صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "یہ خطوط اگر آج سے بتّیس برس پہلے شائع ہوتے تو ایک سیاحت نامہ کا کام دیتے مگر اب بتّیس برس کے بعد ان کی اشاعت صرف تاریخی افادیت رکھتی ہے۔ ان سے آج کے بتّیس برس پہلے کے ہندوستان اور دنیائے اسلام اور یورپ کے سیاحت کی وہ تصویر نظر آتی ہے جو میرے قلم نے کھینچی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کا نقشہ گو بدل چکا ہے ایسی حالت میں نہیں کہا جا سکتا کہ کیا چیز باقی ہے اور کیا مٹ گئی تاہم ایک تاریخی دستاویز ہے"۔(۲)

بجا طور پر یہ کتاب ۱۹۲۰ء کے ہندوستان اور تحریک خلافت کی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہے تحریک خلافت ہندوستان اور عالم اسلام کی سیاسی صورت حال قلمبند کرنے والا مورخ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

بہادر خواتین اسلام

سید صاحب نے ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں "مسلمان عورتوں کی بہادری" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا یہ کتاب انھیں کا مجموعہ ہے۔ افادہ عام کی

۱-ماہر القادری کے تبصرے ص ۱۱۳۔ ۲-دیباچہ برید فرنگ ص ۱۹۔

غرض سے ۱۹۵۲ء میں سید صاحب نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس میں انھوں نے خواتین اسلام کی دلیری اور ہمت و جرأت و شجاعت کے واقعات کو نہایت مفید اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے اس میں عرب کے علاوہ ہندوستان کی مسلمان خواتین کے واقعات بھی شامل ہیں۔

اس کتاب کا اگرچہ موضوع خواتین اسلام کی بہادری ہے لیکن یہ واقعات اصلاً تاریخ کا حصہ ہیں جن سے مختلف ادوار کے جنگ اور بعض سیاسی حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ واقعات تاریخ کے مستند ماخذ و مصادر کی مدد سے مورخانہ انداز اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ صباح الدین صاحب کے قلم سے ایک طویل دیباچہ بعد کے ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے سید صاحب کی تحریروں کی روشنی میں اسلام میں خواتین کے حقوق پر بحث کی ہے۔

سید صاحب کا یہ کتابچہ بھی بہت مقبول ہوا اب تک اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے جو "ہیرویک ڈیڈس آف مسلم وومن" کے نام سے شائع ہوا جو پہلے اسلامک ریویو لندن میں چھپا پھر کتابی صورت میں محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا اس کے بھی دسیوں ایڈیشن مقبول ہو چکے ہیں۔

یادِ رفتگاں

یہ سید صاحب کی ان غمناک تحریروں اور نثری مرثیوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ، احباب، معاصرین اور دوسرے ارباب کمال کی وفات پر لکھے تھے۔ ان ماتمی مضامین کا سلسلہ ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی کی وفات سے شروع ہوا اور سید صاحب کی وفات سے کچھ پہلے ۱۹۵۳ء تک جاری رہا۔ سید صاحب کے قلم سے آخری نثری مرثیہ مفتی کفایت اللہ دہلوی کی وفات پر لکھا گیا۔ اس طرح بیسویں صدی کے نصف اول میں وفات پانے والے اصحاب علم و فضل، سیاست داں، ادیب و انشاء پرداز، شاعر، مورخ و مصنف اور خطیب و نقاد کے مختصر حالات و سوانح، علم و فضل اور ان کے کارناموں کی تاریخ اس میں آگئی ہے۔

سید صاحب نے اپنی ان تحریروں کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا مگر ان کی وفات کے بعد ان کے خویش سید ابو عاصم ایڈوکیٹ نے مرتب کر کے یادِ رفتگاں کے نام سے

ایک عمدہ مقدمہ کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں مکتبہ الشرق کراچی سے شائع کیا اب تک ہندوپاک سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

۲۲۷ صفحات پر مشتمل یادرفتگاں میں ۱۳۵ اشخاص کا تذکرہ و ماتم ہے اس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ڈاکٹر نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

"یادرفتگاں میں جن شخصیتوں کی وفات پر مجلس ماتم برپا کی گئی ہے ان کا دائرہ اعزہ واحباب، علماء وفضلاء، ادباء وشعراء، ارباب سیاست اور اصحاب کمال سب کو محیط ہے۔اس مجموعہ میں ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، یہودی بھی ہیں، ہندوستانی بھی ہیں، انگریز بھی، مصری بھی ہیں اور ترکی بھی۔اسی طرح ان میں جج بھی ہیں بیرسٹر بھی، ملا بھی ہیں اور مسٹر بھی، پیر بھی ہیں فقیر بھی، شاعر بھی ہیں خطیب بھی۔سیاستداں بھی ہیں گوشہ نشیں وگمنام بھی ہیں اور نامور مشاہیر بھی غرض یہ کتاب رنگارنگ پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ ہے"۔(۱)

سید صاحب کے ان وفیاتی مضامین میں بڑی اثر آفرینی ہے وہ اس انداز سے مرنے والوں کا ماتم کرتے ہیں کہ خود بھی روتے آنسو بہاتے اور دوسروں کو بھی اپنے غم میں برابر کا شریک کر لیتے ہیں۔سید ابو عاصم ایڈوکیٹ کے الفاظ میں "یہ سید صاحب کے دل کے ٹکڑے ہیں جو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں یہ چالیس سال کے آنسو ہیں جو قطرہ قطرہ گر کر سمندر کی شکل میں جمع ہو کر عبرت کا مرقع بن گیا ہے۔(۲)

ان مضامین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ صاحب تذکرہ کی شخصیت کے تمام خدو خال نمایاں ہو جاتے ہیں، علامہ اقبال کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ اسلام کی آبرو مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔اس کے دھن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق اس کے شعر کا ہر

۱-علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات ص ۱۹۸-۱۹۹۔ ۲-مقدمہ یادرفتگاں ص ۳۔

پرواز بال جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارخانہ جاوید نامہ بن کر انشاءاللہ باقی رہے گا۔ امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر عرش الٰہی کے سایے میں ہو گا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے"۔(۱)

مضامین وفیات بھی تذکرہ و سوانح کی طرح تاریخ کا حصہ ہیں۔ تاریخ اسلام میں وفیات نگاری ایک مستقل فن رہا ہے۔ ابن خلکان کی وفیات الاعیان کو تاریخ نویسی کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ سید صاحب کو ابتداء سے وفیات الاعیان اور ابن خلکان سے بڑا لگاؤ رہا انھوں نے ماہنامہ الندوہ میں ان پر گرانقدر مقالہ بھی لکھا تھا۔ صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ سید صاحب کی نجی علمی صحبتوں میں رہنے کی وجہ سے اگر اس خاکسار سے پوچھا جائے کہ وہ اسلام کے گذشتہ اکابر مصنفوں میں اپنی تحقیق اور تاریخ نویسی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر تھے تو یہ عرض کرنے میں تامل نہ ہو گا کہ ابن خلکان سے۔(۲)

سید صاحب کی وفیات نگاری اصلاً ابن خلکان کے سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے ان کی وفیات کو سلسلہ وفیات نگاری کی نشاۃ ثانیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحقیق و تدقیق، انداز و اسلوب نگارش سبھی میں وفیات الاعیان کا اثر صاف اور واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

جس طرح ابن خلکان کی وفیات الاعیان تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے اسی طرح سید صاحب کی یادرفتگاں بھی بیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ کا ایک ماخذ قرار دی جا سکتی ہے۔ کوئی مورخ اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ سید صاحب کے ان نقوش غم سے بے نیاز ہو کر مرتب نہ کر سکے گا۔ سید صاحب کو بھی ان تحریروں کی تاریخی نوعیت کا بخوبی احساس تھا ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں فاضلوں ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی تاریخ وفات کی تعیین ہے۔ تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں"۔(۳)

۱- ماتم اقبال۔ یادرفتگاں ص ۱۸۱۔ ۲- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ ص ۲۷۳۔
۳- بحوالہ یادرفتگاں ص ۶۔

اور واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب کا یہ خیال درست ثابت ہوا آج تاریخ کا کوئی طالب علم بیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ کے لیے یادِ رفتگاں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''راقم سطور کے نزدیک ان وفیاتی مضامین کی سب سے زیادہ نمایاں حیثیت تاریخی اور ادبی ہے۔ ہندوستان کے ماضی قریب کی تاریخ لکھنے والوں کو اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ تحریک خلافت، ترک موالات، کانگریس اور مسلم لیگ کی سرگرمیوں کی تفصیل اس کتاب میں سمٹ کر آ گئی ہے اور وہ بھی شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ و چشیدہ''۔(۱)

ان مضامین کی اہمیت مولانا عبدالماجد دریابادی کی اس رائے سے بھی ظاہر ہے:

> ''سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پائے اور ان کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصے میں آئے''۔(۲)

غرض یہ کہ سید صاحب کے یہ مضامین ادبی لحاظ سے اگر ادب کے شہ پارے ہیں تو تاریخی لحاظ سے تاریخ کا ایک اہم ماخذ بھی ہیں۔

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں

یہ کتاب سید صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے معارف میں مذکورہ عنوان اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی کے عنوان سے ۱۹۱۸ء میں مسلسل ایک سال تک لکھے تھے۔ یہ مقالہ ابتداً آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پڑھا گیا تھا۔ سید صاحب کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس کی اشاعت کی خواہش ہوئی، موضوع کی مناسبت سے انھوں نے یہ متاع ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ کر دی جس نے اگست ۱۹۵۴ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ انگریزی زبان میں بھی جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس کا ترجمہ کیا جو اسلامک کلچر حیدر آباد میں دو قسطوں میں شائع ہوا(۳)۔ مولانا غلام محی الدین صاحب نے بنگالی زبان میں ترجمہ کیا۔

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت وادبی خدمات ص ۱۹۹۔ ۲۔ معارف سلیمان نمبر ص ۳۹۔

۳۔ دیکھیے اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۸ء و اکتوبر ۱۹۳۹ء۔

اس رسالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندوؤں نے کس طرح علمی و تعلیمی ترقی کی اور ان کی علمی ترقی میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہے؟ ان سوالوں کا جواب اس میں نہایت محققانہ انداز سے دیا گیا ہے کہ جس دن سے ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق قائم ہوا اور وہ جب تک ہندوستان میں حکمراں رہے انھوں نے ہندوؤں کی تعلیم میں فیاضانہ حصہ لیا اور ان کے عہد حکومت میں چھوٹی برادریوں کو ایسا ہی حصول تعلیم کا موقع حاصل ہوا جیسا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو حاصل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں تعلیم و تربیت کے جو مقامات و مراکز تھے ان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی تعلیم کا بھی نظم ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ امراء کے دربار میں بھی یہ نظم ہوا کرتا تھا۔ مسلم حکمرانوں کے زوال کے بعد مسلم ریاستوں میں بھی یہ سلسلہ تعلیم جاری اور قائم رہا۔ اس سلسلہ میں سید صاحب نے راجہ چندلال اور مہاراجہ کشن پرساد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ اسی تعلیم کا نمونہ تھے۔ پوری بحث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شروع میں ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق اور ان کی آمد کا ذکر ان عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے حوالہ سے کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی کتابوں اور روددادوں میں ہندوستان کے کوائف واحوال کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی علمی و عملی فیاضیوں کے ذکر میں ہندو مورخوں، ادیبوں، شاعروں، لغت نویسوں، مترجموں، علوم عقلیہ کے ماہروں مالی منتظموں، موسیقاروں اور مصوروں کا بیان ہے، اس کے علاوہ نجوم، طب، اخلاق و تصوف میں بھی نمایاں ہندوؤں کا ذکر ہے، نیز تاریخ و ادب و شعر و لغت، طب، اخلاق، موسیقی، مصوری اور ترجمہ نگاری کے فنون کی نمایاں کتابوں کا ذکر مختصر تعارف کے ساتھ پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام غیر مسلم اہل کمال مسلمانوں کے عہد حکومت کی دین تھے اور ان کی اس علمی کامیابی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ہی کارفرما تھا۔

یہ مختصر لیکن نہایت بیش قیمت رسالہ اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مستند و معتبر حوالوں اور ماخذوں کی موجودگی سے یہ تحقیق و تدقیق کا بہترین نمونہ بھی بن گیا ہے۔

مقالہ نگاری

اردو زبان میں مقالہ نگاری کی ابتداء سر سید احمد خاں نے کی۔ انھوں نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اخلاقی، تعلیمی، تہذیبی موضوعات پر ایسے مقالات لکھے جن سے اردو

زبان میں تحریر و تصنیف کے ایک جدید اسلوب و انداز کی ابتداء ہوئی اسی لیے انھیں بجا طور پر اردو میں مقالہ نگاری کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔

سر سید کے رفقاء مولانا حالی اور علامہ شبلی نے اس کو مزید ترقی دی خصوصاً علامہ شبلی نے علمی و دینی، تحقیقی و تنقیدی اور تاریخی موضوعات پر بہترین مقالے سپرد قلم کیے۔ سر سید کی مقالہ نگاری اخلاقی اور تعلیمی مضامین تک اگر محدود تسلیم کی جائے تو یہ دعویٰ اپنی جگہ ہے کہ اردو میں علمی و تحقیقی اور تاریخی مقالہ نگاری کی ابتداء بھی علامہ شبلی کی اولیات میں سے ہے۔

سید صاحب اس میدان میں بھی علامہ شبلی کے کامل متبع نظر آتے ہیں ان کے مضامین و مقالات بھی متنوع ہیں۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

> "اگر تنہا انھی کے تصانیف اور مضامین پڑھ لیے جائیں تو مذہب اسلام، اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ مضامین مسلمانوں کی علمی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں"۔(۱)

سید صاحب کے مقالات کئی ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں وہ تقریباً چالیس برس تک معارف کے مدیر رہے اس عرصہ میں کم ایسا ہوا کہ معارف کا کوئی شمارہ ان کی تحریروں سے خالی رہا ہو۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تاریخی، علمی اور مذہبی مقالات کو تین جلدوں میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مرتب کر کے دارالمصنفین سے شائع کیا۔ پہلی جلد ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے دوسری جلد میں علمی اور تیسری جلد میں مذہبی بلکہ قرآنی مقالات ہیں۔ ان کے علاوہ موضوعات مثلاً قرآن و حدیث، تفسیر و تاریخ، فقہ و تصوف، فلسفہ و کلام، سیرت و سوانح اور تذکرہ وغیرہ پر ان کے سیکڑوں مقالات معارف کی فائلوں میں محفوظ ہیں، ان کے جمع و تدوین اور اشاعت کی ضرورت ہے جس سے استفادہ اور عام ہو جائے۔

یہاں سید صاحب کے چند خاص تاریخی مقالات کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ ان کی علمی اہمیت و افادیت اور سید صاحب کی مورخانہ بصیرت کا اندازہ ہو سکے۔

۱۔ مقالات سلیمان ج ۲، ص ۲ دیباچہ۔

مقالات سلیمان جلد اول

ہندوستان کی تاریخ کے متعلق اس میں پندرہ مقالات شامل ہیں۔اسے جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے مرتب کر کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں دارالمصنفین سے شائع کیا۔

۱- پہلا مقالہ ''ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں'' ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے جس کا تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

۲-دوسرا مقالہ ''سلطان ٹیپو کی چند باتیں — کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق''(۱) کے عنوان سے ہے۔ ۱۹۱۲ء میں سید صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے بنگلور کا سفر کیا تو میسور، سرنگاپٹم اور گنڈھ امبور کی بھی سیر کی انھیں کے الفاظ میں ''ان مقامات کو جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہوئے غیرت کی آنکھوں سے دیکھا''(۲)۔ مقالہ میں اسی سفر کے مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق کو پیش کیا ہے اور سلطان شہید پر انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں کی تردید بھی کی ہے۔ میسور، سرنگاپٹم اور گنڈھ امبور کے سیاسی انقلابات کو اس میں ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے جس سے اس پورے علاقہ کی تاریخ کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔

۳- تیسرا ''مقالہ خلافت اور ہندوستان'' ہے(۳)۔ مسئلہ خلافت سید صاحب کا خاص موضوع ہے اس مضمون کا تعلق اسی سے ہے۔اس میں خلفائے اسلام اور سلاطین ہند کے تعلقات پر قلم اٹھایا ہے اس مقصد سے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ ہندوستان میں خلافت کی کیا اہمیت تھی اور خود یہاں کے مسلمانوں، فرمانرواؤں اور سلاطین کو خلافت اسلامیہ سے کس درجہ مذہبی، سیاسی اور جذباتی لگاؤ تھا۔

ان اہم مقالات کو جداجدا رسائل کی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔

۴- ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی''(۴) کے عنوان سے سید صاحب نے معارف میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا افسوس کہ یہ نامکمل رہ گیا۔اس میں ہندوستان میں اسلام کی نشرواشاعت اور ترویج وترقی کی تاریخ میں نہایت مدلل انداز سے

۱-معارف فروری ۱۹۱۸ء۔ ۲-مقالات سلیمان ج۱، ص ۱۰۲۔

۳-معارف نومبر ۱۹۲۰ء اکتوبر ۱۹۲۱ء۔ ۴-معارف جنوری تا مئی و اگست ۱۹۲۳ء۔

ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اس کی اشاعت اسی طرح ہوئی جس طرح دنیا میں دوسرے مذاہب کی اشاعت ہوئی۔

سید صاحب کے اس مقالہ کو بھی قبول عام حاصل ہوا خواجہ حسن نظامی نے تو اسے کتابی صورت میں شائع کر کے بڑی تعداد میں تقسیم کرایا۔

۵- "بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی کا نقش سنگی"(۱)۔ اس مقالہ میں کشمیر کی موجودہ صورت حال بیان کی گئی ہے(۲)۔ پھر اس سے متعلق شاہجہاں کی ایک انسانی خدمت کا تذکرہ ایک فرمان کے حوالہ سے کیا ہے۔

۶- "ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں"(۳)۔ سید صاحب جامعہ ملیہ دہلی کی دعوت پر وہاں گئے تو اس کے کتب خانہ کو بھی دیکھا اس میں عالمگیر کے عہد کی دو کتابوں "مت اچھرہ" اور "ردّ الکفر" پر ان کی نظر پڑی اس مضمون میں انھیں دونوں کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "عالمگیر کے مخالفین اسے ہندوکش، علوم و فنون کا برباد کرنے والا، ہندو مذہب کو برباد کرنے والا اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا ثابت کرتے ہیں مگر دوسری دلیلوں اور شہادتوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ اور خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں"۔(۴)

۷- "لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان"(۵)۔ اس میں اصطرلاب اور اس کے ہندوستانی صناعوں کی تفصیلات ہیں۔ یہ دراصل جرمنی کے ایک فاضل ڈاکٹر فان کلیو بر کے استفسار کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا برلن کے عجائب خانہ میں ہندوستان کے ایک اصطرلابی ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ایک کرہ تھا جس پر اس کا نام، تاریخ اور مقام کندہ تھا مگر اس کے علاوہ اس کا کچھ حال معلوم نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فان کلیو بر نے اس سلسلہ میں سید صاحب کو خط لکھا جس میں ضیاء الدین محمد کے وطن، عہد اور فن و شہرت کے متعلق سوال کیے تھے سید صاحب نے اس کے جواب میں یہ تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ اس شاندار مقالہ کا صباح الدین صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا۔

۸- "نالندہ کی سیر"(۶)۔ اس میں نالندہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بدھوں

۱- معارف اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ ۲- یعنی سید صاحب کے دور کے کشمیر۔ ۳- معارف جون ۱۹۲۹ء۔
۴- مقالات سلیمان ج۱، ص ۲۵۳۔ ۵- معارف اگست ۱۹۳۳ء۔ ۶- معارف فروری ۱۹۳۵ء۔

کے زمانہ کے تمام بقیہ آثار ان کی خانقاہیں، مندر، رصد خانے اور عجائب خانے سے متعلق مفید معلومات جمع کیے گئے ہیں اور اس الزام کی تردید بھی ہے کہ نالندہ کی خانقاہ مسلمانوں کے زمانہ میں ان کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہوئی۔

۹- "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" (۱)۔ اس میں تاج محل اور لال قلعہ کے اصل معمار نادر العصر استاذ احمد لاہوری کا ذکر ہے۔ بعض مغربی مورخین نے یہ افسانہ بھی وضع کر رکھا تھا کہ تاج محل کا معمار ایک اطالوی ماہر تھا سید صاحب نے نہایت تحقیق و تدقیق سے ثابت کیا کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار حقیقی استاذ احمد لاہوری تھا۔ اس مقالہ میں استاذ احمد لاہوری کے خاندان اور اس کے ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت بڑی تلاش و جستجو کے بعد پیش کی گئی ہے اور بقول شاہ معین الدین احمد ندوی "تاریخ میں پہلی مرتبہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نادر العصر استاذ احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات اور اس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کی معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاذ احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے، استاذ احمد ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بڑا عالم تھا۔ ان تحقیقات سے وہ تمام افواہیں جو تاج محل کے معماروں کے متعلق مشہور تھیں بے سروپا ہو گئیں۔ (۲)

جناب صباح الدین صاحب نے اس مقالہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۳۴ حصہ اول و دوم میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

۱۰، ۱۱- دسویں مقالہ میں استاذ احمد کے خاندان کی ایک یادگار اور زیب النساء بیگم کے دربار کی ایک تصنیف (۳) بیانیہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ گیارہویں مقالہ میں ملا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل کا تعارف ہے۔ (۴)

۱۲- "قنوج" (۵) اس مقالہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب سیاح، جغرافیہ نویس اور مورخین سندھ میں جس قنوج کا ذکر کرتے ہیں وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ وہ یہی قنوج ہے جو موجودہ ضلع فرخ آباد میں واقع ہے۔

۱۳- "سند معافی جزیہ"۔ اس میں ایک کتاب "نگارنامہ" کے حوالہ سے سند معافی لکھنے کے انداز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱- معارف فروری تا اپریل ۱۹۳۶ء۔ ۲- حیات سلیمان ص ۳۹۹-۴۰۰۔ ۳- معارف مئی ۱۹۳۷ء۔
۴- معارف ستمبر ۱۹۵۰ء۔ ۵- معارف مارچ ۱۹۴۴ء۔

۱۴- چودھواں مقالہ سید صاحب کا وہ خطبہ صدارت (۱) ہے جو انھوں نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس منعقدہ مدراس میں دسمبر ۱۹۲۴ء میں ازمنہ وسطٰی کی تاریخ سے متعلق دیا تھا۔ اس میں انھوں نے ازمنہ وسطٰی کی تاریخ کے ماخذ و مراجع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور مورخوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ تاریخ ہند کی تدوین ایسی ہونی چاہیے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کی فضا ہموار ہو اور ایسی تاریخ نہ لکھی جائے جس سے اتحاد و یکجہتی پارہ پارہ ہو جائے۔

۱۵- "ہندی الاصل اور ہندی النسل مسلمان سلاطین" (۲)۔ اس مقالہ میں سید صاحب نے دہلی، سندھ، ملتان، کشمیر، گجرات اور دکن کے ان سلاطین اور فرمانرواؤں کا ذکر کیا ہے جو اپنی اصل و نسل کے لحاظ سے ہندی یا ہندوی تھے اور دکھایا ہے کہ ان سلاطین نے دوسرے سلاطین کے مقابلہ میں ہندوستان کی کم خدمت نہیں کی۔

مقالات سلیمان جلد دوم

یہ جلد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مرتب کر کے ۱۹۶۸ء میں دارالمصنفین سے شائع کی۔ گو یہ علمی مقالات پر مشتمل ہے مگر اس میں تاریخ سے براہ راست تعلق برقرار ہے۔ ذیل کے تعارف سے یہ ثابت بھی ہو جاتا ہے۔

۱۶- "ہندوستان میں علم حدیث" (۳)۔ اس میں ہندوستان میں علم حدیث کی ابتدائی تاریخ نشر و اشاعت اور عہد بہ عہد ترقیوں کی مختصر تاریخ ہے۔

۱۷- "ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ کے گمشدہ اوراق" (۴)۔

۱۸- "ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے بعض اسباب" (۵)۔ یہ مقالات دراصل سید صاحب کے مقالہ ہندوستان میں علم حدیث کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۹- "رباعی" (۶)۔ اس مقالہ میں صنف رباعی کی وجہ تسمیہ، آغاز، اسباب اور اس کے ناموں پر سیر حاصل بحث ہے جس سے اس کی پوری تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔

۲۰- "عرب و امریکہ"۔ اس مقالہ پر کتاب عربوں کی جہاز رانی کے ضمن میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

۱- معارف مارچ ۱۹۴۵ء۔ ۲- ایضاً اپریل ۱۹۵۱ء۔ ۳- ایضاً اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۸ء۔
۴- ایضاً اکتوبر ۱۹۲۹ء۔ ۵- ایضاً فروری ۱۹۲۹ء۔ ۶- ایضاً اپریل ۱۹۲۲ء۔

۲۱- ''اسلامی رصد خانے''(۱)۔ سید صاحب کا یہ مقالہ ان کی ابتدائی علمی زندگی کی یادگار ہے ۱۹۰۹ء میں یہ مضمون ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اس میں ہندوستان کے اسلامی عہد کے رصد خانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۲- ''کتب خانہ اسکندریہ''(۲)۔ کتب خانہ اسکندریہ پر یورپ کے اعتراضات کی سب سے پہلے علامہ شبلی نے تردید کی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد بعض مغربی اور ان کے ہمنوا مورخین نے اس پر چند اعتراض وارد کیے تو سید صاحب نے اس مقالہ میں ان کی بھرپور تردید علامہ شبلی کے حوالہ سے کی ہے۔

۲۳- ''اسلامی ہندوستان کا عہد آخر اور علوم جدیدہ''(۳)۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں ہندوستان کے عہد اسلامی کے آخری زمانہ میں نئے علوم کے آغاز و ارتقاء کی تفصیل ہے۔

۲۴- ''حجاز کے کتب خانے''۔ اس میں حجاز کے چند کتب خانوں کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے اس میں ان کی بعض کتابوں اور ان کے انداز و ترتیب کی بھی تفصیلات ہیں۔

ان کے علاوہ مقالات سلیمان جلد دوم میں جو تحریریں شامل ہیں ان کی حیثیت علمی زیادہ اور تاریخی کم ہے اس لیے انھیں یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مقالات سلیمان جلد سوم سید صاحب کے قرآنی مقالات کا مجموعہ ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اب یہاں سید صاحب کے ان تاریخی مقالات کے عناوین درج کرتے ہیں جو تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور علوم و فنون کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور معارف کی فائلوں میں بکھرے پڑے ہیں:

۱- ہندوؤں کا ایک عجیب فرقہ (۱/۲۰) تاریخ وفات نبویؐ (۵/۴) سیرت نبویؐ پر ایک نظر (۴/۱۳) دنیائے اسلام میں ذہنی انقلابات (۵/۱۰) برمک اور پرملھ (۴/۶۱) مسئلہ خلافت کے متعلق چند شکوک کا ازالہ (۲/۵) خلفائے اسلام کا اقتداء و اثر (۳/۷) ارض مقدس کی داستان (۴/۱۲) جزیرہ عرب کی تعلیمی حالت (۵/۱۵) سلاطین نجد اور ان کا مذہب (۵/۱۴) سلاطین دہلی کا نظام سلطنت (۱/۵۴) سفر گجرات کی چند یادگاریں (۳/۳۸) لاہور کے مساجد و مقابر (۶/۳۱) انڈیا آفس میں اردو کا خزانہ (۵/۵) اردو کتب خانے (۶/۴۰) وغیرہ۔

۱- ماہنامہ الندوہ مارچ و مئی ۱۹۰۹ء۔ ۲- الندوہ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ ۳- معارف فروری ۱۹۱۷ء۔

سید صاحب کے چند مضامین کو چھوڑ کر تمام مضامین کا تعلق فن تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو سے ہے۔ مستقل تاریخی تصانیف کی طرح فن تاریخ نویسی کے اصولوں اور تحقیق و تدقیق اور تلاش و تفحص کے لحاظ سے یہ اپنی مثال آپ ہیں اور اصلاً یہ سید صاحب کی تحریر کا جوہر خاص ہے بقول شاہ معین احمد ندوی "سید صاحب جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑتے اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے معلوم ماخذوں کے لحاظ سے اس میں اضافہ کی بہت کم گنجائش چھوڑی ہے اور بعض چیزوں میں تو ان کو اولیت کا درجہ حاصل ہے"۔(۱)

یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عموماً اسلام اور مسلمانوں کی تمدنی و تہذیبی زندگی کے کسی گوشہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ سید صاحب اصلاً تہذیبی مورخ تھے اس لیے ان کی ہر تحریر میں اسلامی تہذیب و تمدن کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

خلاصہ

سید صاحب کی مورخانہ فہم و بصیرت اور تاریخی تصانیف اور مضامین و مقالات کے اس طویل اور مبسوط جائزہ و مطالعہ کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ سید صاحب اردو زبان کے ایک بلند پایہ مورخ و محقق تھے اور ان کی پوری زندگی تاریخ و تہذیب اسلامی کے روشن پہلوؤں کی نشاندہی میں گذری اور علم و فن کے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس میں اسلامی تاریخ اور علوم و فنون کی تاریخ کو خاص طور سے بیان کیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ بغیر تاریخ کے لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے۔

۱۔ مقالات سلیمان ج ۲، دیباچہ ص ا۔

باب چہارم

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے تاریخی کارنامے

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لائق فرزند، دارالمصنفین کے ناظم، معارف کے مدیر اور تاریخ اسلام کے بلند پایہ مورخ تھے۔ تاحیات تصنیف و تالیف میں منہمک رہے اور مختلف موضوعات پر تقریباً ایک درجن کتابیں لکھ کر علم و فن کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ حکومت ہند نے ان کی خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا۔

یہاں شاہ صاحب کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کارناموں خصوصاً ان کی تاریخی خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی رودولی ضلع بارہ بنکی (اترپردیش) میں پیدا ہوئے۔ مشہور صوفی بزرگ شیخ احمد عبدالحق توشہ رودولوی علیہ الرحمہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا شاہ شرف الدین سے حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے اس زمانہ کی سب سے معروف دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے جہاں سے ۱۹۲۴ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ ندوۃ العلماء کے ممتاز طلبہ میں ان کا شمار ہوتا تھا مشہور مورخ مولانا سید ریاست علی ندوی ان کے ہم جماعت تھے دونوں ایک ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی کی خواہش پر دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور رفیق (فیلو) بنائے گئے۔

شاہ صاحب جس وقت دارالمصنفین آئے وہ اس کا دور عروج تھا سید صاحب کی شخصیت آفتاب علم بنی ہوئی تھی اور وہ دارالمصنفین کی ترقی کے متعدد منصوبے بنا کر اپنے رفقاء سے تحقیقی کام لے رہے تھے۔ سیرۃ النبیؐ، سیر الصحابہؓ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور اسلامی علوم و فنون کی تاریخ و تدوین کے متعدد منصوبے زیر تکمیل تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کو تاریخ اسلام

کی ترتیب و تدوین کا کام سپرد ہوا جس کی چار جلدیں لکھ کر انھوں نے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا اس کے علاوہ انھوں نے بعض دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں قلمبند کیں لیکن ان کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ "تاریخ اسلام" ہے۔ شاہ صاحب کا کل تصنیفی سرمایہ حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے۔

۱-تاریخ اسلام (اول تا چہارم) ۲-سیر الصحابہؓ (تین جلدیں۔ سوم، ششم، ہفتم)
۳-تابعین ۴-عرب کی موجودہ حکومتیں
۵-اسلام اور عربی تمدن ۶-دین رحمت
۷-حیات سلیمان ۸-ادبی نقوش

شاہ صاحب نصف صدی تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔ یہ طویل مدت ظاہر ہے نشیب و فراز سے خالی نہیں ہو سکتی مگر شاہ صاحب کے پائے استقامت میں کبھی جنبش نہیں آئی۔ انھوں نے اپنے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی یادگار دارالمصنفین کی خدمت کو دنیا کی سب سے بڑی دولت سمجھا۔ ان کے دوست اور نامور اہل قلم مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ایک موقع پر کلکتہ میں تاریخ اسلام کی پروفیسری کے لیے اصرار کیا مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور شاہی پر دارالمصنفین کی فقیری کو ترجیح دے کر علم دوستی اور دارالمصنفین سے اپنے تعلق کو واضح کر دیا۔ ان کی اس عزیمت و استقامت پر سید صاحب نے بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

شاہ صاحب نے جس دور میں دارالمصنفین کی نظامت سنبھالی وہ ہندوستان کا نہایت پُر آشوب دور تھا۔ آزادی کے معاً بعد تقسیم وطن کے عمل سے گوناگوں مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے جن سے دارالمصنفین بھی بہت متاثر ہوا۔ خاص طور پر اس کی مالی اقتصادی حیثیت بڑی ابتر ہو گئی تھی۔ بھوپال اور حیدر آباد کی ریاستیں جن کے تعاون سے دارالمصنفین کے کام انجام پاتے تھے ان کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ ایسے دور آزمائش میں شاہ صاحب نے نہایت صبر و استقلال اور دور اندیشی کے ساتھ دارالمصنفین کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی اس یادگار کو اور اس کے تمام علمی و تحقیقی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی۔ بلکہ تاریخ ہند کی تدوین کا منصوبہ سید صاحب کے تخیل سے بھی زیادہ وسیع کر کے پچیسوں جلد میں شائع کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین میں تاریخ اسلام کی ترتیب و تدوین کا جو منصوبہ بنایا تھا اسے مشرقی و مغربی دو حصوں میں تقسیم کر کے مغربی حصہ کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری مولانا سید ریاست علی ندوی کے ذمہ کی اور مشرقی اسلامی ممالک کی تاریخ کا کام شاہ صاحب کو سپرد کیا گیا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے چار جلدوں میں عہد رسالت سے بنو عباس تک کی مفصل سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ "تاریخ اسلام" کے نام سے لکھی اور ایک جلد میں عرب کی تمام قابل ذکر حکومتوں کی مفصل تاریخ قلمبند کی۔ ان پانچوں جلدوں میں اسلام کی تاریخ کا تفصیلی مرقع آگیا ہے۔ اس سلسلہ تاریخ اسلام کو بہترین و مفید ترین تصور کیا گیا اور اس کی بڑی پذیرائی ہوئی یہاں تک کہ بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی داخل کی گئی۔

دارالمصنفین میں سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام کی تدوین و ترتیب کے ساتھ سیر الصحابہؓ اور اس دور خیر القرون کی تاریخ کی تدوین کا بھی منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اولاً یہ کام مولانا عبدالسلام ندوی کے ذمہ کیا گیا تھا چنانچہ انھوں نے اسوۂ صحابہؓ و صحابیاتؓ لکھ کر اس سلسلہ کی ابتداء کی پھر یہ کام مولانا حاجی معین الدین کے سپرد کیا گیا انھوں نے خلفائے راشدین اور مہاجرین کے نام سے دو جلدیں مرتب کیں لیکن ان کے جانے کے بعد یہ سلسلہ رُک گیا۔ اس عظیم الشان سلسلہ تاریخ کی تکمیل کی ذمہ داری بھی سید صاحب نے شاہ صاحب کے سپرد کی جسے انھوں نے دوسرے رفقائے دارالمصنفین کی مدد سے بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اس سلسلہ کی تین جلدیں (سوم، ششم، ہفتم) خود لکھیں۔

ان سلسلوں کے ساتھ دارالمصنفین نے تابعین کرام کے حالات و کارناموں کو اردو میں مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس لیے کہ علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرامؓ کے سچے اور صحیح اور جانشین تربیت یافتہ تابعین عظامؒ تھے۔ صحابہؓ کرام کے بعد انھیں کا اسوہ مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اس سلسلہ کا پہلا حصہ جو چھیانوے اکابر تابعین کے حالات و کارناموں پر مشتمل ہے تابعین کے نام سے لکھ کر آغاز کیا۔

سید صاحب نے تاریخ ہند کی ترتیب و تدوین کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس کا ذکر تفصیل سے ہم تیسرے باب میں علامہ سید سلیمان ندوی کے تاریخی کارناموں کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ شاہ صاحب نے اسے بھی اپنے دور نظامت میں قدرے مختلف انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچایا اور ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ رفقائے دارالمصنفین کے ذریعہ پچیسوں

جلد میں مرتب کروا کے شائع کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد شاہ صاحب دارالمصنفین کے ناظم بنائے گئے تو دارالمصنفین کے تمام علمی و تحقیقی منصوبوں کی تکمیل کے ساتھ دارالمصنفین کے نئے رفقاء کی تربیت کی ذمہ داری بھی انھوں نے بحسن وخوبی انجام دی اور اس باب میں بھی سید صاحب کے صحیح جانشین ہونے کا ثبوت دیا۔ خود سید صاحب نے اپنے بعد ان کی جانشینی کو پسند کیا ان کے نام ایک خط میں سید صاحب لکھتے ہیں:

"معارف میں آپ اپنے جدید نظام کا ذکر جس طرح چاہیں کریں آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی مسرت اور طمانیت ہے جو کسی روحانی و جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کے دارالمصنفین کا نقشہ دیکھ لیا"۔(۱)

دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف جو اردو کا سب سے بلند پایہ اور معیاری رسالہ تھا اور ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ "یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے"۔ سید صاحب کے بعد اس کی ادارت کی ذمہ داری بھی شاہ صاحب پر آپڑی شاہ صاحب نے اس کے بلند معیار کو بھی باقی رکھا خود سید صاحب جنھوں نے معارف کو (۱۹۱۶ء) جاری کیا تھا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"معارف میں آپ کے شذرات پڑھے الحمد للہ آپ نے شذرات کے وقار کو قائم رکھا س (سید سلیمان ندوی) اور ش (شاہ معین الدین احمد ندوی) میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہو"۔(۲)

غرض یہ کہ شاہ صاحب نے حتی الامکان دارالمصنفین کے علمی و سماجی وقار کو باقی رکھتے ہوئے اسے اوج کمال پر قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے محبوب ادارے کی خدمت کرتے ہوئے ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو دارالمصنفین ہی میں وفات پائی اور اپنے وطن رودولی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

۱- حیات سلیمان ص ۵۹۰-۵۹۱۔ ۲- ایضاً۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

شاہ صاحب کی شخصیت بڑی متنوع تھی وہ ادیب بھی تھے انشا پرداز بھی اور شعر و شاعری کے رمز شناس بھی، مگر ان کا اصل میدان تاریخ وادب تھا۔ انھوں نے تاریخ اسلام کا بڑی وسعت وگہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا اور اس کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی عمیق نظر تھی تاریخ اسلام کی چاروں جلدیں اس کا بہترین ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی نے اپنے تحقیقی مقالے میں درست لکھا ہے کہ:

''شاہ صاحب کا اصل میدان تاریخ وادب تھا اور انھوں نے بیشتر اس کوچہ سے قدم نہیں نکالا''۔(۱)

شاہ صاحب نے تاریخ سے متعلق جو کتابیں لکھیں ان سے ان کے گہرے تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخی کتابوں میں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی ہی کے تاریخی نظریہ کو معیار بنایا اور انھیں اصولوں کو عملی طور پر برت کر معیاری تاریخ نویسی کا فریضہ انجام دیا اور بلند پایہ مورخ تسلیم کیے گئے۔

اس کے باوجود ان کے یہاں علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ سے انحراف بھی پایا جاتا ہے جس کا ذکر ہم ان کی تاریخ نویسی کے تنقیدی جائزہ میں کریں گے۔ یہاں پہلے ان کی تصانیف کا تعارف پھر ان کی تاریخ نویسی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ بحیثیت مورخ ان کی حیثیت اور درجہ و مرتبہ کا اندازہ ہوسکے۔

۱- عرب کی موجودہ حکومتیں

اس کتاب میں جزیرۃ العرب کی تمام قابل ذکر حکومتوں اور ملکوں نجد و حجاز، عسیر، یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق اور فلسطین و شام کے مختصر اور جامع حالات و واقعات اور ان کی تاریخ اور ان حکومتوں کا مفصل جغرافیہ لکھا گیا ہے جس سے اس عہد کے جزیرۃ العرب کی سیاسی تمدنی اور جغرافیائی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں اولاً عرب کا جغرافیہ تحریر کیا گیا ہے جو مکہ مکرمہ میں مقیم ایک طالب علم کے قلم سے ہے جس کا نام نہیں لکھا گیا ہے حالانکہ اس کا نام لکھنا چاہیے تھا۔ دوسرا حصہ شاہ صاحب کے قلم سے ہے جس میں عرب کی قابل ذکر

۱- دارالمصنفین کی ادبی خدمات ص ۶۲۔

حکومتوں کی تاریخ ہے۔

اس تاریخی کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ظاہری حالات کے ساتھ ملک کی اندرونی حالت، دوسرے ممالک سے ان کے تعلقات اور اقوام عالم میں ان کی سیاسی حیثیت پر بھی فاضل مورخ نے روشنی ڈالی ہے۔

کتاب معتبر و مستند مراجع کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ ملوک العرب، خطط الشام، تاریخ یمن، العرفان اور عراق کی تعلیمی روداد اس کتاب کا بنیادی ماخذ ہیں۔ البتہ یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ اس موضوع کی دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا تھا اور کتاب کو اور جامع انداز میں لکھا جا سکتا تھا مگر مصنف نے نہ معلوم کس بنیاد پر اس اہم تحقیقی فریضے سے اغماض برتا۔

اس کمی کے باوجود یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی تین عشروں کی عربوں کی بیشتر تاریخ اس میں آگئی ہے اس کتاب کو دارالمصنفین نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔

۲۔ تاریخ اسلام جلد اول

یہ کتاب منصوبہ تاریخ اسلام کی پہلی کڑی ہے اس میں عہد رسالت و خلافت راشدہ کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ مقدمہ میں آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے کے عرب کی تاریخ اور اس کے قدیم جغرافیہ پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے وفات تک کے حالات و سوانح، اخلاق و فضائل اور اس انقلاب آفریں عہد کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ مختصراً پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ ابواب میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، نیز حضرت حسن بن علیؓ کے حالات و سوانح اخلاق و فضائل و مناقب اور عہد خلافت راشدہ کے ہر طرح کے سیاسی، تہذیبی اور علمی واقعات، فتوحات اور نظام خلافت وغیرہ کی مفصل تاریخ معتبر و مستند ماخذوں سے بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب دارالمصنفین نے پہلی بار ۱۹۳۹ء میں شائع کی۔

۳۔ تاریخ اسلام جلد دوم

تاریخ اسلام کی اس دوسری جلد میں بنی امیہ کے سو سالہ دورِ حکومت کی تاریخ بیان

کی گئی ہے۔ شروع میں خاندان بنوامیہ کی مختصر تاریخ تحریر کی گئی ہے پھر دولت اموی کے بانی حضرت امیر معاویہؓ سے لے کر آخری اموی حکمران مراون ثانی (۱۲۷-۱۳۲ھ) تک کے حکمرانوں کے حالات اور ان کے عہد حکومت کی ہر طرح کی سیاسی، علمی تاریخ معتبر مراجع کے ذریعہ قلمبند کی گئی ہے۔ ہر حکمران کے عہد حکومت پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی ترقی اور پھر تنزل کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس عہد کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اس حصہ میں مندرجہ ذیل اموی حکمرانوں کے عہد کی تاریخ لکھی گئی ہے:

معاویہ بن ابی سفیان (۶۶۱-۶۶۹ء) یزید اول بن معاویہؓ (۶۸۰-۶۸۳ء) معاویہ ثانی بن یزید (۶۸۵ء) مروان بن حکم (۶۸۵-۶۸۶ء) عبدالملک بن مروان(۱) (۶۸۶-۷۰۷ء) عبدالملک بن مروان (۶۹۳-۷۰۵ء)(۲) ولید بن عبدالملک (اول) (۷۰۵-۷۱۳ء) سلیمان بن عبدالملک (۷۱۷-۷۱۹ء) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷-۷۱۹ء) یزید بن عبدالملک (۷۱۹-۷۲۳ء) ہشام بن عبدالملک (۷۲۳-۷۴۴ء) ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک (۷۴۳-۷۴۴ء) یزید ثالث بن ولید (۷۴۴ء) ابراہیم بن ولید بن عبدالملک (۷۴۴-۷۴۵ء) مروان ثانی بن محمد بن مروان (۷۴۵-۷۴۹ء)۔

ان حکمرانوں کے حالات، ملکی فتوحات اور نظام حکومت کی تفصیل کے بعد سلطنت بنی امیہ کے زوال کے اسباب بیان کیے گئے ہیں آخر میں اس عہد کی علمی حالت اور علوم وفنون کی ترقی، ایجادات وغیرہ پر خاص طور سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے سیاسی تاریخ کے ساتھ اس عہد کی علمی تاریخ کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ اسلام کا یہ حصہ بھی معتبر و مستند مراجع کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

۴- تاریخ اسلام جلد سوم

تاریخ اسلام کے اس حصہ میں خلافت عباسیہ کی دوسو برسوں کی مفصل تاریخ قلمبند کی گئی ہے اور خلافت عباسیہ بغداد کی ابتداء ابوالعباس سفاح (۱۳۲ھ) سے لے کر ابواسحاق متقی باللہ (۳۳۲ھ) تک عباسی حکمرانوں کے حالات وکارنامے اور ان کے عہد خلافت کے مفصل

۱- یہ زمانہ عبداللہ زبیر اور عبدالملک بن مروان کی مشترک حکومت کا ہے۔ کتاب میں دونوں کی تفصیلات درج ہیں۔
۲- یہ عبدالملک بن مروان کا خالص دور حکومت ہے۔

سیاسی تہذیبی اور تمدنی حالات وواقعات کی تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے۔ اس کتاب سے دولت عباسیہ کے ابتدائی دو سو برسوں کی تاریخ سامنے آجاتی ہے اسے دار المصنفین نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔

۵۔ تاریخ اسلام جلد چہارم

یہ تاریخ بنو عباس کا دوسرا حصہ ہے اس میں مستکفی باللہ (۳۳۳-۳۳۴ھ) سے لے کر آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ (۶۴۰-۶۵۵ھ) تک کی خلافت کی سیاسی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔ اس حصہ میں مندرجہ ذیل خلفائے بنو عباس کے حالات اور ان کے عہد حکومت کی تاریخ ہے۔

مستکفی باللہ (۹۴۴-۹۴۵ء) مطیع اللہ (۹۴۵-۹۷۴ء) طائع للہ (۹۷۴-۹۹۱ء) قادر باللہ (۹۹۱-۱۰۳۱ء) قائم بامر اللہ (۱۰۳۱-۱۰۷۴ء) مقتدی بامر اللہ (۱۰۷۴-۱۰۹۴ء) مستظہر باللہ (۱۰۹۴-۱۱۱۸ء) مسترشد باللہ (۱۱۱۸-۱۱۳۴ء) راشد باللہ (۱۱۳۴-۱۱۳۵ء) مقتفی لامر اللہ (۱۱۳۵-۱۱۶۰ء) مستنجد باللہ (۱۱۶۰-۱۱۷۰ء) مستضئی بامر اللہ (۱۱۷۰-۱۱۷۹ء) ناصر لدین اللہ (۱۱۷۹-۱۲۲۵ء) ظاہر بامر اللہ (۱۲۲۵-۱۲۲۶ء) مستنصر باللہ (۱۲۲۶-۱۲۴۳ء) معتصم باللہ (۱۲۴۱-۱۲۵۷ء)۔

اسی حصہ میں مصر کی خلافت عباسیہ کی بھی ۶۵۹-۹۲۳ھ تک کی اجمالی سیاسی تاریخ اور حکمرانوں کے عہد کے حالات وواقعات لکھے گئے ہیں، اس طرح یہ حصہ دولت عباسیہ کی تاریخ کا مکمل مرقع ہو گیا ہے۔ آخر میں عہد عباسیہ کے تہذیبی و تمدنی کارناموں پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب جس عہد کی تاریخ ہے اسی عہد میں عباسیوں کا زوال شروع ہوا جسے بالآخر تاتاریوں کے طوفان نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اسی عہد میں ویلمیوں اور سلجوقیوں کا علم اقبال بلند ہوا اس لیے ضمنی طور پر ان کی بھی اجمالی تاریخ اس میں آگئی ہے۔ ان کے علاوہ غزنوی، نابکی، ایوبی اور خوارزمی وغیرہ متعدد بڑی بڑی حکومتیں چونکہ اسی دور میں قائم ہوئیں اس لیے ان کی بھی مختصر تاریخ اس کتاب میں بیان ہوئی۔ خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"یہ خلافت بغداد کے ساتھ اس زمانہ کی مشرق کی بڑی بڑی

حکومتوں کے اہم حالات و کوائف کی بھی اجمالی تاریخ بن گئی ہے اور اس کے مطالعہ سے دنیائے اسلام خصوصاً مشرق کے چار صدیوں کے سیاسی مد و جزر کا نقشہ سامنے آجاتا ہے"۔(۱)

تاریخ اسلام کی چاروں جلدیں شاہ صاحب بلکہ دارالمصنفین کی انتہائی مقبول ترین کتابیں ہیں۔ اب تک ان کے بیسیوں ایڈیشن بڑی تعداد میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں اور ملک کی بعض یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں بھی یہ کتابیں شامل ہیں اور تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے بے حد مفید و کارآمد ہیں۔

۶-سیر الصحابہؓ جلد سوم

یہ دارالمصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہؓ کی تیسری جلد ہے اور مہاجرین دوم کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ان مہاجر صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح اور ان کی مذہبی و سیاسی خدمات کا مرقع مستند ماخذوں سے پیش کیا گیا ہے جو فتح مکہ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہر صحابی کے نجی حالات کے ساتھ ان کے عہد کے بعض ملکی اور سیاسی کارنامے اور تمدنی ترقیات کے واقعات بھی اس میں آگئے ہیں جس سے یہ کتاب تاریخ و تذکرہ کا دلکش امتزاج بن گئی ہے۔

۷-سیر الصحابہؓ جلد ششم

سیر الصحابہؓ کی اس جلد میں چار صحابہ کرامؓ حضرت امام حسنؓ، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات زندگی، اخلاق و کردار فضائل و مناقب اور ان کے مذہبی سیاسی اور اخلاقی مجاہدوں اور کارناموں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ یہ چاروں حضرات گو زمانہ و عمر کے لحاظ سے اکابر صحابہؓ کے صف کے نہیں ہیں لیکن مذہبی اور سیاسی اہمیت کی وجہ سے ان کی اہمیت کچھ کم بھی نہیں ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر یہ جلد ان کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔ مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کے عہد کی تاریخ بھی اس میں آجائے اور یہ واقعہ ہے کہ اس میں اس عہد کے اہم سیاسی مذہبی اور بعض تمدنی حالات آگئے ہیں۔

ان حضرات کے حالات میں سیاسی نشیب و فراز بڑے نازک ہیں لیکن مصنف نے

۱- تاریخ اسلام ج ۴، ص ۲۔

راہ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا ہے اور اعتدال و توازن کا وہی نمونہ پیش کیا ہے جس کی نظیر ان کے پیش رو بزرگوں کی تصنیفات میں موجود ہے۔

اس کتاب میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ معتبر و مستند مراجع سے لکھا گیا ہے یہ معتبر کتاب دارالمصنفین نے ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع کی اب تک اس کے بھی کئی ایڈیشن چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

۸- سیر الصحابہؓ جلد ہفتم

یہ سلسلہ سیر الصحابہؓ کی آخری جلد ہے اسی کتاب پر یہ سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ علامہ شبلی کی خواہش کے مطابق سید صاحب نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا جو بالآخر شاہ صاحب کے ہاتھوں سے پورا ہوا خود شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> "دارالمصنفین سالہا سال سے جس مقدس چمن کی آبیاری میں مصروف تھا آج اس کا آخری گلدستہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ یعنی سیر الصحابہؓ کا جو عظیم الشان سلسلہ برسوں سے چل رہا تھا وہ بحمد اللہ اس جلد پر تمام ہو گیا"۔(۱)

اس میں ایک سو پچاس ایسے صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا، یا فتح مکہ سے پہلے ہی مشرف باسلام ہوئے مگر ہجرت نہ کر سکے نیز ان صحابہ کرامؓ کا بھی ذکر ہے جو عہد رسالت میں صغیر السن تھے۔

سیر الصحابہؓ کی دوسری جلدوں کی طرح اس میں بھی صحابہ کرامؓ کے حالات کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے آخری زمانہ اور تابعین عظام کے ابتدائی دور کے بعض اہم سیاسی و تاریخی واقعات آگئے ہیں۔

۹- تابعین

اس میں صحابہ کرامؓ کے فیض یافتہ چھیانوے اکابر تابعین کرامؒ کے سوانح زندگی اور ان کے مذہبی اصلاحی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل تحریر کی گئی ہے۔ شروع میں مصنف کے قلم سے دیباچہ ہے جس میں کتاب کی اہمیت و ضرورت اور اس کے مشتملات کا ذکر ہے مقدمہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے قلم سے ہے۔

۱- سیر الصحابہؓ جلد ہفتم دیباچہ ص ۷۔

یہ کتاب بنیادی طور پر تابعین عظامؒ کا تذکرہ ہے تاہم اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ عہد تابعین کے بعض سیاسی اور تمدنی واقعات بھی آ گئے ہیں۔ خود مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

"اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اکابر تابعین کرامؒ کے علمی و اخلاقی اور مذہبی کارناموں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس عہد کی پوری علمی و اخلاقی تاریخ سامنے آ جائے"۔(۱)

اس شعوری کوشش سے یہ تاریخ و تذکرہ کی مشترک کتاب ہو گئی ہے۔ تابعین اور ان کے عہد زریں پر اردو زبان میں یہ پہلی مفصل کتاب تھی جسے دارالمصنفین نے قوم کے سامنے پیش کیا۔

۱۰-اسلام اور عربی تمدن

یہ کتاب شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا شاہ صاحب کے قلم سے اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر مغربی مصنفین اور اہل قلم کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے علمی، اخلاقی اور تمدنی احسانات اور ان پر مسلمانوں کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ آخر میں مسلمانوں کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دارالمصنفین نے ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔

۱۱-ادبی نقوش

یہ شاہ صاحب کے نو علمی و ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعض مضامین مثلاً "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی اہمیت" ادب و انشاء اور تحقیق و تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہیں اسے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔

۱۲-دینِ رحمت

اسلام ایک دین رحمت ہے اس کتاب میں اسی ایجاز کا اطناب ہے۔ شاہ صاحب نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ اسلام بلا تفریق مذہب و ملت پوری کائنات کے لیے سراسر عدل و

۱-تابعین دیباچہ ص۵۔

انصاف اور رحمت ہے۔

یہ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے آخری دو ابواب مسلمانوں کے علوم و فنون کی تاریخ پر مشتمل ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب غیر تاریخی موضوعات میں بھی تاریخ کی جزئیات سے بے نیاز نہیں ہو پاتے تھے یہ کتاب دارالمصنفین سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔

۱۳-حیات سلیمان

یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری ہے اور حیات شبلی ہی کی طرح ضخیم اور اسی کے انداز سوانح نگاری کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اس میں سید صاحب کی تحریروں کے اقتباسات کثرت سے دیئے گئے ہیں اس لیے اس کی حیثیت سوانح کے ساتھ خودنوشت کی بھی ہوگئی ہے اور صحت واقعہ بھی مسلم ہوگئی ہے۔

شاہ صاحب نے کتاب کی ترتیب سنین کے لحاظ سے رکھی ہے اور اسے نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں وطن، خاندان، ولادت اور تعلیم و تربیت کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں تعلیم سے فراغت اور قیام دارالمصنفین سے پہلے کے حالات و خدمات کا بیان ہے۔ تیسرا باب دارالمصنفین کے قیام اور اس کی ابتدائی خدمات اور بعض تصانیف کے ذکر پر مشتمل ہے۔ چوتھے باب میں قومی و سیاسی خدمات کی تفصیل ہے۔ پانچویں باب میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۴ء تک کے سید صاحب کے حالات و کارناموں کا مفصل تذکرہ ہے۔ چھٹے باب میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات اور قومی و ملی خدمات کا بیان ہے۔ ساتویں باب میں قیام بھوپال کے حالات ہیں آٹھویں باب میں ہجرت اور قیام پاکستان کی روداد زندگی ہے۔ نویں باب میں ذاتی حالات اور اخلاق و عادات کی تفصیل ہے آخر میں وفات پر لکھے جانے والے مراثی و قطعات درج کیے گئے ہیں۔ ضمیمہ میں بعض اہم شذرات معارف کے اقتباسات سے ان کے قومی و ملی احساسات پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ سید صاحب کی سوانح عمری کے ساتھ عہد سلیمانی کی تاریخ بھی ہوگئی ہے۔ خود شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ:

> "مولانا شبلی کے کاموں کی مدت بتیس سال ہے اور سید صاحب کی تقریباً نصف صدی۔ اس طویل مدت میں انھوں نے گوناگوں مذہبی،

علمی، تعلیمی، قومی و ملی اور سیاسی کام انجام دیئے اس لیے اس کتاب میں سید صاحب کی سوانح کے ضمن میں اس دور کے ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی ہر قسم کی تاریخ آ گئی ہے"۔(۱)

یہ سوانح عمری دارالمصنفین نے ۱۹۷۴ء میں شائع کی اب تک اس کے تین ایڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔

تاریخی مقالات

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب نے متعدد موضوعات پر مقالات و مضامین بھی سپرد قلم کیے ہیں جنھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے یہ مقالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں اس کے باوجود معارف کی فائلوں میں بکھرے پڑے ہیں یہاں ان کے چند اہم مقالات کے عناوین لکھے جاتے ہیں۔

تابعین اور ان کے علمی و مذہبی کارنامے (۲۸/۴-۵) (۲) تدوین قرآن (۶۲/۲) انیس الحجاج ہندوستان کا فارسی زبان میں پہلا سفر نامہ (۹۳/۱) پنڈوہ اور لکھنوتی کے چند آثار۔ تیموری عہد کی خطاطی اور مشہور خطاط (۹۲/۲) وغیرہ۔

ان مقالات کے علاوہ شاہ صاحب کے دور نظامت میں دارالمصنفین سے تاریخ کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان پر ان کے چھوٹے چھوٹے دیباچے بھی شاہ صاحب کے مورخانہ شعور اور وسیع تاریخی مطالعہ کا پتہ دیتے ہیں۔

شذرات معارف

مولانا سید سلیمان ندوی کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد شاہ صاحب کے ذمہ دارالمصنفین کے دوسرے کاموں کے ساتھ معارف کی ادارت بھی آئی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے معیار کو پوری طرح باقی رکھا جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے لکھ آئے ہیں۔

معارف میں ہر ماہ شذرات خاصے کی چیز ہوتے ہیں اور ان میں ملک و ملت کے مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ آج شذرات کی حیثیت تاریخ کے ایک بنیادی ماخذ کی ہے۔ شاہ صاحب نے تقریباً تیس برس تک شذرات لکھے کوئی بھی مورخ جب ہندوستان کی تاریخ

۱۔ حیات سلیمان دیباچہ ص ۴۔ ۲۔ ۲۸/۴-۵ سے مراد معارف جلد ۲۸ شمارہ ۴ اور ۵ ہے۔

لکھے گا تو تاریخ کے اس بنیادی ماخذ سے صرف نظر نہیں کر سکے گا۔ یقیناً شذرات معارف بھی شاہ صاحب کے علمی وادبی و تاریخی ذوق وصلاحیت کا بہترین نمونہ ہیں۔

دارالمصنفین نے سید صاحب کے شذرات کو دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے ضرورت ہے کہ شاہ صاحب کے شذرات بھی جدید انداز میں مرتب کر کے شائع کیے جائیں۔

شاہ صاحب کی تصانیف کی موضوعاتی حیثیت

پچھلے صفحات میں ہم نے شاہ صاحب کی کتابوں کا ایک مختصر اور جامع تعارف پیش کیا ہے اور ان میں تاریخ کے عناصر کی نشاندہی کی ہے یہاں ان کی موضوعاتی حیثیت واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے کل تیرہ کتابیں لکھیں ان میں صرف پانچ کتابوں کا تعلق تاریخ سے ہے۔ مثلاً تاریخ اسلام چار جلدیں اور عرب کی موجودہ حکومتیں۔ ان کے علاوہ سیر الصحابہؓ کے تین حصے اور تابعین بنیادی طور پر تذکرہ کی کتابیں ہیں، تذکرہ تاریخ نہیں بلکہ تاریخ کا ماخذ ہے اس لیے ان کی اصل حیثیت تاریخ سے زیادہ تذکرہ کی ہے ان میں تاریخ کے جو عناصر پائے جاتے ہیں گذشتہ صفحات میں ان کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اسی طرح ادبی نقوش خالص ادبی اور دین رحمت خالص مذہبی کتابیں ہیں۔ البتہ حیات سلیمان کے سلسلہ میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ وہ اگرچہ سوانح عمری ہے مگر یہ اردو میں عام طور پر لکھی جانے والی سوانح عمریوں سے اس لیے ممتاز ہے کہ یہ تاریخی سوانح عمری ہے جس کی ابتداء علامہ شبلی نے الفاروقؓ اور المامونؒ کے ذریعہ کی تھی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت عائشہؓ اور حیات شبلی لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا تھا۔ حیات سلیمان اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اور سوانح عمری ہونے کے ساتھ تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ سوانح عمری تاریخ نہیں قرار دی جا سکتی البتہ محققین نے سوانح کو بھی تذکرہ وسفر نامہ کی طرح تاریخ کا بنیادی ماخذ و مرجع قرار دیا ہے، حیات سلیمان کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

تاریخی تصانیف نظریہ تاریخ کی روشنی میں

شاہ صاحب کی تصانیف پر موضوع کے لحاظ سے بحث کرنے کے بعد ان کی خالص تاریخی تصنیفات کی روشنی میں ان کی تاریخ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس

سے پہلے شاہ صاحب کے نظریہ تاریخ کے سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نگاری میں ان کا ذوق و رجحان اور نقطہ نظر وہی ہے جو ان کے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ شبلی کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تصانیف میں دبستان شبلی ہی کے اصولوں کی پاسداری کی ہے البتہ بعض مقامات پر ان اصولوں کو پوری طرح برت نہیں سکے ہیں جن کی نشاندہی آئندہ صفحات میں ہم پیش کریں گے۔

۱- ایک جامع و مکمل تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں زیر تحریر عہد کے ہر طرح کے حالات لکھے جائیں۔ مثلاً ان میں حکمرانوں کی فتح و شکست، تخت نشینی اور معزولی کیساتھ اس عہد کے عام حالات نیز مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور علمی حالات بھی لکھے جائیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اپنی تاریخی تصانیف خصوصاً تاریخ اسلام کی چاروں جلدوں اور "عرب کی موجودہ حکومتیں" میں اس اصول کا پوری طرح پاس و لحاظ رکھا ہے۔ جہاں انھوں نے عہد رسالت، خلافت راشدہ، بنوامیہ اور بنوعباس کے سیاسی حالات لکھے ہیں وہیں ان ادوار کی علمی و تعلیمی اور تہذیبی و تمدنی تاریخ بھی قلمبند کی ہے۔ بلکہ شاہ صاحب نے تمدنی تاریخ کو خاص طور سے لکھا ہے۔ تاریخ اسلام کی اس خصوصیت کا سید صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "اس پورے سلسلہ میں اسلام کے اخلاقی اثرات اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی اسلام سے پہلے دنیا کی اخلاقی حالت کیا تھی، اسلام نے کیا سبق دیا، اپنی تعلیم کے اس نے کیسے نمونے پیدا کیے، مسلمانوں نے خود کہاں تک اس تعلیم پر عمل کیا اور دوسروں کے ساتھ کہاں تک اس کو برتا، دنیا پر اس کے اثرات کیا پڑے اور انسانیت کو اس سے کیا فوائد پہنچے، مسلمانوں نے علم و فن کی کیا خدمت کی اور انسانی تہذیب و تمدن کا قدم کہاں سے کہاں پہنچایا"۔(۱)

عام طور پر ایک واقعہ کے بارے میں اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے اس لیے مورخ کا یہ اہم فریضہ ہے کہ واقعہ کی صحت کی تعیین کے بعد ہی اسے تحریر کرے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو دبستان شبلی کے مورخوں بلکہ تمام اسلامی مورخین نے مورخ کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب نے بھی صحت و صداقت کا اپنی تاریخوں میں خاص خیال رکھا ہے اور جو کچھ

۱- مقدمہ تاریخ اسلام ج۱، ص ۱۴۔

لکھا ہے وہ معتبر و مستند ماخذوں سے لکھا ہے۔ انھیں کے الفاظ میں "ہر حکومت کے حال میں حتی الامکان مستند ترین عربی و فارسی ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے"۔(۱)

اس اصول کی پاسداری کا اندازہ کتاب کے حوالوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو صفحہ صفحہ پر کثرت سے دیئے گئے ہیں۔ البتہ کتاب میں یہ بحث اکثر درج نہیں کی گئی ہے کہ جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ کیوں کر صحیح ہے اور جو واقعہ نظر انداز کیا گیا ہے وہ کیوں سچ نہیں تھا۔ یہ عذر کہ اسے طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا گیا ہے کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جہاں یہ تفصیلات موجود ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعات کی تعیین صحت میں روایت و درایت کے اصولوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ تاریخ اسلام کی اس خوبی کا اعتراف محقق اعظم مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے مقدمہ میں کیا ہے۔(۲)

۳- تاریخ نویسی میں واقعات کے اسباب و علل کی تلاش علم تاریخ کی روح ہے کیونکہ واقعات کی اصلیت بغیر اسباب کے علم کے واضح نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کے پیش نظر شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں واقعات کے اسباب و علل کا سراغ بھی لگایا ہے۔ مثلاً بنو امیہ کے عروج و زوال کے اسباب یا دولت عباسیہ کے عروج و زوال کے اسباب وغیرہ۔ شاہ صاحب نے تفصیل سے تاریخ کے ان پوشیدہ راز کے اسباب کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے حتی کہ ضمنی واقعات میں بھی ان کا سراغ لگایا گیا ہے، یہاں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

شاہ صاحب ابن سبا کی فتنہ انگیزی کے ذکر کے بعد اس کی کامیابی کے اسباب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہودیوں کے بعد مسلمانوں کے دوسرے دشمن اہل عجم تھے جن کی حکومت انھوں نے مٹائی تھی۔ ان کی فطرت میں شاہ پرستی تھی ابن سبا اہل بیت کے داعی کے لباس میں تھا اس لیے سرزمین عجم میں اس کی تحریک کو بڑا فروغ ہوا، گو عجمیوں کا نقطہ نظر اس سے مختلف تھا۔ ابن سبا کا مقصد مسلمانوں کا شیرازہ درہم برہم کرنا تھا اور اہل عجم چاہتے تھے کہ اسلامی خلافت ایسے موروثی قالب میں ڈھل جائے کہ ان کی خدمات یعنی حمایت اہل بیت کے صلہ میں ان کو حکومت میں زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل ہو جائیں

۱- مقدمہ تاریخ اسلام ج ۴، ص ۲۔ ۱- ایضاً ج ۱، ص ۱۴۔

اس لیے عراق وغیرہ میں ابن سبا کی تحریک زیادہ بار آور ہوئی۔

ان طبقوں کے علاوہ بعض مخلص مسلمان بھی اس کے فریب میں اس طرح آگئے کہ بعض نوجوان عثمانی عمال میں جو عہد سعادت کے فیض تربیت سے محروم تھے صحابہ کرامؓ کے جیسا اخلاص و تدین نہ تھا پھر حضرت عثمانؓ میں فاروقی صولت نہ تھی جس سے بڑے بڑے مدبرین اور فتنہ پرست تھراتے تھے۔ بلکہ آپ فطرۃً نہایت نرم خو، حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے آپ میں عفو ودرگذر کا مادہ زیادہ تھا اس لیے آپ کے عمال سے جو بے عنوانیاں سرزد ہوتی تھیں گو علم کے بعد آپ ان کا پورا تدارک کرتے تھے، لیکن بہت سی باتیں علم ہی میں نہ آتی تھیں اور بعض بے عنوانیوں میں اپنی فطری نرمی کی بنا پر چشم پوشی بھی کرتے جاتے تھے۔ اس طرح مخالفین کو بدنام کرنے کا موقع بہر حال مل جاتا تھا۔ اس لیے بعض مخلص اور خیر خواہ خلافت سادہ مزاج بزرگوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا ہوگئے۔

ابن سبا نے دعاۃ کے ذریعہ اور تحریری پروپگنڈے کے علاوہ خود عراق اور مصر وغیرہ میں جاکر خفیہ جماعتیں قائم کیں۔ سب سے اول ۳۳ھ میں عبداللہ بن عامر والئ بصرہ کو اس سازش کا علم ہوا انھوں نے اس کو اپنے یہاں سے نکالا یہاں سے نکل کر وہ کوفہ پہنچا کوفہ سے بھی نکال دیا گیا تو آخر میں مصر کو اپنا مستقر بنایا۔

غرض مذکورہ اسباب کی بنا پر قریب قریب ہر جگہ ابن سبا کے پروپگنڈے کا کچھ نہ کچھ اثر پڑ گیا۔ خصوصاً عراق جس میں مختلف قوموں کی مخلوط آبادی کی وجہ سے شر و فساد کی فطری صلاحیت تھی اس فتنہ کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ کوفہ اور بصرہ میں علانیہ حضرت عثمانؓ کے مخالف پیدا ہوگئے"۔(۱)

۴- واقعات کے اسباب و علل کے ذریعہ تاریخ میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے مورخ کو قیاس واستنباط سے کام لینا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے مورخ کو اصل واقعہ سے قیاس واجتہاد کو مخلوط نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے اس نقطہ نظر سے جب ہم مولانا شاہ

۱- تاریخ اسلام ج۱، ص ۲۲۴-۲۲۵۔

معین الدین احمد ندوی کی تاریخی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اصل واقعہ سے قیاسی رائے کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قیاس واجتہاد سے جو رائے قائم کی ہے اس کی بنیاد مضبوط دلائل اور قرین قیاس پس منظر کے ساتھ مستند ترین ماخذوں پر رکھی ہے۔ مثلاً انھوں نے تاریخ اسلام کی چاروں جلدوں میں ہر عہد حکومت یا ہر حکمراں کے عہد کے سیاسی و علمی و تہذیبی واقعات لکھنے کے بعد اس عہد پر مورخانہ تبصرہ کر کے اس اصول تاریخ کی پاسداری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سیاسی واقعات اور علمی و تمدنی واقعات علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔

۵- تاریخ نگاری کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ مورخ تاریخ سے متعلقہ علوم کا کسی قدر واقف کار ہو۔ کیونکہ مورخ اگر ان علوم میں درک نہ رکھتا ہوگا تو وہ اصل واقعہ کی روح تک رسائی نہ حاصل کر سکے گا۔ راقم الحروف شاہ صاحب کی تاریخی تصانیف کے متعدد بار مطالعہ کے بعد بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی تاریخوں میں جن واقعات کا تعلق دوسرے علوم و فنون سے تھا شاہ صاحب ان پر پوری نظر رکھتے تھے۔ مثلاً اموی دور کی تاریخ لکھتے ہوئے شاہ صاحب نے اس عہد کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے جس سے فن شاعری میں ان کی مہارت و صلاحیت اور اس کے رموز و نکات پر ان کی وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں گو شاعری کا مذاق قائم رہا تھا لیکن اخلاقی پابندی کی وجہ سے ان کا پرانا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور کلام مجید کے اعجاز کے سامنے بھی اس کا زور گھٹ گیا تھا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں خلفائے راشدینؓ کے عہد کی قید و بند ختم ہوگئی اور خود اموی خلفاء سخن سنج اور شاعری کے قدردان تھے۔ ان کی قدردانی کی وجہ سے شاعری کا بازار پھر گرم ہوگیا اور اس میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے ترقی ہوئی اور بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے۔ چنانچہ اخطل، جریر، فرزدق، اعشی، نابغہ، کمیت وغیرہ فحول شعراء جنھوں نے اسلامی دور کو چمکایا سب اسی زمانہ میں تھے۔
>
> شاعری کی ترقی میں اس زمانہ کے سیاسی حالات سے بھی مدد ملی۔
>
> اموی عہد میں قبائلی، سیاسی اور مذہبی اختلافات کی وجہ سے علوی، شیعی،

عثمانی، خارجی مختلف مذہبی و سیاسی جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں جو باہم حریف تھیں۔ عرب میں پروپگنڈے کا بڑا ذریعہ شاعری تھی، شعراء کی تیغ زبان کی کاٹ شمشیر آبدار سے کم نہ تھی، اس لیے اس زمانہ میں جماعتی شعراء کی بڑی تعداد پیدا ہو گئی تھی۔ نعمان بن بشیر انصاری، یزید بن ربیعہ المعروف بہ ابن مضرغ، یمن بن خریم وغیرہ علویوں کے حامی تھے، مسکین دارمی، عبداللہ بن خارجہ المعروف بہ اعشی اموی تھے اور طرماح بن عدی، عمران بن حطان، عبداللہ بن حجاج، زبیانی خارجیوں اور آل زبیر کے حمایتی تھے۔

ان کے علاوہ ان شعراء کی بھی بڑی تعداد ہے جو کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھتے تھے مثلاً جمیل بن معمر، عمران بن ابی ربیعہ، عبداللہ بن قیس الرقیات، کثیر وغیرہ ابن عبادہ، احوص، ذی الرمہ، سعید دارمی، عبید بن حصین، عبداللہ بن خارجہ اور نسیلی لاغیلیہ وغیرہ۔

کیفیت کے اعتبار سے بھی شاعری کا رنگ بہت نکھرا۔ بنی امیہ کو عربوں کی خصوصیات کے تحفظ میں بڑا اہتمام تھا اس لیے انھوں نے عربوں کو دوسری قوموں میں ضم نہیں ہونے دیا اور عربی زبان آمیزش سے محفوظ رہی۔ لیکن اس کے تمدنی اثرات سے وہ بچ نہ سکے اس لیے عربی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی اور عراق و شام کے تمدن اور ان کے باغات و سبزہ زاروں نے عربی شاعری کا رنگ بدل دیا اور اس میں عربوں کے سادہ بدویانہ جذبات اور بے آب و گیاہ صحرا کے خشک اور محدود مضامین کے بجائے بڑا تنوع اور رنگینی پیدا ہو گئی اور اس دور کی شاعری خیالات کی لطافت و رنگینی کے لحاظ سے عرب کی جاہلی شاعری سے بہت بڑھ گئی۔ قصائد، تغزل اور تشبیب میں اس کا اثر نمایاں نظر آتا ہے"۔(۱)

اس طویل اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب کی نظر عربوں کی شاعری پر کس قدر وسیع تھی۔

اسی طرح تاریخ اسلام کے چاروں حصوں میں سیاسی مباحث میں شاہ صاحب

۱۔ تاریخ اسلام ج ۲، ص ۳۴۲-۳۴۳۔

ماہر سیاسیات اور اخلاقی مباحث میں ماہر علم الاخلاق ہوتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اس کی مثالیں یہاں نہیں دی جارہی ہیں۔

۶-ان کا ایک نمایاں وصف ان کی مورخانہ غیر جانب داری بھی ہے۔ یہ مورخ کی ایک اہم خصوصیت ہے جس سے شاہ صاحب متصف ہیں ان کی تصانیف میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے کسی حکمراں یا کسی عہد کی تاریخ میں کسی قسم کی جانبداری برتی ہے ان سے ان کا یہ نظریہ بھی سامنے آتا ہے کہ

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں

مثلاً تاریخ اسلام کے چوتھے حصہ میں انھوں نے دولت عباسیہ کی تاریخ لکھی ہے اس کے تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عباسیوں کے علمی کارناموں کی طرح ان کے تمدنی کارنامے بھی بہت ہیں۔ ظاہری نفاست و لطافت اور حسن ودل آویزی کے اعتبار سے ان کا تمدن نہایت بلند تھا اور محاضرات کی مشہور و معروف کتاب الف لیلہ میں اس کی جو تصویریں نظر آتی ہیں ان کو اگرچہ تاریخی اعتبار و استناد کا درجہ حاصل نہیں ہے اور اس میں بہت سے افسانے اور خرافات بھی شامل ہیں لیکن اس سے قطع نظر خالص تمدنی اور معاشرتی مرقعے بڑی حد تک صحیح ہیں"۔(۱)

اس قدر تعریف کے باوجود عباسیوں کے اس پہلو کو بھی بیان کیا ہے:

"بنی امیہ سے بنی عباسؓ کی نفرت و عداوت کا یہ حال تھا کہ آخری اموی فرمانروا مروان الحمار کی شکست کے بعد خاندان بنی امیہ کے نوے افراد گرفتار ہوئے۔ یہ غریب کھانا کھانے کے لیے جمع کیے گئے اس وقت بنی ہاشم کے ایک معمولی غلام شبلی بن عبداللہ نے بنی امیہ پر اشتعال دلانے والے چند اشعار پڑھ دیئے انھیں سن کر سفاح بانی دولت عباسیہ کے چچا عبداللہ بن علی نے اسی وقت کل اموی قیدیوں کو خیمہ کی چوبوں سے پٹوا کر مروا ڈالا اور نیم بسمل لاشوں کے ڈھیر پر دستر خوان بچھوا کر کھانا کھایا اور فرش کے نیچے سے

۱- تاریخ اسلام ج ۴، ص ۳۲۲۔

دم توڑنے والوں کی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ ان کے علاوہ جہاں جہاں
اموی ملے ڈھونڈ کر قتل کیے گئے، صرف شیر خوار بچے اور وہ لوگ باقی بچے
جنھوں نے بھاگ کر اسپین میں پناہ لی۔

یہ تو زندوں کے ساتھ سلوک ہوا مردوں کے ساتھ جو کچھ ہوا
وہ اس سے بھی زیادہ عبرت آموز ہے۔ تمام خلفائے بنوامیہ کی قبریں کھدوا
اور ان کی ہڈیاں نکلوا کر پھینکوا دیں۔ ہشام کی لاش سالم نکلی تھی اسے سولی پر
لٹکا کر آگ میں جلوا دیا گیا"۔(۱)

اسی طرح انھوں نے جس عہد کی تاریخ لکھی یا جس حکمراں کی تاریخ لکھی غیر جانبداری سے لکھی۔ سیاسی وتمدنی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو بھی من وعن بیان کر دیا ہے۔

۷-انفرادی یا شخصی تاریخ میں مورخ کے لیے لازم ہے کہ وہ زیر بحث شخصیت کے اصل خدوخال نمایاں کر دے اور اس میں کسی قسم کی لاگ لپیٹ نہ رکھے اور نہ حد اعتدال سے متجاوز ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے معائب سے چشم پوشی کر کے اسے فرشتہ ثابت کر دے یا یہ کہ محاسن کے بجائے صرف معائب ہی معائب بیان کر دے۔ محققین کا اس سلسلہ میں یہ نقطہ نظر ہے کہ محاسن ومعائب دونوں بیان کر دیے جائیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اس اصول کو بھی برتا ہے مثلاً ولید بن عبدالملک کے عہد حکمرانی کی تاریخ لکھنے کے بعد اس کے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے خود ولید بن عبدالملک کی متعدد خوبیوں کو بیان کیا ہے پھر اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ بڑا
سخت گیر تھا، اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں آدمی قید و بند میں مبتلا
ہوئے"۔(۲)

کہیں کہیں شاہ صاحب نے واضح اور دوٹوک انداز کے بجائے لطیف انداز میں تنقید کی ہے۔ مثلاً حضرت امیر معاویہؓ کی مذہبی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"امیر معاویہؓ کی حکومت خلافت راشدہ کے مقابلہ میں خالص
دنیاوی تھی لیکن بہر حال وہ صحابیؓ رسول تھے اس لیے سلطنت کی مادی اور دنیاوی
ترقیوں کے ساتھ وہ دین ومذہب کی خدمت سے بھی غافل نہ تھے"۔(۳)

۱-تاریخ اسلام ج ۲، ص ۲۹۔ ۲-ایضاً ج ۲، ص ۱۸۱۔ ۳-ایضاً ج ۲، ص ۳۳۔

۸- مورخ جس عہد و ماحول میں رہتا ہے اس کے ذہن و فکر پر اس کا اثر غالب ہوتا ہے اور جب وہ ماضی کے حالات کا تجزیہ کرتا ہے تو بسا اوقات وہ اپنے عہد سے عہد کہن کا موازنہ کر بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تاریخ نگار کا ایک غلط رویہ ہے شاہ صاحب نے اس غلط رویئے سے پوری طرح احتراز کیا ہے۔ راقم الحروف اپنے مطالعے کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے ماضی کے واقعات کا حال کے واقعات سے کہیں بھی موازنہ و مقابلہ نہیں کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں ان کی تاریخی تصانیف ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

۹- شاہ صاحب کی تاریخ نویسی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے سادہ واقعہ نگاری کی ہے اور فیصلہ نویسی سے احتراز کیا ہے۔ مثلاً جنگ جمل اور امویوں اور عباسیوں کی تاریخ میں متعدد ایسے نازک واقعات پیش آئے ہیں جن کے لکھنے میں ذرا سی جنبش قلم سے مورخ اپنے حدود کو پار کر جائے گا اور موردالزام ٹھہرے گا لیکن شاہ صاحب کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے مورخ کے منصب کا ہر ممکن پاس و لحاظ رکھ کر کوئی فیصلہ نہیں سنایا۔

۱۰- تاریخ نویسی کا اپنا ایک خاص اسلوب تحریر ہے جس میں ادیب کی طرح انشا پردازی شاعروں کی طرح قافیہ پیمائی اور واعظین کی طرح شعلہ بیانی نہیں ہوتی۔ اس لیے مورخ سادہ واقعہ نگاری کا فریضہ انجام دیتا ہے کیونکہ تاریخ اور انشا پردازی دونوں کا دائرہ الگ الگ ہے۔ شاہ صاحب کے یہاں اس اصول تاریخ نگاری کی پاسداری کے ثبوت بھی ملتے ہیں البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اسلوب میں ادبیت بھی پائی جاتی ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس میں حقیقت و واقعیت کے علاوہ بیجا ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً عباسیوں کے تمدن اور اس کے مظاہر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "قوموں کے تمدن کا ایک بڑا مظہر اس کی عمارتیں ہیں ان کا شکوہ و تجمل بانیوں کی شوکت و عظمت کا نشان اور اس کے نقش و نگار ان کے ذوق جمال کی تحریریں ہیں جن سے ان کی تمدنی تاریخ پڑھی جا سکتی ہے۔ آج بھی گذشتہ قوموں کی عظمت و جلال کی سب سے بڑی نشانیاں ان کی عمارتوں کے کھنڈر ہیں۔
>
> اسلامی اندلس کی تاریخ میں مسلمانوں کے عروج کے سب سے بڑے شاہد الزہرا کے کھنڈر اور الحمراء کے در و دیوار ہیں۔ ہندوستان میں

تیموریوں کی عظمت کی شہادت تاج محل، لال قلعہ، جامع مسجد اور فتحپور سیکری کی عمارتوں سے ملتی ہے۔ اسی طرح عباسی تمدن کی شوکت و عظمت کا سب سے بڑا نشان اور اس کا مرکز بغداد تھا اور عباسیوں کے تمدن سے واقفیت کے لیے اس عظمت و شان سے واقفیت ضروری ہے۔ لیکن عباسیوں کے دور زوال ہی میں اس پر ایسے مسلسل و پیہم انقلابات طاری ہوئے کہ وہ اسی زمانہ میں گویا ویران ہو چکا تھا اور جو بچی کھچی یادگاریں رہ گئیں تھیں وہ تاتاریوں کے سیلاب کی نذر ہو گئیں اور بغداد کی عظمت گذشتہ پر آنسو بہانے والے کھنڈر بھی باقی نہ رہ گئے اور اب بغداد میں اس کے پرانے شکستہ مقابر کے علاوہ اس کا کوئی مرثیہ خواں باقی نہیں۔ صرف کتابوں کے اوراق سے اس کی عظمت و شوکت کا پتہ چلتا ہے"۔(۱)

۱۱- شاہ صاحب کی مورخانہ کاوشوں کی ایک بڑی خصوصیت سند اور حوالہ کی نشاندہی کے ذریعہ تاریخی صداقت و دیانت کو باقی رکھنا بھی ہے۔ انھوں نے کہیں بھی واقعات بغیر سند اور حوالہ کے نہیں لکھے ہیں ان کی تمام تصانیف میں حوالہ اور ماخذ و مراجع کی نشاندہی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے ثبوت میں ان کی تاریخی تصانیف دیکھی جا سکتی ہیں۔

البتہ اشاریہ و کتابیات کی کمی کی وجہ سے یہ نشاندہی کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے تاریخ و رجال کی کتنی کتابوں سے استفادہ کر کے اپنی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

اس اصولی تاریخ نویسی کی وجہ سے شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب اردو زبان کے ایک بلند پایہ مورخ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہمعصر مورخین مثلاً اسلم جیراجپوری، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی وغیرہ نے اس موضوع پر جو کتابیں لکھیں وہ ان کے مقابلہ میں کمتر درجہ کی ہیں اور کمتر ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کتابیں تاریخی واقعات کی محض کھتونی ہیں ان میں بہت کم اصول تاریخ نگاری کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کا تقابلی مطالعہ ہمارے موضوع سے خارج ہے ورنہ ہم اس کو دلیلوں سے ثابت کرتے۔ بہر حال مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اپنی خدمات تاریخ اور اصولی تاریخ نگاری کی وجہ سے درجہ امتیاز پر فائز تھے۔

۱- تاریخ اسلام ج ۴، ص ۴۲۵-۴۲۶

باب پنجم

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے تاریخی کارنامے

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن دبستان شبلی کے نامور اہل قلم اور بلند پایہ محقق و مصنف تھے لیکن ان کا خاص موضوع تاریخ ہند رہا۔ چنانچہ وہ ادیب و انشاء پرداز سے زیادہ مورخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کی۔ سید صاحب کے بعد وہ دارالمصنفین کے علمی و انتظامی امور میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے دست راست رہے اور شاہ صاحب کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر بنائے گئے۔

صباح الدین صاحب مدۃ العمر تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ پچاس سے زیادہ علمی، ادبی اور تاریخی کتابیں ان کی یادگار ہیں ان کے علاوہ کثرت سے مضامین و مقالات سپرد قلم کیے جن میں غالب تعداد تاریخی موضوعات سے متعلق ہے۔ ان کی ان گرانقدر خدمات کے صلہ میں مرکزی حکومت ہند نے سند و خلعت عطا کر کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔ حکومت پاکستان نے بھی بڑی قدر و منزلت کی اور اعزاز و انعام سے سرفراز کیا۔

وہ ملک کے متعدد علمی ادبی اور تعلیمی اداروں کے رُکن رکین بنائے گئے ان کے علم و تجربہ سے ان علمی اداروں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا انھوں نے مختلف علمی موضوعات پر داد تحقیق دی تاہم وہ اصلاً مورخ تھے۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ ان کا خاص موضوع بحث تھا اور وہ اس کے ماہر خصوصی تسلیم کیے جاتے تھے ان کی بیشتر تصانیف کا تعلق اسی عہد کی تاریخ سے ہے۔

تاریخ ہند کے مطالعہ کا ذوق و شوق شاید ان کو شروع ہی سے تھا کیونکہ جب وہ دارالمصنفین آئے تو مولانا سید سلیمان ندوی نے آغاز ہی میں ان کے ذمہ تاریخ ہند کی تدوین کا کام سپرد کر دیا اور اس سلسلہ میں سید صاحب کی نگاہ جوہر شناس کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب سید صاحب دارالمصنفین سے رخصت ہوئے تو باہر سے خطوط کے ذریعہ برابر ان کی توجہ اس موضوع کی طرف مبذول کراتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالی تم کو صحت وعافیت کے ساتھ دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے۔ اب تم سے اور برادرم شاہ معین الدین ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں تم لوگوں کو دارالمصنفین کے چراغ کو ہر طرح روشن رکھنا ہے اور ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے سلسلہ کو بھی جاری رکھو اللہ تبارک وتعالی پورا فرمائیں۔(۱)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ "سید صاحب نے صباح الدین صاحب کو تاریخ ہند کے لیے خاص طور سے تیار کیا تھا"۔(۲)

مختصر حالات زندگی

صباح الدین صاحب بہار کے مردم خیز قصبہ دیسنہ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے جسے مولانا سید سلیمان ندوی کے مولد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والد سید محی الدین صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، سن شعور تک پہنچنے سے پہلے ہی والدہ کی آغوش شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔ ان کی پرورش و پرداخت ان کے دادا اور اعزہ واقربا نے کی۔ ان کا خاندان سادات بہار میں ممتاز تھا جس میں قدیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی بڑا رواج تھا، چنانچہ صباح الدین صاحب کو بھی جدید تعلیم دلائی گئی۔ ابتدائی تعلیم دیسنہ، مظفر پور اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں حاصل کی، پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے (B.A) اور اردو فارسی میں ایم۔اے (M.A) کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج سے بی۔ٹی (B.T) کی سند لی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آئے جہاں کچھ دنوں تک مشہور مورخ پروفیسر مجیب کے زیر تربیت تحقیق میں مصروف رہے۔ اسی زمانہ میں ان پر مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ انتخاب پڑی اور انھوں نے ۱۹۳۵ء میں دارالمصنفین بلالیا اور ان کے ذمہ تاریخ ہند کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام سپرد کیا۔

صباح الدین صاحب دارالمصنفین آئے تو زندگی کی آخری سانس تک یہیں رہے اور مسلسل باون برس تک تاریخ ہند کا مطالعہ ان کی تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کا خاص

۱- بحوالہ مقالات سلیمان ج ا، ص ۱۵-۱۶۔

۲- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے۔ دیباچہ ص ا۔

مقصد بنا رہا اور اس پیہم کاوش کا نتیجہ تقریباً ۱۳۵ اہم اور وقیع کتابوں کی شکل میں سامنے آیا۔

۱۸/ نومبر ۱۹۸۷ء بروز چہار شنبہ لکھنؤ میں ایک سڑک حادثہ میں وفات پائی عجب اتفاق ہے کہ یہی تاریخ و دن علامہ شبلی کی وفات کا بھی ہے ۱۹/ نومبر کو شبلی و سلیمان کے اس عاشق و شیدائی کو اس کی وصیت کے مطابق دار المصنفین میں علامہ شبلی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

تصانیف

صباح الدین صاحب نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱- بزم تیموریہ (تین جلدیں)، ۲- بزم مملوکیہ، ۳- بزم صوفیہ، ۴- اسلام میں مذہبی رواداری، ۵- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ۶- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ۷- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ۸- ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ۹- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، ۱۰- عہد مغلیہ ہندو مسلم مورخین کی نظر میں، ۱۱- ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دو جلدیں)، ۱۲- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری (تین جلدیں)، ۱۳- سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات، ۱۴- عہد مغلیہ میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات، ۱۵- صلیبی جنگیں، ۱۶- مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، ۱۷- محمد علی کی یاد میں، ۱۸- بزم رفتگاں (دو جلدیں)، ۱۹- صوفی امیر خسرو، ۲۰- غالب مدح و قدح کی روشنی میں (دو جلدیں)، ۲۱- حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات، ۲۲- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، ۲۳- ڈاکٹر سید محمود، ۲۴- مقدمہ دیوان فغاں، ۲۵- اسلام اور مستشرقین اوّل، ۲۶- یار عزیز، ۲۷- پیر حسام الدین راشدی اور ان کے علمی کارنامے۔

تراجم

ان کتابوں کے علاوہ علامہ شبلی کے رسالہ "الجزیہ"، "جہانگیر"، "مضامین عالمگیر" اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف "عربوں کی جہازرانی"، "بہادر خواتین اسلام" اور "ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں" اور مضامین میں "لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان"، "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" وغیرہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا یہ ترجمے

انگریزی کے اہم رسائل مثلاً اسلامک کلچر (Islamic Culture) اسلامک لٹریچر (Islamic Literature) اسلامک ریویو (Islamic Review) انڈوایرانیکا (Indo-Iranica) اور ہمدرد اسلامکس (Hamdard Islamicus) وغیرہ میں شائع ہو کر انگریزی داں طبقہ میں مقبول ہوئے۔

مضامین

صباح الدین صاحب نے مذکورہ تصانیف کے علاوہ سیکڑوں تاریخی اور تحقیقی مضامین لکھے جو ماہنامہ معارف کی فائلوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان تاریخی مقالات کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ اس سے استفادہ ہو اور تاریخ ہند کے متعدد پہلو جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔

تاریخی تصانیف

اس اجمالی جائزہ کے بعد اب ہم ان کی تاریخی کتابوں کا خاص طور پر تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی اہمیت وافادیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

۱- بزم تیموریہ: یہ صباح الدین صاحب کی پہلی معرکۃ الآرا تاریخی تصنیف ہے ۱۹۴۱ء میں اس وقت شائع ہوئی جب انگریز اور ان کے ہمنوا مورخوں کی تاریخ سازی سے ملک میں ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ امن وامان، صلح و آشتی اور ہمدردی و موانست کے بجائے اختلاف و نزاع اور انتشار و خلفشار کا دور دورہ تھا۔ صباح الدین صاحب نے اتحاد و یک جہتی کے مقصد کے پیش نظر اس کتاب میں مسلمان حکمرانوں کے خونچکاں واقعات کے بجائے ان کی بزم آرائی، علمی قدردانی، معارف پروری اور علم دوستی کے واقعات لکھ کر دونوں قوموں کو امن و آشتی، اتحاد و یکجہتی کا پیغام سنایا۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ”خوشی ہوئی کہ تمھاری کامیاب کتاب بزم تیموریہ اہل ذوق کو پسند آرہی ہے۔ مجھ کو پہلے بزم تیموریہ پسند نہیں تھی کیونکہ میں ان کو عیش و عشرت کا دلدادہ، شراب و کباب کا متوالہ، حسن و عشق کا پرستار، نقش و تصویر

اور سرود و ساز کا دم ساز ہی سمجھتا رہا۔ لیکن جو تصویر تم نے کھینچی ہے وہ نہایت عمدہ اور مصور کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں"۔(۱)

دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت اس پر نظر ثانی کی گئی تو اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی جو آخر کار تین جلدوں کی شکل میں پوری ہوئی۔

جلد اول: دوسرے ایڈیشن کا یہ پہلا حصہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اس میں سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر اس کے بیٹے ہمایوں اور پوتے اکبر کی بزم آرائی علم اور اہل علم کی قدر دانی، معارف پروری، علوم و فنون کی حوصلہ افزائی کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور ان تینوں حکمرانوں کے عہد کے علماء و فضلاء اور ان کے حالات و کارناموں کو مستند و معتبر ماخذوں سے ڈھونڈ کر جمع کیا گیا ہے جس سے ان حکمرانوں کے عہد کی مکمل علمی تہذیبی اور تمدنی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

کتاب کو متنی اعتبار سے تین ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے باب میں بابر کے علمی ذوق اور اس کے علمی تبحر نیز اس کے دربار کے علماء فضلاء شعراء اور ان کی خدمات کی تاریخ ہے دوسرے باب میں ہمایوں کے علم و فضل اور علم پروری کے واقعات کے علاوہ اس کے دربار کے علماء و فضلاء اور اس کی علمی قدر دانیوں کا مفصل احوال ہے۔ تیسرے باب میں اکبر اور اس کے دربار کے عالموں، فاضلوں اور شاعروں کی علم دوستی اور ادب نوازی کا تذکرہ ہے۔ اس باب کے شروع میں عہد اکبری کے تراجم کا تعارف کرایا گیا ہے پھر اس عہد کے ارباب کمال کا تذکرہ اور ان کے کارناموں کا مفصل احوال ہے جس سے عہد اکبری کی علمی و تعلیمی اور تہذیبی و تمدنی تاریخ کا پورا مرقع سامنے آگیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک مختصر دیباچہ ہے۔ بابر اور ہمایوں کے عہد کے علمی و تمدنی تاریخ کے ابواب نسبتاً مختصر ہیں مگر اکبر کے عہد کے علمی فتوحات کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے اور کتاب کا نوے فیصد حصہ اکبر ہی کے عہد کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ جلد ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

جلد دوم: یہ جلد ۱۹۸۰ء میں طبع ہوئی اس میں جہانگیر اور شاہجہاں کی علمی قدر دانیوں اور ان کی علوم و فنون کی حوصلہ افزائیوں کا تذکرہ ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا

۱- بزم تیموریہ ج ۱، مقدمہ ص ۱۱۔

سید سلیمان ندوی کا وہ مقدمہ شامل ہے جو انھوں نے پہلے اڈیشن پر لکھا تھا۔ اس کے بعد فاضل مورخ کے قلم سے مختصر دیباچہ ہے جس میں دوسرے اڈیشن کے اضافوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد جہانگیر کی علم پروری اور شعراء کی قدردانی وسرپرستی، درباری اور اس عہد کے عالموں فاضلوں، شاعروں اور مورخوں کا تذکرہ اور ان کی خدمات کا مفصل حال لکھا گیا ہے۔ جہانگیر کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین شاہ جہاں کی علم دوستی، معارف پروری اور ادب نوازی کا بیان ہے۔ آخر میں عہد شاہجہانی کے خوش نویسوں کے حالات اور ان کے فنی کمالات کی تفصیل ہے۔ صباح الدین صاحب نے یہ ساری تفصیلات اس تسلسل اور مرتب انداز میں قلمبند کی ہیں جس سے جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کی پوری علمی تاریخ سامنے آگئی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ حکمراں صرف میدان کارزار اور شمشیر وسناں ہی کے مرد میداں نہ تھے بلکہ وہ علم پرور اور ادب نواز بھی تھے اور بحیثیت مجموعی ہندوستان کی علمی وتمدنی ترقی میں ان کا خاص کردار اور نمایاں حصہ ہے۔ یہ جلد ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کے بھی اب تک کئی اڈیشن شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

جلد سوم: بزم تیموریہ کی یہ جلد ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں پہلے عالمگیر کی تعلیم و تربیت، علمی ذوق اور اس کے فضل و کمال کا تذکرہ ہے بعد ازاں فتاویٰ عالمگیری کے مولفین کے حالات و کارناموں نیز عہد عالمگیر کے شعراء و امراء کے حالات و کارناموں کی تفصیل ہے اور اس عہد کے ہندو فضلاء و امراء کا حال بھی قلمبند کیا گیا ہے۔ مورخین کے حالات اور ان کی تصانیف کا تعارف بھی کرایا گیا ہے اور خاص طور پر اس عہد کے فارسی ادب پر تبصرہ بھی ہے۔ ایک اور مفید بحث بعض اہم مدارس کے سلسلہ میں بھی ہے جس سے ہندوستان میں تعلیمی روایات کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

عالمگیر کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ اور بہادر شاہ ظفر کی علم نوازی معارف پروری، علماء کی سرپرستی و قدردانی نیز اس عہد کے عالموں، فاضلوں، شاعروں اور دوسرے ارباب کمال کی علمی خدمات کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔

آخری دو ابواب میں مغل شہزادوں اور شہزادیوں کی علم نوازی اور اہل علم کی قدرافزائی کی تفصیلات ہیں۔

مختصر یہ کہ بزم تیموریہ میں ظہیرالدین محمد بابر سے لے کر آخری مغل حکمراں

بہادر شاہ ظفر تک کے تمام فرمانرواؤں، مرزا کامران سے مرزا فرخندہ بخت یہاں تک کہ تمام شہزادوں اور گلبدن بیگم سے لے کر زیب النساء تک کی تمام شہزادیوں کی علمی ادبی اور تمدنی سرگرمیوں کی مفصل تاریخ آ گئی ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہوں کے امراء و رؤسا دربار سے وابستہ علماء، فضلاء، ادباء، شعراء، مورخین اور دوسرے ارباب کمال کے حالات و سوانح اور علمی وادبی خدمات کو فاضل مورخ نے نہایت دیدہ وری، تلاش و تفحص اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ عہد مغلیہ کی پوری علمی و تمدنی تاریخ اس میں آ گئی ہے۔

بزم تیموریہ کے اب تک متعدد ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں فارسی میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے جس پر مترجم کو ایران کی کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری بھی ملی تھی۔(۱)

یہ کتاب نہ صرف صباح الدین صاحب بلکہ دارالمصنفین کا بڑا کارنامہ ہے۔

بزم صوفیہ

اس کتاب میں عہد مغلیہ سے پہلے کے ہندوستان کے ان اکابر صوفیاء و مشائخ کے حالات اور ان کے کارناموں کی مرقع آرائی کی گئی ہے جو اہل قلم اور صاحب تصنیف تھے ان کے نام یہ ہیں:

شیخ ابوالحسن علی ہجویری معروف داتا گنج (م ۴۶۵ھ) خواجہ معین الدین چشتی (م ۶۳۲ھ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ) قاضی حمید الدین ناگوری (۶۴۱ھ) شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی (م ۶۸۴ھ) خواجہ فرید الدین گنج شکر (۶۶۱ھ) شیخ صدر الدین عارف (۶۶۴ھ) شیخ فرید الدین عراقی (م ۶۸۸ھ) شیخ امیر حسینی (۷۱۹ھ) خواجہ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) شیخ بو علی قلندر پانی پتی (۷۲۴ھ) شیخ ابوالفتح رکن الدین (۷۳۵ھ) شیخ برہان الدین غریب (م ۷۳۸ھ) ضیاء الدین نخشبی (م ۷۵۱ھ) خواجہ نصر الدین محمود چراغ دہلوی (۷۵۷ھ) شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۷۸۲ھ) سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۷۸۵ھ) سید اشرف جہانگیر سمنانی (م ۸۰۸ھ) سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵ھ) وغیرہ۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین نے شائع کیا۔ ۱۹۷۱ء میں دوسرے ایڈیشن میں مصنف نے اودھ کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عبدالحق رودولوی کے

۱- بزم تیموریہ اول مقدمہ ص ۱۱-۱۲ تلاش بسیار کے باوجود مترجم کا نام اور دوسری تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

حالات و کمالات کا بھی اضافہ کیا جو دراصل مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے ہے۔ ۱۹۷۹ء میں تیسرے ایڈیشن میں مصنف نے دو اور ضمیموں کا اضافہ کیا پہلے ضمیمہ میں خواجگان چشت کے ملفوظات کا ذکر ہے اور دوسرے میں ہندوستان میں مسئلہ وحدۃ الوجود کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ان صوفیاء کرام کا تذکرہ ہے جنھوں نے ہندوستان کے عوام خصوصاً مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو بنانے سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا اور انھیں کی بدولت ہندوستان میں ایک ایسی تہذیب کی تشکیل ہوئی جس کے عناصر اتحاد و یکجہتی اور مختلف قوموں و علاقوں کے درمیان آپسی مفاہمت و رواداری ہیں۔ اس لیے ان بزرگوں کے حالات اور ان کا علم و فضل ان کی تحریک و تبلیغ عہد اسلامی کی تاریخ کا اہم حصہ تو ہے ہی خود ہندوستان کی عمومی تاریخ کا سب سے معتبر ماخذ بھی ہے۔ خود صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

> "راقم سطور تاریخ ہند کا ایک ادنی طالب علم ہے، اس لیے اس کتاب کی ترتیب میں یہ بھی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانقاہ کے بوریہ نشینوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کے مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا۔ تاریخ ہند کے مطالعہ میں عموماً مسلمان حکمرانوں کے افعال و کردار سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے اخلاق اور سیرت و کردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان میں صلحاء و مشائخ ہی نے اسلام کی معنوی شوکت و عظمت قائم کی اس لیے ان کے حالات و تعلیمات کو ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سمجھنا چاہیے"۔(۱)

بزم صوفیہ سے پہلے بھی حضرات صوفیہ کے حالات و سوانح اور کمالات وغیرہ پر بے شمار کتابیں لکھی جاچکی تھیں لیکن ان میں صوفیہ کے اصل حالات کم اور کشف و کرامات وغیرہ کو زیادہ مفصل و اہم اور مبالغہ آمیز شکل میں پیش کرنے کا رجحان غالب تھا جن سے ان صوفیاء کرامؒ کی زندگی اور ان کی عوامی خدمات کی تصویر زیادہ واضح نظر نہیں آتی تھی۔ زیر نظر کتاب میں صباح الدین صاحب نے کشف و کرامات اور غیر معمولی اور ناقابل یقین واقعات کی تفصیلات سے احتراز کیا ہے اور اصل زور صوفیاء کے حالات زندگی، علمی و عملی کمالات، ان کی

۱۔ بزم صوفیہ ص ۴۔

تعلیمات، ملفوظات اور ارشادات پر صرف کیا جس سے ان کی حقیقی زندگی واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے نہایت اہم ہے اس سے صوفیا و مشائخ کے حالات و کارناموں کا پتہ چلتا ہے نیز ہندوستان کی مذہبی، معاشرتی اور عام ملکی رسم و رواج کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"بزم صوفیا کتاب تصوف کی نہیں تاریخ کی ہے گو وہ تاریخ صوفیہ سہی اس کی تالیف کا حق یقیناً مولف سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو حاصل تھا جو تاریخ کے پرانے معلم اور اس اقلیم کے دیرینہ رہ نورد ہیں"۔(۱)

بزم مملوکیہ

اس میں غلام خاندان کے حکمرانوں کے عہد کی علمی و تمدنی تاریخ لکھی گئی ہے اور قطب الدین ایبک (۱۲۰۶-۱۲۱۰ء) ناصر الدین قباچہ (۱۲۱۰-۱۲۲۸ء) شمس الدین ایلتتمش (۱۲۲۸-۱۲۳۶ء) رکن الدین فیروز شاہ (۱۲۳۶ء) رضیہ (۱۲۳۶-۱۲۴۰ء) معز الدین بہرام شاہ (۱۲۴۰-۱۲۴۲ء) علاء الدین مسعود شاہ (۱۲۴۱-۱۲۴۵ء) ناصر الدین محمود (۱۲۴۶-۱۲۶۵ء) غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷ء) معز الدین کیقباد (۱۲۸۷-۱۲۹۰ء) کے عہد کے حالات و واقعات، ان سلاطین کی علم دوستی اور عالموں، ادیبوں، شاعروں اور اہل فن کی قدر دانی کا حال معتبر ماخذوں سے لکھا گیا ہے۔ نیز ان کے دربار کے امراء و رؤسا، شہزادوں اور دربار سے وابستہ علماء و فضلاء، ادباء و شعراء کی بھی قدر دانیوں اور سرپرستیوں کے واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اس تسلسل سے لکھا ہے کہ ۱۲۰۶ء کے ہندوستان کی پوری علمی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا مرقع سامنے آگیا ہے جس سے ہندوستان کی عہد بہ عہد تمدنی ترقی اور اس سلسلہ میں غلام سلاطین کی حصہ داری بھی واضح ہو جاتی ہے۔ صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

"موجودہ جلد ہندوستان کے مملوک یعنی غلام سلاطین اور ان کے امراء و شہزادوں کی علم دوستی پر مشتمل ہے اور جس علم دوستی کی بدولت جو فضلاء و شعراء علم و ادب کے افق پر مہر و ماہ بن کر چمکے ان کے کمالات کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے"۔(۲)

۱- بزم صوفیہ مقدمہ۔ ۲- بزم مملوکیہ ص ۹۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی اب تک اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی بیان کرنا مناسب ہے کہ بزم صوفیہ، بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ کے سلسلہ میں خلجی، تغلق اور لودی سلاطین کی بزموں کا فقدان محسوس ہوتا ہے ان کے علاوہ اس زمانہ کی معاصر اور بعض مشہور ریاستوں مثلاً گجرات، برار، گلبرگہ وبیجاپور وغیرہ کی بزموں کی رونق کم نہ تھی لیکن دارالمصنفین نے جو محفل سجائی اس میں ان کا حصہ نہیں ہے حالانکہ خود صباح الدین صاحب ان سب کی علمی و تمدنی تاریخ لکھنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ گوناگوں مصروفیات اور دارالمصنفین کے دوسرے کاموں نے فرصت نہ دی اور وہ حصے ضبط تحریر میں نہ آسکے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک

اس کتاب میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی سیاسی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کو نامور ہندو مسلم مورخین کی کتابوں سے پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے بنانے سنوارنے اور سجانے میں کس قدر نمایاں حصہ لیا۔

مذکورہ عہد کے فتح و شکست، جنگ و جدل اور خانہ جنگی و بغاوت کے واقعات لکھنے سے قصداً احتراز کیا گیا اور صرف تہذیبی و تمدنی تاریخ ہی بیان کی گئی ہے۔

یہ فاضل مورخ کی اپنی تحریروں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں ملک کے نامور ہندو مسلم مورخوں کی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے اس کا مقصد تالیف یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے اندر یکجہتی، ہم آہنگی اور ایک دوسرے سے محبت و الفت اور قربت کا جذبہ ابھارا جائے۔ اس لیے اس میں ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کے صرف روشن پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ تاریخ نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے مصنف کو بھی اس کا احساس ہے تاہم انھوں نے اسے الیٹ کا رد عمل بتایا ہے چونکہ الیٹ نے اپنی تاریخ میں مسلمانوں کی تاریخ کے صرف تاریک پہلوؤں کو پیش کیا تھا اس سے مصنف نے اس میں دانستہ اور بالقصد صرف ایسے پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو حق و صداقت اور مقصدیت کی روشنی سے جگمگاتے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ الیٹ نے جو زہر پھیلایا ہے اس کا تریاق اسی انداز میں مسلمانوں کے عہد کی پوری تاریخ قلمبند کر کے کیا جاسکتا ہے۔

اس خامی کے باوجود (اگر یہ خامی تسلیم کرلی جائے) یہ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے اور اس سے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے تمام اہم تہذیبی معاشرتی اور تمدنی پہلو واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ مولانا ضیاءالدین اصلاحی رقمطراز ہیں:

> "یہ کتاب لکھ کر مولف نے ملک و قوم کی مفید خدمت بھی انجام دی ہے اور وقت کی اہم اور بڑی ضرورت بھی پوری کی ہے۔ اس میں قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی تہذیبی و معاشرتی تاریخ کے متعلق کافی مواد جمع کر دیا گیا ہے جو اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے مفید اور عمدہ ماخذ ہے"۔(۱)

اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر سید محمود نے لکھا ہے جس میں اس طرز تاریخ نویسی کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے اور بجاطور پر لکھا ہے کہ اگر اسی قسم کی تاریخ لکھ کر ملک میں پیش ہوتی ہے تو ہماری بہت سی ذہنی اور سیاسی بیماریوں کا مکمل علاج ہو جائے۔(۲)
مصنف نے دیباچہ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب عاجز مرتب کی ذاتی تحقیق و تدقیق کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں لیکن ایک مدت سے زیر نظر عہد پر جتنی مستند تاریخی تحقیقات ہوئیں ان کا نچوڑ ضرور ہے۔(۳)

صباح الدین صاحب کا ارادہ تھا کہ اسی انداز سے وہ عہد مغلیہ کی تہذیبی و تمدنی تاریخ بھی پیش کریں گے۔ لیکن عدیم الفرصتی اور دارالمصنفین کے دوسرے علمی کاموں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ افسوس کہ یہ اہم کام مکمل نہ ہوسکا ورنہ عہد وسطیٰ کے اسلامی ہندوستان کی پوری علمی و تمدنی تاریخ سامنے آجاتی اور آج اس سے ہندو مسلم منافرت کم کرنے میں بڑی مدد ملتی۔ یہ مفید اور قیمتی کتاب دارالمصنفین نے ۱۹۵۸ء میں شائع کی۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

یہ کتاب صباح الدین صاحب کی شاہکار کتابوں میں سے ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام کی تاریخ نہایت تلاش و تفحص اور معتبر و مستند ماخذوں سے مرتب کی ہے۔ درحقیقت یہ ان کی بائیس تئیس سالہ محنت و کاوش اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے اردو کیا کسی اور زبان میں کوئی مستقل تصنیف

۱- نیادور یادرفتگاں نمبر ص۲۲۲۔ ۲- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک ص۵۔ ۳- ایضاً ص۶۔

نہ تھی۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی تحقیقی کتاب ہے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی ”عرب و ہند کے تعلقات“ کے بعد اس درجہ بلند پایہ یہ دوسری کتاب ہے اور بلاشبہ اردو زبان میں یہ نہایت اہم اور گرانقدر اضافہ ہے۔

فاضل مورخ نے فوجی نظام سے متعلق ایک ایک جزئیات مثلاً فوجی عہدے ان کے القاب و امتیازات، آتشیں اسلحے، فوجی لباس اور اس کی قسمیں اور اس کی وضع قطع، پیدل افواج کے علاوہ سوار افواج اور اس کی اہمیت، ہاتھی توپ اور توپچی، فوجیوں کے تقرر کا طریقہ، ان کی تنخواہ اور فرائض، معائنہ، کوچ، جھنڈے، باجے، کیمپ، مجلس مشاورت، صف آرائی، جنگ، محاصرہ، قلعے، چھاؤنیاں، خبر رسانی، مختلف بادشاہوں کے عہد میں فوج کی تعداد، ورزش اور افواج کی تعلیم و تربیت، فوجی نظام کا زوال اور اس کے اسباب غرض کسی چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے اور فوجی نظام کے ہر گوشے پر داد تحقیق دی ہے۔ ڈاکٹر سید محمود لکھتے ہیں:

> ”یہ موضوع بڑا مشکل، صبر آزما اور پیچیدہ تھا۔ کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ بڑی محنت، مشقت، دیدہ ریزی اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے“۔(۱)

اس کتاب کا موضوع اگرچہ فوجی نظام ہے تاہم ضمناً اس کتاب میں عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بعض سیاسی و جنگی حالات بھی آگئے ہیں جس سے عہد وسطیٰ کے میدان کارزار کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

۴۹۴ صفحات پر مشتمل صباح الدین صاحب کی اس اہم کاوش کو دارالمصنفین نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا یہ آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس کتاب میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے تمدنی جلوے دکھائے گئے ہیں اور اس عہد کے دربار، محلات، حرم، لباس، پارچہ بافی، زیورات، جواہرات، خوشبوئیات، اشیائے خورد و نوش، تہوار و تقریبات، موسیقی اور مصوری وغیرہ کی ہر طرح کی تعمیری، تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تفصیلات تاریخ کے معتبر و مستند ماخذوں سے ریزہ ریزہ جمع کر کے

۱- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام ص ۱۸ (پیش لفظ)۔

لکھی گئی ہے جس سے سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کی پوری تمدنی تاریخ سامنے آجاتی ہے اور بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس میں ان تمام چیزوں کا بیان اور تذکرہ ہے جو کسی زمانے کے اعلیٰ تمدن کا نقش و نگار ہوتے ہیں۔(۱)

اس میں مملوک اور مغل دونوں کے تمدن کو پیش کیا گیا ہے اور دونوں کا فرق بھی واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ مولانا ضیاءالدین اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

> "فاضل مولف نے ہزاروں اوراق کھنگالنے کے بعد تمدنی نقش آرائیوں اور تہذیبی نفاستوں کا یہ مرقع سجایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں نے اپنے ملک کی کیسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اور اسے کیسا بلند اور نفیس تمدن اور شائستہ و ترقی یافتہ تہذیب عطا کی تھی"۔(۲)

اردو زبان میں تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار پر سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے عہد کی یہ پہلی مبسوط اور جامع تمدنی تاریخ اور صباح الدین صاحب کا بڑا کارنامہ ہے اسے دارالمصنفین نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

یہ کتاب دراصل وہ مقالہ ہے جو صباح الدین صاحب نے جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب اور مولانا عبدالسلام قدوائی کی دعوت پر جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر سید عابد حسین کی صدارت میں پیش کیا تھا یہ مقالہ پہلے معارف میں شائع ہوا پھر دارالمصنفین نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے ایک طویل مدت تک حکمرانی کی اور تقریباً ۴۸ حکمراں تخت نشیں ہوئے۔ اس طویل دور حکومت میں بے شمار علماء و مشائخ اور صوفیاء بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے عوام کے دلوں پر حکمرانی کی۔ ان دونوں طرح کے فرمانرواؤں کے درمیان جو تعلقات رہے وہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "زیر نظر مقالہ اسلامی ہند کی تاریخ کے ایک ایسے نازک مبحث پر

۱-ماہنامہ برہان دہلی دسمبر ۱۹۶۳ء ص ۳۸۳۔ ۲-نیا دور یاد رفتگاں نمبر ص ۱۲۳۔

ہے جس میں ادنیٰ لغزش قلم سے مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی نہ کوئی پہلو مجروح ہو جاتا۔ اس لیے بہت کم لوگوں نے اس پر لکھا ہے اور جنھوں نے لکھنے کی کوشش کی وہ جادۂ اعتدال پر قائم نہ رہ سکے۔ لائق مصنف نے جن کی نظر اس دور کی تاریخ کے تمام گوشوں پر بہت گہری ہے جس اعتدال و توازن کے ساتھ اس پُر خار وادی کو طے کیا ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے"۔(۱)

ہندوستان کے سلاطین اور علماء و مشائخ کے درمیان جو روابط رہے ان کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ علماء کی قسمیں مثلاً پاک طینت علماء درس و تدریس میں مشغول اور جری علماء کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ نیز مفاد پرست سلاطین کے معاون اور ناقد علماء کا بھی تذکرہ ہے اور ہر طرح کے علماء کی رواداری اور ان کی تصنیفی خدمات کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ صوفیا سے سلاطین کے ربط و تعلق کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے اور سلاطین پر ان کے اثرات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ متعدد صوفیاء کی اصلاحی کوششوں اور اشاعت اسلام میں ان کے کردار کو نمایاں طور پر لکھا گیا ہے۔ ساڑھے چھ سو برس میں علماء و صوفیا کی عام سماجی خدمات اور سلاطین سے ان کے ربط کا جامع جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے جس سے بقول ضیاء الدین اصلاحی "اسلامی ہند کی مذہبی، علمی، ذہنی اور فکری تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آ گیا ہے"۔(۲)

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

صباح الدین صاحب کی یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی اس میں امیر خسرو کے حالات و سوانح اور ان کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق نہایت جامع معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں مصنف کا ماخذ براہ راست امیر خسرو کے آثار و باقیات جیسے مثنوی قران السعدین، مفتاح الفتوح، شیریں خسرو، ہشت بہشت، دول رانی خضر خان، نہ سپہر، نہایۃ الکمال وغیرہ ہیں۔ ان کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ یہ ہندوستان سے محض امیر خسرو کی شیفتگی کی ہی عکاس نہیں بلکہ اس دور کے ہر محب وطن کے جذبات کے نمائندہ بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ میں مصنف نے امیر خسرو کی اہمیت اور

۱- ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر ص ۴۔ ۲- نیاد ور یاد رفتگاں نمبر ص ۴۳۔

ان کی شخصیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

عہد مغلیہ ہندو مسلم مورخین کی نظر میں

تاریخ ہند کے سلسلہ میں صباح الدین صاحب نے منصوبہ بنایا تھا کہ بابر سے عالمگیر تک کی، ادبی، سیاسی اور تمدنی تاریخ کو قدیم وجدید ہندو مسلم مورخین کی کتابوں کے اقتباسات سے مرتب کیا جائے۔ زیر نظر کتاب اس منصوبہ کی اولین کاوش ہے اس میں سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر اور اس کے عہد کے جنگی، سیاسی، تہذیبی و تمدنی اور عملی کارناموں کو عہد مغلیہ اور دور جدید کے مسلمان و ہندو مورخین کی تحریروں کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں بابر کے ابتدائی حالات خود اس کی کتاب تزک بابری کی مدد سے قلمبند کیے گئے ہیں۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس سے بابر اور اس کے عہد کی تاریخ کا ہمہ جہت مرقع سامنے آجاتا ہے۔ صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "اس کی نوعیت اور تاریخوں سے کچھ مختلف ہے۔ ہندوستان کی جو تاریخیں لکھی جاتی ہیں ان میں مورخین تحقیقات کی آڑ میں اپنی رائے سے ناظرین کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن زیر نظر تاریخ میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ سے متعلق تزک بابری کے علاوہ اس دور سے اب تک مسلمان اور ہندو مورخین نے فارسی اردو اور انگریزی میں جو کچھ لکھا ہے ان کے اقتباسات ناظرین کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں"۔(۱)

اس کتاب میں جن مورخین کے خیالات اور اقتباسات نقل کیے گئے ہے ان پر فاضل مورخ نے نقد و تبصرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر حواشی کے ذریعہ بعض وضاحت طلب مقامات کی نشاندہی جدید تحقیقات کی روشنی میں کردی ہے جس سے کتاب کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔

۵۲۶ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کو دارالمصنفین نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا لیکن دوسرے ایڈیشن میں نام بدل کر "ظہیر الدین محمد بابر ہندو مسلم مورخین کی نظر میں" کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بقیہ جلدیں مرتب کے حسب منشا عدیم الفرصتی کی وجہ

۱۔ عہد مغلیہ ہندو مسلم مورخین کے نظر میں ص ۱۳۔

سے مرتب نہ کی جا سکیں یہ کتاب بھی دارالمصنفین کی مقبول ترین مطبوعات میں شامل ہے۔

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

تاریخ ہند پر صباح الدین صاحب کے وسیع و عمیق مطالعہ اور دقیقہ رس نظر کا ایک ثمرہ یہ کتاب بھی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں اور اساطین علماء و صوفیہ کے نہایت پُر اثر اور جاذب قلب و نظر واقعات کو معتبر و مستند ماخذوں کی مدد سے اس طرح قلمبند کیا گیا ہے کہ جس سے ہندوستانیوں کے قلوب کو مسخر کر لینے کی ادائیں بار بار مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اوّل: ۲۴۴ صفحات پر مشتمل اس حصہ کو دارالمصنفین نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان سلاطین جیسے سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، مملوک، خلجی، تغلق اور لودی سلاطین اور اس عہد کے صوفیاء و مشائخ مثلاً خواجہ معین الدین چشتی، شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ حمید الدین ناگوری، بہاء الدین زکریا ملتانی، بابا فرید گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیاء اور بقیہ دوسرے اکابر بزرگوں کے سبق آموز واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

> "اب تک تاریخ ہند کا مطالعہ میدان جنگ کی فتح و شکست کی روشنی میں کیا جاتا ہے لیکن جنگ کی خونریزیوں اور ہولناکیوں سے ہٹ کر بھی ہم کو اپنی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کتاب میں یہ مطالعہ حکایتوں اور روایتوں کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے پڑھنے کے بعد ناظرین شاید یہ کہہ سکیں گے کہ ہماری تاریخ نے سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونے بھی پیدا کیے ہیں۔
>
> اس میں ایسی حکایتیں اور روایتیں ملیں گی جن سے سیاسی بصیرت کے علاوہ دینی حمیت، ایمانی غیرت، وطنی محبت اخلاق بلندی، سیرت و کردار کی پاکیزگی، باہمی رواداری، سپہ گری، پامردی اور بہادری کے جلوے نظر آئیں گے"۔(۱)

۱۔ سچی کہانیاں حصہ اول دیباچہ ص ا۔

حصہ دوم: سچی کہانیوں کا دوسرا حصہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں ظہیر الدین بابر سے نور الدین جہانگیر کے عہد تک کے مغل حکمرانوں اور علماء و فضلاء اور ارباب کمال کی نصیحت آمیز حکایتیں قلمبند کی گئی ہیں جن سے ان حضرات کی سیاسی بصیرت، تدبر، علمی ذوق، علماء کی قدر و منزلت، دینی حمیت و غیرت، اخلاقی بلندی، ایمانی شان، پاکیزہ اخلاق و کردار، شجاعت و بہادری اور استقلال و پامردی کے جلوہ ہائے صد رنگ سامنے آجاتے ہیں اور ان سے اس عہد کی تہذیبی بوقلمونی اور سماجی اتحاد و مساوات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کا یہ تبصرہ بھی درج کرنے کے لائق ہے کہ:

> "یہ کتاب مصنف نے اس جذبہ سے لکھی ہے کہ ماضی کے ان پُر شکوہ واقعات و حکایات سے اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، قومی اور ملکی زندگی کی تعمیر میں مدد لی جائے اور ان رنگارنگ قصوں اور حکایتوں کے ذریعہ انھوں نے ماضی کے روشن اور تابناک پہلوؤں کو پیش کر کے بلند اور پاکیزہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے"۔(۱)

سچی کہانیوں کے ان دونوں حصوں میں مسلمان حکمرانوں کے ایسے متعدد سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی واقعات آگئے ہیں جن سے اس عہد کی تہذیب و معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے درحقیقت ان دونوں مجموعوں کو بھی تاریخ ہند کا حصہ اور اہم حصہ سمجھنا چاہیے۔

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی بے تعصبی اور رواداری، فراخدلی، وطن دوستی اور ہندوؤں کے ساتھ ان کی ہمدردی و محبت کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ کتاب بھی دراصل فاضل مورخ کے اس منصوبہ کا ایک حصہ ہے جس میں اسلامی ہندوستان کی علمی و تمدنی تاریخ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

جلد اول: یہ جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اس میں سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری، وطن نوازی اور ہندوؤں کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کی تفصیلات معتبر مصادر و مراجع کی مدد

۱- نیا دور یاد رفتگاں نمبر ص ۱۲۴۔

سے نقل کی گئی ہیں۔ کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

"اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے عہد میں صرف لڑائیاں ہی نہیں ہوتی رہیں بلکہ ان کے یہاں رواداری، فراخدلی اور انسان دوستی بھی رہی"۔(۱)

بعض مورخوں نے مسلمان حکمرانوں کے بعض ذاتی افعال کو اسلام کی طرف منسوب کر کے غلط نتائج مستنبط کیے ہیں۔ تاریخ نگاری کے اس غلط رویہ پر تنقید کرتے ہوئے صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

"کچھ ایسے مورخین بھی ہیں جو بعض مسلمان فرمانرواؤں کے تشدد کو ان کا ذاتی فعل نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات سے منسوب کر دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اس قسم کی تحریریں تاریخی صداقت کے بجائے سیاسی مصالح اور مذہبی غیر رواداری پر مبنی ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ حکومت الحاد، بے دینی اور شرک کے ساتھ تو عرصہ دراز تک قائم رہ سکتی ہے مگر جبر و ظلم اور چیرہ دستی سے برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں نے اپنے دور حکومت میں عدل و انصاف پر ہر زمانہ میں زور دیا یہ عدل پسندی اور انصاف پروری، رواداری اور فراخدلی کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی"۔(۲)

اس کتاب کا انتساب بھی قابل ذکر ہے اس کو ہندو مسلم یگانگت، موانست اور جذباتی ہم آہنگی کے نام معنون کیا گیا ہے جس سے مصنف کے تاریخ نویسی کے نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور غالباً یہی وہ انداز فکر تھا جس نے صباح الدین صاحب کو ہندوستان کی علمی و تمدنی تاریخ نویسی کی طرف مائل کر کے تاریخ نویسی میں ایک انفرادی شان عطا کی۔

جلد دوم: مذہبی رواداری کی دوسری جلد ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں پہلے سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں اور پھر سوری خاندان کے حکمراں شیر شاہ اور اسلام شاہ نیز مغل حکمراں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، ملک سے محبت اور ان کی بے تعصبی اور ہندوؤں سے ان کے جذبہ

۱۔ مذہبی رواداری، ج ۱، ص ۱۔ ۲۔ ایضاً، ج ۱، ص [illegible]۔

الفت و محبت کا مفصل احوال ہے۔ فاضل مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

”زیر نظر کتاب میں ایسا مواد جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں معروضیت کے ساتھ تاریخی حقیقت بھی ہو۔ مغلوں نے یہاں آکر اپنے پاؤں جمانے کی خاطر قدم قدم پر اپنا خون بہایا اور یہاں کے لوگوں کا بھی خون بہا۔ جب وہ یہاں جم گئے تو پھر اس کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہیے کہ انھوں نے علاقوں کی تسخیر کے بعد یہاں کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کن کن طریقوں سے کی۔ اس کتاب سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ہندوستان کو جنت نشان بنانے کی خاطر یہاں کے لوگوں کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انھوں نے ایک اچھی حکومت قائم کرنے کی خاطر یہاں کے لوگوں سے ہر طرح کا میل جول بڑھایا، ان کے رسم و رواج میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی ان کے پرسنل لاء کو برقرار رکھا، ان کی معاشرتی زندگی میں کوئی خلل نہیں ڈالا ملک کے نظم و نسق میں ان کو اپنا شریک کار بنایا، ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ مسلمانوں نے اگر کہیں شورش یا بغاوت کی تو ان کے کچلنے کے لیے ہندو فوجی سرداروں اور منصب داروں کو بھیجنے میں تامل نہیں کیا۔ شادی بیاہ کے ذریعہ سے رشتے بھی قائم کیے اور ان کے دلوں کی تسخیر کے لیے اکبر نے تو اپنا آبائی مذہب بھی چھوڑ دیا۔ پھر ہندوؤں کے مذہبی علوم میں وید، مہابھارت رامائن اور اپنشد وغیرہ سے پوری دلچسپی لی، ہندو مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں اشتراک پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ ان کے روایتی قصے کہانیوں کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور آگے چل کر تو اپنی مذہبی زبان عربی اور سرکاری زبان فارسی کو چھوڑ کر ایک ایسی زبان اختیار کر لی جس کو ہندو مسلمان دونوں بولنے لگے۔ یہ تو آسانی سے دکھایا جا سکتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے بڑی بڑی لڑائیاں لڑ کر خونریزی اور غارت گری کی لیکن کیا یہ دکھانا مشکل ہے کہ یہاں رہ کر مسلمانوں نے ہندوؤں سے کس کس طرح میل جول بڑھایا۔ یہاں کے تمدن کو کس کس طرح سنوارا اور یہاں ذہنی اور مذہبی خیالات میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کیں۔ ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب

میں بڑی رنگا رنگی ہے اور یہی اس کی اصل خوبی ہے... وطن کی خدمت اس میں ہے کہ اس کے ماضی کے روشن، خوشگوار اور تعمیری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر وطن کے لوگوں کے صحت مند رجحانات کی نشو و نما کی جائے زیر نظر کتاب میں یہی کوشش کی گئی ہے"۔(۱)

جلد سوم: یہ جلد پہلی دونوں جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ ضخیم اور ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی اس میں عالمگیر اور اس کے بعد مغل حکمرانوں بہادر شاہ اول، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ وغیرہ کے جذبہ وطنیت، بے تعصبی اور ان کی مذہبی رواداری کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ ان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس عہد کے ہندو منصب داروں اور راجاؤں کے ساتھ مغلوں کی رواداری، فراخدلی اور مذہبی بے تعصبی کے حالات وواقعات بھی بیان کیے گئے ہیں جس سے اس عہد کے وسیع القلب اور وسیع المشرب مذہبی رواداری کی پوری تاریخ نمایاں ہو گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ ہند کا یہ اہم ترین باب جنگوں اور معرکہ آرائیوں کی روایتی تاریخ نویسی کے انبار ہیں، ہمارے مورخوں کی نظر سے اوجھل تھا۔

مباحث کو مزید وقیع بنانے کے لیے کتاب میں فاضل مورخ نے عہد مغلیہ کے بارے میں دور حاضر کے بعض غیر جانبدار غیر مسلم مورخین کے آراء و خیالات اور ان کے تبصرے بھی شامل کیے ہیں۔ ان میں پروفیسر سری رام شرما، ڈاکٹر پی سرن، بی۔ این پانڈے اور شری ان۔ سی سکسینہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شروع میں ایک مبسوط اور جامع مقدمہ ہے جس میں انھوں نے مشہور مورخ جدوناتھ سرکار کے خیالات سے مبحث بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ انھوں نے اپنی تصانیف ہسٹری آف اورنگ زیب اور فال آف دی مغل امپائر کی چار جلدوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل انگریزوں کے سیاسی مطمح نظر کی ہمنوائی ہے اور اسی لیے برطانوی حکومت کی طرف سے ان کی بڑی قدر کی گئی اور اعزاز سے نوازا گیا۔(۲)

کتاب کا بڑا حصہ چونکہ عالمگیر کی مذہبی رواداری کے واقعات پر مشتمل ہے اس لیے قدر تاسر جدوناتھ سرکار کے نتائج فکر سے زیادہ بحث کی گئی ہے جو اپنی عالمگیر دشمنی میں خاصے معروف و مشہور ہیں۔ اس بحث میں خلاف معمول مصنف کا لب و لہجہ جابجا تیز اور تلخ محسوس

۱- مذہبی رواداری ج ۲، ص ۳-۴۔ ۲- ایضاً ج ۳، ص ۱۔

ہوتا ہے لیکن انھوں نے اس کا سبب جدوناتھ سرکار کی ان ناروا اور اشتعال انگیز تحریروں کو بتایا ہے جن میں انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خواہ مخواہ زہر افشانی کی ہے۔(۱)

اس کتاب کا مقصد تالیف بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غیر معتدل اور جانبدار مورخوں کی پھیلائی ہوئی نفرت و بدگمانی اور ان کے ذہنی شکوک و شبہات کو رفع کر کے قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور ان میں موانست و یگانگت کی فضا ہموار کرنا ہے(۲)۔ کتاب کی سطر سطر سے ماضی کے روشن، خوشگوار، تعمیری اور مثبت پہلوؤں کی روشنی جھلکتی ہے مقصد یہاں پوری طرح عیاں ہے کہ ملک میں صحت مند رجحانات و میلانات کے ساتھ ایک دوسرے سے محبت و ہمدردی کی فضا قائم ہو۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

> "یہ کتاب لکھ کر دلوں کو توڑنے اور نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکانے کے بجائے دلوں کو جوڑنے اور محبت و یگانگت کی خوشگوار لہر دوڑانے کی کوشش کی گئی ہے"۔(۳)

سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات

صباح الدین صاحب کی یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نے شائع کی اس میں سلاطین دہلی کے عہد کے ان واقعات کو جمع کیا گیا ہے جن سے سلاطین دہلی اور عام لوگوں کی وطن دوستی، ملک نوازی اور ہندوستان سے ان کی محبت و شیفتگی اور الفت و انس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتاب دراصل مذکورہ بالا کتابوں کا ہی عطر و خلاصہ ہے۔

بعض متعصب مغربی مورخوں نے اس عہد کے بعض سلاطین کو محبت و شیفتگی ملک کے جذبہ سے خالی بتایا ہے۔ اس کتاب سے بقول مولانا ضیاء الدین اصلاحی "اس الزام کی تردید ہوگئی کہ وہ حب وطن کے جذبے سے عاری تھے"۔(۴)

مصنف نے معتبر و مستند حوالوں سے دکھایا ہے کہ مسلمان اگرچہ باہر سے آئے مگر انھوں نے اس ملک سے اتنا پیار کیا جتنا کہ یہاں کے دوسرے باشندوں کو تھا۔ اس کتاب کا مقصد تصنیف بھی قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے جذبات کا فروغ ہے۔

۱- مذہبی رواداری ج ۳، ص ۳۵۔ ۲- ایضاً ج ۳، ص ۳۶۔
۳- نیا دور یاد رفتگاں نمبر ص ۱۲۵۔ ۴- ایضاً ص ۱۲۶۔

مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات

۱۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب صباح الدین صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۸۸ء میں دارالمصنفین نے شائع کی۔ اس میں جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے مغل بادشاہوں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور ان کے عہد کے مشہور مورخین و مصنفین نے ہندوستان اور اس کے باشندوں، شہروں، قصبوں، قدرتی مناظر، جانوروں مختلف قوموں کے تہواروں اور دیگر امور کے بارے میں اپنی جس دلچسپی اور شیفتگی و محبت کا اظہار کیا ہے ان سب کو معتبر ماخذوں اور معاصر مستند تاریخوں کی مدد سے قلمبند کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا مقصد تالیف بھی دراصل ملک میں اتحاد و یکجہتی اور ہم آہنگی کے جذبات کو فروغ دینا ہے۔ اگرچہ اس میں ایک خاص قسم کے واقعات جمع کیے گئے ہیں لیکن وہ تاریخ کا بڑا حصہ ہیں۔ یہ کتاب تاریخی خدمت ہونے کے ساتھ قومی خدمت بھی ہے۔

بابری مسجد

اجودھیا کے بابری مسجد کے قضیہ اور اس کی شہادت وانہدام کے واقعات سے اب ہر شخص واقف ہے مگر اس کی معتبر و مستند تاریخ سے عوام تو کیا علمی دنیا کے خواص بھی ناواقف تھے۔ یہ قضیہ جوں جوں عروج و شدت اختیار کرتا گیا یہ ضرورت بھی اسی درجہ محسوس کی گئی کہ اس کی اصل حقیقت تاریخ کے مستند اوراق سے تلاش کی جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر صباح الدین صاحب نے بابری مسجد کی تعمیر سے لے کر عہد حاضر تک کی پوری تاریخ معتبر و مستند تاریخوں کے حوالہ سے مرتب کی۔ اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ بابری مسجد کی تاریخ کے ساتھ اس کے تنازعہ کی پوری روداد اس میں آگئی ہے اور بابری مسجد تنازعہ کے سلسلے میں موافق و مخالف تحریروں پر ناقدانہ تبصرہ اس جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ کا شاید ہی کوئی ایسا اہم پہلو ہو جو فاضل مورخ کی نظر سے پوشیدہ رہ گیا ہو۔ لیکن ایک جذباتی موضوع ہونے کے باوجود تاریخ نویسی کے اصولوں سے ذرا بھی اعراض نہیں کیا گیا اور مستند ترین ماخذ و مصادر کو ہی پیش نظر رکھا گیا۔ اس کتاب کو صباح الدین صاحب اپنی مستقل تصنیف نہیں سمجھتے تھے اس لیے سرورق پر اپنا نام مرتب کی حیثیت سے نہیں لکھوایا لیکن مقدمہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی اب تک اس کے دسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں یہ بھی دارالمصنفین کی نہایت مقبول کتاب ہے۔

غیر تاریخی تصانیف پر ایک نظر

صباح الدین صاحب نے مستقل تاریخی کتابوں کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی نہایت وقیع اور اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ یہاں ان کا سرسری تعارف اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ ان کے علمی کارناموں کا مرقع اجمالاً ہی سہی لیکن مکمل طور پر سامنے آجائے اور یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ گو یہ کتابیں فنی اعتبار سے تاریخ کے ضمن میں نہیں آتیں لیکن ان میں بھی فاضل مورخ کی مورخانہ بصیرت صاف نظر آتی ہے۔

۱- مقدمہ دیوانِ فغاںؔ

اردو فارسی کے مشہور شاعر مرزا اشرف علی فغاںؔ جو میرؔ و سوداؔ کے ہمعصر اساتذہ سخن میں سے تھے ان کا دیوان زیور طباعت سے محروم تھا صب۔اح الدین صاحب نے اپنے وطن دیسنہ کے کتب خانہ الاصلاح میں موجود نسخہ دیوان فغاںؔ کو مولانا عبدالسلام ندوی کی خواہش پر مرتب کیا اور اس پر ایک مبسوط جامع اور گرانقدر مقدمہ لکھا جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بہت پسند کیا اور انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔

۲- ڈاکٹر سید محمود

یہ کتاب دراصل صباح الدین صاحب کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے جنگ آزادی کے ایک رہنما اور دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر ڈاکٹر سید محمود کی وفات پر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے معارف میں لکھا تھا۔ مقالہ طویل ہونے کی وجہ سے کتابی صورت میں ۱۹۷۲ء میں شائع کیا گیا۔

یہ کتاب ڈاکٹر سید محمود کی کوئی مستقل اور مربوط سوانح عمری نہیں ہے لیکن ان کی حیات اور ان کے کارناموں کے بارے میں فاضل مصنف نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ڈاکٹر سید محمود کی قومی وسیاسی سرگرمیوں کا اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط کے ہندوستان کے سیاسی حالات سے ڈاکٹر سید محمود کا بڑا

گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لیے یہ کتاب گذشتہ نصف صدی کی قومی و سیاسی اور جنگ آزادی کی جدو جہد کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے۔

یہ کتاب آج تاریخ کا نہیں بلکہ سوانح کا حصہ ہے لیکن کل جب مورخ بیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ قلمبند کرے گا تو یہ کتاب اس کو تاریخ کے ماخذ کا کام دیگی۔

۳- محمد علی کی یاد میں

اس کتاب میں علامہ شبلی کے شاگرد اور عظیم قومی رہنما اور سیاسی قائد مولانا محمد علی جوہر کی ہنگامہ خیز سیاسی زندگی، قومی و ملی خدمات، ان کی حب الوطنی، تحریک خلافت اور ان کے بعض حالات زندگی اور کارناموں کو قلمبند کیا گیا ہے۔

یہ کتاب سوانح کا حصہ ہے تاہم مولانا محمد علی جوہر کا چونکہ قومی و ملی اور سیاسی زندگی کے نشو و نما میں بڑا اہم کردار رہا ہے اس لیے یہ کتاب بھی جدید تاریخ ہند خصوصاً تحریک خلافت کی تاریخ کی ایک اہم کڑی اور بنیاد قرار دی جاسکتی ہے جو گو ان کے ایک عاشق و شیدائی کے قلم سے ہے لیکن اس میں بھی ان کی مورخانہ دیانت و اعتدال پوری طرح موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں دارالمصنفین نے شائع کی۔

۴- غالب مدح و قدح کی روشنی میں

صباح الدین صاحب مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ محقق، ادیب و انشاء پرداز بھی تھے یہ کتاب ان کی ادبی تحقیق و تجزیہ نگاری کا بہترین نمونہ اور غالبیات میں اہم اضافہ ہے۔

یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مرزا غالب کے عہد سے ۱۹۶۹ء تک ان کی زندگی اور شاعری کے متعلق موافقت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور ماہرین غالبیات نے غالب کی شاعری کے جن جن پہلوؤں پر لکھا ہے اس کتاب میں اس پر مفصل ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح غالبیات میں یہ اپنی نوعیت کی اولین اور اہم ترین کتاب ہے جو عام قارئین کے علاوہ غالبیات کے محققوں اور طالب علموں کو غالبیات کے دوسرے ماخذوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں اور دوسری جلد ۱۹۷۹ء میں دارالمصنفین نے شائع کی۔

۵-صوفی امیر خسرو

اس کتاب میں فارسی کے مشہور شاعر اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید باصفا امیر خسرو کے حالات و سوانح کو خود ان کے عصر کی تاریخوں اور تصوف و تذکرہ کی کتابوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے جس سے ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے ان کی بڑی پُر کشش شخصیت سامنے آجاتی ہے یہ کتاب دارالمصنفین سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔

۶-بزم رفتگاں

یہ صباح الدین صاحب کی ان غمناک تحریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک کے مشہور و ممتاز اصحاب علم و فضل، اہل سیاست اور اعزہ و احباب کی وفات پر معارف میں لکھے تھے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، عنایت اللہ دہلوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالسلام ندوی سے متعلق تعزیتی و تاثراتی مضامین ہیں۔ اس حصہ میں سید صاحب پر چھ مضامین ہیں اور کتاب کا بڑا حصہ سید صاحب ہی کے حالات و سوانح، علم و فضل اور افادات کے متعلق ہے۔ یہ حصہ ۱۹۸۱ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ اسی سال بزم رفتگاں کا دوسرا حصہ مکتبہ جامعہ ہی کے تعاون سے دارالمصنفین نے شائع کیا اس میں مندرجہ ذیل ارباب سیاست اور اصحاب علم و فضل کی وفات پر مصنف کے ماتمی نثری مرثیے شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ذاکر صاحب، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، ہمایوں کبیر، پروفیسر محمد اجمل خاں، نواب علی یاور جنگ بہادر، فخر الدین علی احمد، ڈاکٹر محمد اسحاق، سید نجیب اشرف ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، سید ریاست علی ندوی، پروفیسر اختر اورینوی، ماہر القادری، پروفیسر سنتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر وحید مرزا، بشیر احمد ڈار، مولانا عبدالسلام قدوائی، حضرت شاہ آفاق احمد رودولوی۔

یہ کتاب اگرچہ سوانحی خاکوں کا مجموعہ ہے لیکن آئندہ زمانہ میں ہندوستان کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ یقیناً کار آمد مرجع ثابت ہوگی۔

اس طرح کے نثری مرثیے اور بھی صباح الدین صاحب نے سپرد قلم کیے ہیں جن سے بزم رفتگاں کی تیسری جلد بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔

۷۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی سوانح عمری ۸۵۰ صفحات پر مشتمل حیات شبلی لکھی جو محض علامہ شبلی کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی گذشتہ دو سو برسوں کی مختصر علمی تاریخ بھی ہے۔ یہ کتاب اصلاً اسی کی تلخیص ہے مگر اس میں حیات و سوانح کے علاوہ علامہ شبلی کی تمام تصانیف پر جامع تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں علامہ شبلی کی تاریخی تصانیف اور ان کی مورخانہ حیثیت اور صباح الدین صاحب کے مورخانہ طریقہ کار کی وجہ سے تاریخ کے بعض عناصر کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔

۸۔ پیر حسام الدین راشدی اور ان کے علمی کارنامے

پیر حسام الدین راشدی کی شخصیت علم و تحقیق کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ بلند پایہ محقق و نقاد تھے انھوں نے اردو سندھی اور فارسی میں کئی کتابیں لکھیں اور متعدد کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ صباح الدین صاحب سے ان کے بڑے اچھے اور نج کے تعلقات تھے اسی لیے انھیں پیر حسام الدین راشدی یادگاری خطبہ دینے کے لیے کراچی میں مدعو کیا گیا۔ زیر نظر کتابچہ دراصل وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء میں انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کراچی کے اہتمام میں پیر حسام الدین راشدی کے کارناموں کے متعلق پیش کیا تھا۔ اس میں پیر صاحب کے علمی، تحقیقی، تنقیدی اور ادبی کارناموں اور ان کی بلند شخصیت کا تعارف کرایا گیا ہے اور مصنف نے اپنے نجی تعلقات کو بھی اس میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کراچی نے ۱۹۸۵ء میں شائع کی۔

۹۔ اسلام اور مستشرقین

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین نے فروری ۱۹۸۲ء میں ایک بین الاقوامی سمینار کیا تھا جس میں ملک و بیرون ملک کے نمایاں اہل علم اور اصحاب فضل و کمال کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اسی سمینار کی مفصل روداد ہے جسے دارالمصنفین نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ اسلام میں مذہبی رواداری

صباح الدین صاحب نے عہد ماضی کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی جو

تاریخ لکھی تھی وہ تین حصوں میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں مذہبی رواداری کی جو تعلیمات دی گئی ہیں اور حضور اکرم ﷺ کے اصحاب کرامؓ، مسلمان فرمانرواؤں اور دینی رہنماؤں نے اس سلسلہ میں جو اسوہ و نمونہ پیش کیا ہے اس کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے، تاکہ عمومی حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں پر تعصب اور عدم رواداری کا الزام لگانے والوں کے بے بنیاد اعتراضات خود بخود بے اثر ہو جائیں۔ زیر نظر کتاب اسی خیال کا نتیجہ ہے اس سے اسلام اور مسلمانوں کی رواداری کی تعلیمات اور عملی نمونے سامنے آجاتے ہیں۔ اسے دارالمصنفین نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اسے مذہبی رواداری کے سلسلہ کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔

۱۱- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ــــ ایک مطالعہ

اس کتاب میں فاضل مرتب نے اپنے استاذ و مربی مولانا سید سلیمان ندوی کی چند اہم تصانیف کا مبسوط اور جامع تعارف اور ان پر مفصل ناقدانہ تبصرہ اس طرح کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر اصل کتابوں کے مطالعہ کا شوق تیز ہو جاتا ہے اور یہی اس مجموعہ مضامین کا مقصد بھی ہے۔ جن کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

حیات مالک، دروس الادب، بہادر خواتین اسلام، لغات جدیدہ، ارض القرآن، رسالہ اہل سنت والجماعت، سیرت عائشہؓ، برید فرنگ، خلافت اور ہندوستان، خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، خیام۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ضیاءالدین اصلاحی لکھتے ہیں:

> "سید صاحب کا علمی ذوق بہت متنوع تھا۔ علاوہ ازیں ان کی ہر تصنیف جلوہ صد رنگ کی حامل ہوتی ہے۔ اس تبصرہ میں ان سب کی جھلک آگئی ہے۔ اس میں سید صاحب کی تعبیر و بیان کی دلکشی و دلآویزی کے جلوے اسلامی علوم و فنون سے ان کی باخبری، قرآنیات و حدیث و رجال، فقہ و کلام اور تاریخ و سیر میں مہارت، علمی ژرف نگاہی، محققانہ نکتہ رسی، فلسفیانہ دقیقہ سنجی اور تنقیدی بصیرت و دیدہ وری کے نقوش پیش کیے ہیں اور ادب و انشاء کی حلاوت و شیرینی، طریقہ ادا کی جدت و تازگی اور تحریر و نگارش کی سلاست و

شگفتگی کے نمونے بھی دیئے ہیں"۔(۱)

کتاب کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں سید صاحب کے حالات و سوانح اور ان کے متنوع کمالات کا مختصر مرقع پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فاضل مرتب کی وفات کے بعد ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

تاریخی مقالات

صباح الدین صاحب نے متعدد علمی و تحقیقی اور تاریخی مقالات بھی سپرد قلم کیے۔ ان کی اس قسم کی تحریروں میں بعض تاریخی مقالات اور تاریخ کی کتابوں پر طویل تبصرے اور معارف کے شذرات میں تاریخ کے متعدد پہلوؤں اور گوشوں پر اظہار خیال شامل ہیں۔ ان کی یہ تمام مورخانہ تحریریں معارف کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔

صباح الدین صاحب کی تاریخ نگاری کا تنقیدی جائزہ

تاریخ کے موضوع پر دارالمصنفین کے رفقائے علمی میں بلاشبہ صباح الدین صاحب نے فن تاریخ کی سب سے زیادہ خدمت کی اور اردو کے دامن کو نہایت قیمتی تاریخی ثروت و دولت سے مالا مال کیا۔ خصوصاً ہندوستان کے عہد وسطی کی اسلامی تاریخ کا انھوں نے جس وسعت و گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا اور تقریباً ۳۵ کتابیں اور سیکڑوں تاریخی مقالات سپرد قلم کیے یہ نہ صرف ان کا بلکہ دارالمصنفین کا بڑا اور قابل فخر کارنامہ ہے۔

صباح الدین صاحب اصولی طور پر تہذیب و ثقافت کے دیدہ ور مورخ تھے۔ ان کی تصانیف کا مرکزی نقطہ اور فوکس (Focus) عہد وسطی کے ہندوستان کی تہذیبی و تمدنی تاریخ پر مرکوز رہا، گو اس میں بعض سیاسی واقعات بھی آگئے ہیں تاہم ان کی حیثیت ثانوی اور ضمنی ہے۔ ان کا قاری خود کو تاریخ کے ان گذشتہ ایام میں رزم کی وقتی چیخ و پکار کے بجائے معاشرہ اور سماج کی مستقل اور پائیدار بزم میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

علامہ شبلی نے تاریخ میں سیاسی تاریخ کے ساتھ تہذیبی و ثقافتی تاریخ کی شمولیت ضروری قرار دی تھی تاکہ ہر عہد اور ہر دور کے قریباً تمام پہلو واضح ہو سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایشیائی تاریخ میں صرف جنگ و جدل اور خونریزیوں کے واقعات لکھنے کی وجہ سے یورپ کے

۱- مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، دیباچہ ص ۱-۲۔

جدید مورخین ایشیا کی تاریخوں کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں۔ اسی خیال کے تتبع میں ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے ہندوستان کے بعض سیاسی حالات کے پس منظر میں تہذیبی و تمدنی تاریخ لکھنے پر ہی اصرار کیا اور مورخین کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ایسی تاریخ لکھیں جس سے نفرت و عداوت کا جذبہ نہ پیدا ہو بلکہ اس سے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جائیں اور اتحاد، یکجہتی اور محبت والفت کی فضا قائم ہو سید صاحب کے اس مشورہ پر سب سے زیادہ صباح الدین صاحب نے عمل کیا اور ان کی بیشتر کتابوں کا مقصد تالیف ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ ہے۔ وہ اپنی تاریخ سے ہندوستان میں اتحاد و یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نوع سے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تاریخ ایک بلند، مثبت اور پُر خلوص مقصد کے لیے قلمبند کی۔ بظاہر صباح الدین صاحب کے اس طریقہ کار سے یہ کہہ کر اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مطلق جانبداری سے کام نہیں لیا۔ لیکن ہماری نظر مشہور انگریز مورخ ہنری الیٹ پر جاتی ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت و عداوت برپا کرنے کے لیے اپنی تاریخ میں مسلمان حکمرانوں کے صرف تاریک پہلوؤں کو پیش کیا اور اس کے باوجود اسے اہمیت دی گئی اور آج کے دور میں بھی اسے ایک اہم مورخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو پھر صباح الدین صاحب کی یہ شعوری کوشش کہ مسلمانوں کی تاریخ کے سچے اور روشن پہلوؤں کو پیش کیا جائے قطعی درست اور بامقصد ثابت ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ خود صباح الدین صاحب کو بھی اس کا احساس تھا انھوں نے برملا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ ان کا مقصد صرف تاریخ نویسی کے فرائض کی انجام دہی نہ تھا بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی جو دیدہ و دانستہ غلط قسم کی تاریخ لکھ کر پیش کی گئی ہے اور اس سے جو بُرے اثرات پیدا ہوئے ہیں ان کو زائل کرنا بھی مقصود تھا۔(۱)

اس کے باوجود اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان کی کتابوں میں فن تاریخ نویسی کے اصولوں کو پوری طرح برتا گیا ہے۔ مثلاً صحت و صداقت واقعہ، روایت و درایت سے اس کی تصدیق، قیاس و اجتہاد سے مفید نتائج کے استنباط، بلند پایہ معیار تحقیق و تدقیق، مآخذ و مصادر کا انتخاب اور استناد و حوالہ کے اہتمام میں ان کی تصانیف دوسرے مورخوں سے کسی طرح کم نہیں۔

۱- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک ص ۸۔

صباح الدین صاحب نے اپنی تصانیف میں تحقیق و تدقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا اور ہر واقعہ کو اصل مآخذ اور معتبر و مستند تاریخوں سے بے کم و کاست نقل و قلمبند کیا۔ مثلاً بزم تیموریہ میں ان کے اہم مصادر تزک بابری، تزک جہانگیری اور اکبر نامہ وغیرہ رہے ہیں۔

واقعات کی تحقیق میں اپنے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح انھوں نے روایت و درایت کے اصولوں کو مکمل طور پر برتا جس کا اظہار ان کی تصانیف کے صفحہ سے ہوتا ہے۔ طوالت کے پیش نظر اس کی مثالوں سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔

تاریخ نویسی میں اسباب و علل کی تلاش و تحقیق نہایت ضروری امر ہے اس کے بغیر بہت سے واقعات اپنی اصل صورت میں ظاہر نہیں ہوتے اور پھر استنباط نتائج میں مورخ غلطی کر بیٹھتا ہے، اسی لیے اسے علامہ شبلی نے مورخ کا لازمی فریضہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ صباح الدین صاحب نے بھی اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تاریخ میں تسلسل پیدا کرنے اور اس سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے مورخ کو قیاس واجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو ربط کے فقدان کی بڑی خامی پیدا ہوتی ہے جس سے واقعات کی اہمیت وافادیت پر حرف آنے کا شبہ رہتا ہے، صباح الدین صاحب نے اس پہلو سے بھی کہیں صرف نظر نہیں کیا۔

غیر جانبداری، بے تعصبی اور لاتعلقی مورخ کا اصل منصب ہے۔ صباح الدین صاحب نے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی جس تمدنی تاریخ کی مرقع آرائی کی ہے اور اپنی تصانیف میں جو واقعات معاصر تاریخوں اور مستند حوالوں سے لکھے ہیں یا قیاس واجتہاد سے جو نتائج اخذ و استنباط کیے گئے ہیں ان میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ ہر جگہ غیر جانبدار ترجمان کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اگر کہیں وکالت بھی ان کے قلم سے نظر آتی ہے تو وہ مستحکم دلائل کی بنیادوں پر ہوتی ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر وہ تہذیبی مورخ ہیں اور انھوں نے اپنی تصانیف میں صرف مسلمانوں کی تمدنی تاریخ لکھی ہے جس کی بنیاد پر بعض لوگوں کو جانبداری کا شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخ نویسی کا موضوع ہی تہذیبی و تمدنی تاریخ قرار دیا تھا اور اس میں انھوں نے کہیں بھی جانبداری

کا ثبوت نہیں دیا۔

صباح الدین صاحب نے اپنی تصانیف میں جو واقعات لکھے ہیں وہ معتبر و مستند کتابوں سے لیے ہیں اور ان کے حوالہ کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ اس صنعت یعنی سند و حوالہ کا التزام اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی نے شروع کیا۔ صباح الدین صاحب نے اپنے پیشرو اور تاریخ کے معلم اول کے اصولوں کا پورا لحاظ رکھا ہے اور اپنی تصانیف میں کوئی واقعہ یا روایت بغیر سند یا حوالے کے نقل نہیں کی۔

تاریخ نگاری کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے جس میں انشا پردازی اور لفاظی کا دخل نہیں ہوتا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں "تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں"۔ چنانچہ صباح الدین صاحب نے بھی تاریخ کی کتابوں میں تاریخی اسلوب نگارش ہی سے کام لیا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر لفاظی اور بے جا انشاء پردازی کا گمان ہوتا ہے۔

صباح الدین صاحب کی تاریخ نگاری اور ان کی بلند پایہ اور معیاری تاریخی تصانیف کی بنیاد پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے عہد کے ایسے باکمال مورخ تھے جس کی مثال برصغیر کے مورخوں میں مشکل سے ملے گی۔

باب ششم

دیگر رفقائے دارالمصنفین کے تاریخی کارنامے

گذشتہ ابواب میں بانی دارالمصنفین علامہ شبلی نعمانی، معمار دارالمصنفین مولانا سید سلیمان ندوی اور نظمائے دارالمصنفین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن کے تاریخی کارناموں کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں دیگر رفقائے دارالمصنفین کے تاریخی کارناموں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ دارالمصنفین کی مجموعی تاریخی خدمات کا مکمل مرقع سامنے آجائے۔

چونکہ دارالمصنفین کا بنیادی مقصد بلندپایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ نیز نوجوان فضلا کو تصنیف و تالیف کے لیے تیار کرنا تھا اس لیے ۱۹۱۴ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کے خیال کے مطابق مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کی مدد سے دارالمصنفین میں اہل علم و قلم اور نوجوان فضلاء کو جمع کر کے تصنیف و تالیف اور ان کی تربیت کا کام شروع کیا۔ پھر یہ سلسلہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن نے جاری رکھا اب یہ ذمہ داری مولانا ضیاءالدین اصلاحی صاحب کے ہاتھوں انجام پارہی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سے لے کر آج (۱۹۹۸ء) تک دارالمصنفین میں پچیسوں رفقاء نے تصنیف و تالیف کا اہم فریضہ انجام دیا ہے اور متعدد نوجوان فضلاء نے تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کی ہے۔

رفقاء کی تربیت اور ان کی تصنیفی و تالیفی نشو و نما میں دارالمصنفین کو ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے رفقاء نے گرانقدر علمی خدمات انجام دی ہیں جو گوناگوں اور مختلف النوع ہیں۔ لیکن ہم اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے صرف مورخ رفقاء کے مختصر حالات زندگی اور ان کے تاریخی کارناموں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۱۹۱۴ء سے اب تک مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن جن کا ذکر گذشتہ ابواب میں ہو چکا ہے، کے علاوہ مندرجہ

ذیل اشخاص دارالمصنفین سے بحیثیت رفیق وابستہ رہے۔

۱- مولانا عبدالسلام ندوی
۲- مولانا حاجی معین الدین ندوی
۳- مولانا عبدالباری ندوی فلسفی
۴- مولانا ابوالحسنات ندوی
۵- مولانا سید ریاست علی ندوی
۶- مولانا سید ابو ظفر ندوی
۷- مولانا سعید الانصاری
۸- سید نجیب اشرف ندوی
۹- مولانا ابوالجلال ندوی
۱۰- ڈاکٹر محمد عزیر
۱۱- مولانا مجیب اللہ ندوی
۱۲- مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
۱۳- مولانا محمد یوسف کوکن
۱۴- مولانا عبدالسلام قدوائی
۱۵- مولانا ضیاء الدین اصلاحی
۱۶- ڈاکٹر نعیم صدیقی
۱۷- مولانا شاہ نصر احمد پھلواروی
۱۸- مولانا وحید قیصر ندوی
۱۹- مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی
۲۰- مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی
۲۱- مولانا محمد منصور نعمانی
۲۲- مولانا عبیداللہ کوثی ندوی
۲۳- مولانا محمد عارف عمری

مذکورہ رفقاء میں مولانا سید ابو ظفر ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، سید نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر محمد عزیر اور مولانا عبدالسلام قدوائی کی مورخانہ حیثیت معروف و مسلّم ہے۔ اس لیے اس باب میں ہم ان کی تاریخی خدمات کا قدرے تفصیل سے جائزہ پیش کریں گے۔ مولانا عبدالباری ندوی فلسفہ، مولانا ابوالجلال ندوی قرآنیات، مولانا اویس نگرامی تفسیر اور مولانا مجیب اللہ ندوی فقہ کے ماہر تھے اور چونکہ یہ موضوعات ہمارے موضوع سے خارج ہیں اس لیے ان کا ذکر اس باب میں نہیں ہوگا۔

ان کے علاوہ مولانا یوسف کوکن، مولانا منصور نعمانی، مولانا شاہ نصر احمد پھلواروی، مولانا وحید قیصر ندوی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی اور مولوی عبیداللہ کوثی نے صرف تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کی اور دارالمصنفین کے زمانہ قیام میں کوئی کتاب تصنیف نہ کر سکے اس لیے یہ بھی ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

بقیہ رفقائے دارالمصنفین کا تاریخ سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا ہے۔ کوئی مستقل تصنیف نہ سہی لیکن ان کے گرانقدر تاریخی مقالات سے ان کی مورخانہ حیثیت کا اندازہ ہوتا

ہے اس لیے ان کے تاریخی کارناموں کا بھی ایک جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنفین کے معماروں میں سے تھے اور شروع سے آخر تک وہ دارالمصنفین کے آفتاب علم بنے رہے تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اس لیے اس باب کی ابتداء انھیں کے ذکر سے کی جاتی ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی

علامہ شبلی نعمانی نے نامورانِ علم و فن کا جو کارواں اپنے پیچھے چھوڑا تھا مولانا عبدالسلام ندوی اس کے رکن اعظم تھے وہ علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی اور عزیز ترین شاگرد ہونے کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق کار، مولانا سید سلیمان ندوی کے دستِ راست اور دارالمصنفین کے معماروں میں سے تھے۔ مدۃ العمر تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں۔

اسوۂ صحابہؓ (دو جلدیں)، اسوۂ صحابیاتؓ، تاریخ اخلاق اسلامی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، اقبال کامل، شعر الہند (دو جلدیں)، امام رازی، ابن یمین، حکمائے اسلام (دو جلدیں)، فقرائے اسلام، القضاۃ فی الاسلام وغیرہ۔

مولانا نے کئی اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ان کو ترجمہ نگاری پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ان کے ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے ان کا شمار اردو کے چند ابتدائی کامیاب ترجمہ نگاروں میں ہوتا ہے مندرجہ ذیل ترجمے اس کا ثبوت ہیں۔

ابن یمین، ابن خلدون، انقلاب الامم، اسلامی قانون، فوجداری، التربیۃ الاستقلالیہ، تاریخ الحرمین الشریفین، تاریخ فقہ اسلامی، فطرت نسوانی اور فقرائے اسلام وغیرہ۔

ان معرکۃ الآراء کتابوں اور ترجموں کے علاوہ سیکڑوں علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی مضامین لکھے جو معارف کی جلدوں میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے سیرۃ النبیؐ اور حیات شبلی کی تالیف میں بھی حصہ لیا جس کا اظہار و اعتراف مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کتابوں کے مقدمہ میں کیا ہے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا عبدالسلام ندوی ۱۸۸۲ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں علاء الدین پٹی

میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کانپور، آگرہ اور چشمۂ رحمت غازی پور کی تعلیم گاہوں کا رُخ کیا اور آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے جہاں سے ۱۹۱۰ء میں درسیات کی تکمیل کی اور وہیں ادب کے استاذ مقرر ہوئے۔ اس وقت علامہ شبلی ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے علامہ شبلی نے یہیں تصنیف و تالیف کے لیے خاص تربیت کی۔ دور طالب علمی میں ان کی مضمون نگاری کا آغاز ہوا اور ۱۹۰۶ء میں پہلا مضمون مسئلہ تناسخ پر لکھا جسے علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ میں اپنے خصوصی نوٹ کے ساتھ نہ صرف شائع کیا بلکہ انعام سے بھی نوازا۔

مولانا کی خداداد تصنیفی صلاحیتوں کو بھانپ کر علامہ شبلی نے پہلے ان کو ماہنامہ الندوہ کا سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر بنا دیا۔ شروع ہی میں ان کے متعلق علامہ شبلی نے ایک کامیاب مصنف ہونے کی پیشین گوئی کی تھی جو اس طرح پوری ہوئی کہ ان کا شمار اردو کے چند نامور ترین مصنفین اور انشا پردازوں میں ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالا تو مولانا عبدالسلام ندوی کو کلکتہ بلا لیا۔ مولانا نے الہلال میں مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی نے وفات پائی اور ان کے ادھورے کاموں کی ذمہ داری مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد ہوئی اور انھوں نے علامہ شبلی کے تخیل کے مطابق دارالمصنفین کے کاموں کا آغاز کیا تو مولانا عبدالسلام ندوی کو کلکتہ سے اعظم گڑھ بلا لیا وہ دارالمصنفین آئے تو پھر مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کا علم سراسر وہبی تھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات مثلاً مذاہب، قرآن و حدیث، فقہ، فلسفہ و کلام، تاریخ و تصوف، سیر و سوانح، تعلیم اور شعر و ادب پر خامہ فرسائی کی اور بے شمار تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن رقمطراز ہیں۔

> "ان کا پہلا مضمون ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا اور جب ۴ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ان کا انتقال ہوا تو اس روز بھی ان کا قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اس پچاس سال میں قرآن پاک، تفسیر، حدیث، سیرت، کلام، فلسفہ، منطق، نفسیات، اجتماعیات، تاریخ اور شعر و ادب شاید ہی کوئی ایسا فن رہ گیا ہو جس کے کسی نہ

کسی گوشہ پر ان کا قلم نہ چلا ہو۔ علم و فن کا اتنا طویل المدت خدمت گذار اردو زبان میں شاید ہی کوئی گذرا ہو۔(۱)

مولانا شاعر بھی تھے اور شمیم تخلص کرتے تھے۔ ان کی غزلیں ماہنامہ معارف کی قدیم فائلوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کا یہ ذوق علامہ شبلی، محبوب الرحمن کلیم، شمشاد فرنگی محلی اقبال سہیل اور جگر و اصغر کی محبتوں کا نتیجہ تھا۔ وہ لکھنؤ کی شاعری کو دلی کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے اور خود بھی جلال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ گو ان کے کچھ اشعار داغ و امیر کے رنگ میں بھی ہیں۔

مولانا نہایت شریف، نیک اور معصوم صفت تھے۔ شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ دور رہے لیکن ان کے قابل قدر کاموں نے ان کو شہرت کے دربار میں بقائے دوام کی نعمت بخشی۔ ان کا کل سرمایہ حیات دارالمصنفین تھا۔ ۴/ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین ہی میں انتقال کیا اور علامہ شبلی کے مزار سے چند گز کے فاصلہ پر سپرد خاک کیے گئے۔

تاریخی تصانیف و تراجم

مولانا عبدالسلام ندوی نے گو کوئی مستقل تاریخ نہیں لکھی لیکن ان کی چند کتابوں کا تعلق بہر حال تاریخ سے ہے یا ان میں تاریخی تفصیلات پائی جاتی ہیں یہاں انھیں کا تعارف اور ان کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اسوۂ صحابیاتؓ

اس کتاب میں مولانا نے ازواج مطہراتؓ، بنات طیباتؓ اور اکابر صحابیاتؓ کی زندگی کے دینی، اخلاقی اور معاشرتی حالات کو نہایت مؤثر اور سبق آموز انداز میں لکھا ہے اور ان کی مذہبی، اخلاقی اور علمی خدمات کی تاریخ بھی تفصیل سے لکھی ہے۔ جس سے عہد رسالت کی خواتین کے اخلاق و معاشرت اور طرز زندگی کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔ اسے عموماً مذہبی و اخلاقی کتاب تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسوۂ صحابیاتؓ عہد رسالت کی خواتین کی تہذیبی و تمدنی تاریخ ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس سے خواتین کی طرز معاشرت اور ان کے معاملات زندگی کا مرقع سامنے آیا۔

۱۔ شبلی نیشنل کالج میگزین عبدالسلام ندوی نمبر ص ۵۴۔

اس کتاب کا سبب تالیف مولانا نے کتاب کے دیباچہ میں خواتین کی زندگی کی اصلاح وتربیت بنایا ہے۔ یقیناً اس سے یہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب خواتین کے لیے بہترین زادِ راہ اور تحفہ ہدایت ہے تاہم اس کی تاریخی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اسوۂ صحابہؓ

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق ومعاشرت وغیرہ کے متعلق صحابہؓ کرام کے مؤثر وسبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں۔
دوسری جلد میں صحابہؓ کرام کے مذہبی، سیاسی اور عملی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے جس سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی تعلیمات کا مرقع سامنے آجاتا ہے۔
اس کتاب کا مقصد تالیف مصنف کے نزدیک مسلمانوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ان کی ہدایت ورہنمائی کرنا ہے۔
یہ کتاب اگرچہ مذہبی انداز سے لکھی گئی ہے تاہم اس سے عہد صحابہؓ کے بعض اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور تمدنی واقعات سامنے آجاتے ہیں اور یہ کتاب مذہبی ہونے کے ساتھ تاریخ کا حصہ بھی ہو جاتی ہے۔
یہ دارالمصنفین اور مولانا عبدالسلام ندوی کی نہایت مقبول ترین کتاب ہے بلکہ سیرت نبویؐ کے بعد یہ اس کی دوسری اہم تصنیف ہے اب تک اس کے دسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تاریخ اخلاق اسلامی

مولانا عبدالسلام ندوی لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ کے اسلوب وانداز پر اسلامی اخلاق کی مفصل تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں پہلے بعثت نبویؐ سے پہلے کے عربوں کے اخلاق وکردار کی مرقع آرائی کی گئی ہے پھر اس میں اسلام نے جو انقلاب پیدا کیا اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بعد ازاں عہد رسالت میں جس طرح اخلاق وکردار کی تعمیر وتشکیل عمل میں آئی اس کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔
اس کتاب میں عہد نبویؐ کے اخلاق وکردار کی مفصل تاریخ آگئی ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنے نوع کی پہلی تاریخ ہے جو قلمبند کی گئی۔ اگر اس کی بقیہ جلدیں بھی مکمل ہو جاتیں تو

اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب روشن ہو جاتا۔

دارالمصنفین کی یہ کتاب اس لائق ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔

تاریخ الحرمین الشریفین

۱۳۲۷ھ میں عباس حلمی پاشا خدیو مصر نے فریضہ حج ادا کیا۔ اس سفر حج کے مشاہدات اور تاثرات کو اس کے دوست محمد لبیب البتونی نے الرحلۃ الحجازیہ کے نام سے اس خوبی سے مرتب کیا کہ یہ صرف سفرنامہ نہیں رہا بلکہ حرمین کی مفصل، مبسوط اور جامع تاریخ بن گیا۔ زیر نظر کتاب دراصل اسی سفرنامہ کے ترجمہ و تلخیص اور مولانا عبدالسلام ندوی کے مفید اضافوں کا مجموعہ ہے۔ مولانا کے تمام تراجم پر اصل کا گمان ہوتا ہے مگر اس کتاب میں مولانا نے جو اضافے کیے ہیں ان سے یہ کتاب حقیقتاً ترجمہ کی جگہ اصل معلوم ہوتی ہے۔

کتاب کی ابتداء مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمہ سے ہوئی ہے، جس میں انھوں نے تاریخ الحرمین الشریفین کو ارض حرم کی جامع تاریخ بتایا ہے اور خود بھی قرآن و احادیث کی روشنی میں ارض حرم کی مذہبی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

پھر فاضل مترجم نے مکہ معظمہ کے عام حالات کے تحت ارض حرم کی حکومت مکانات، راستے، لوگوں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج، لباس، زیارت گاہوں، ڈاکخانوں، قہوہ خانوں، قلعوں، کتب خانوں، تجارت، سکوں، بازاروں اور شفاخانوں کے حالات لکھے ہیں۔ نیز مکہ مکرمہ کی تاریخ، حکومت اشراف کا قیام، نجد میں آل سعود کی حکومت کا آغاز، غلاف کعبہ، محمل، حج، طواف، حجر اسود، جامہ احرام، منیٰ میں رجم اور قربانی کی مفصل تاریخ قلمبند کی گئی ہے اور منیٰ کے آثار کا بھی تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

پھر عمالیق کی لغوی تحقیق، چاہ زمزم اور حجر اسود کی تاریخی حیثیت اور لفظ مکہ کے اشتقاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد مدینہ منورہ میں خدیو مصر کی حاضری کے احوال کے ساتھ مدینہ کے مختلف ناموں، وجہ تسمیہ، قدیم باشندوں اور یہود و نصاریٰ کا تذکرہ ہے۔ ہجرت کے پس منظر کے ساتھ مدینہ کی مساجد کی تاریخ، مدینہ کی نئی تعمیر کی تاریخ نیز مدینہ کے مکانات، سڑکیں،

بازار، تجارات، حمام، خانقاہیں، کنویں، نہر، باغ، وادیاں، زیارت گاہیں اور کتب خانوں کا مفصل تذکرہ ہے۔ آخر میں مدینہ کی سیاسی حیثیت، آب و ہوا اور وہاں کے باشندوں کے عام اخلاق و عادات، خصائص و امتیازات اور قرآن مجید اور مدینہ کے عنوان سے معلومات پیش کیے گئے ہیں اور شہد مدینہ کے خصائص کا بھی ذکر ہے۔

اس طرح یہ کتاب حرمین شریفین کی مفصل تاریخ ہو گئی ہے اور اس میں اس وقت کے مکہ و مدینہ کے سیاسی، تہذیبی و تمدنی حالات بھی آگئے ہیں۔ اس کی افادیت بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> "بالخصوص مدینہ کے حالات میں بطور خود بہت سی معلومات کا اضافہ کرتا ہے اور اس طرح مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی حیثیت سے حرمین کی ایک نہایت مستند تاریخ مرتب ہوگئی ہے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حج اور مناسک حج کے فوائد، اسرار اور مصالح و حکم کا ایک غیر فانی یقین پیدا کردے گی دوسری طرف ایام حج میں مسلمانوں کی رہنمائی کا کام بھی دے گی اور اس کے ذریعہ سے وہ لوگ وہاں کے امراض اور بہت سے خطرات و توہمات سے محفوظ رہیں گے"۔(۱)

جب یہ کتاب مولانا نے مرتب کی تھی اس وقت اردو میں حرمین شریفین کی تاریخ پر کوئی مستقل تصنیف نہ تھی۔ مولانا نے اسے مرتب کرکے اردو زبان کی ایک بڑی کمی کو پورا کیا تھا۔

تاریخ فقہ اسلامی

علوم و فنون کی تاریخ کی تدوین بھی علامہ شبلی کے پیش نظر تھی جس کی طرف وہ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے متوجہ نہ ہو سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ نے بڑی حد تک یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ فقہ اسلامی اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

یہ مولانا عبدالسلام ندوی کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ عربی کے مشہور عالم و مورخ محمد الخضری کی کتاب التشریع الاسلامی کا اردو ترجمہ ہے اس میں فقہ اسلامی کے مختلف ادوار کی مفصل تاریخ لکھی گئی ہے۔

۱- تاریخ الحرمین الشریفین ص۵۔

اس میں فقہ اسلامی کی تاریخ کے چھ ادوار قائم کیے گئے ہیں اور پھر ہر عہد کے فقہ کی تاریخ لکھی گئی ہے اور ہر عہد کے فقہا کے حالات اور ان کے مذاہب نیز ہر دور کے فقہی تغیرات و انقلابات، خصوصیات اور امتیازات کو نہایت تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے اور ان انقلابات و تغیرات اور فقہ کی ترقی کے اسباب و علل کی بھی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

اس کتاب سے فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اسے دارالمصنفین نے شائع کیا اب تک اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

یہ سلسلہ نامور فرمانروایان اسلام کا ایک حصہ ہے۔ اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سوانح عمری اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ ان کی سوانح کے ساتھ اس عہد کی مکمل تاریخ اس میں آگئی ہے۔ شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں بنوامیہ کی ابتدائی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر بنوامیہ کی حکومت کے حدود بتائے گئے ہیں اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نسب، ولادت و وطن اور تعلیم و تربیت کا ذکر ہے۔ اسی میں ان کی ابتدائی سیاسی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے پھر ازواج و اولاد، حلیہ، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ نیز ان کی سیاست و حکومت کی مفصل تاریخ بھی لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد مآثر بنوامیہ کے تحت ان کی سیاسی، علمی، تہذیبی اور تمدنی کارناموں کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ آخر میں سلطنت بنوامیہ کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب علامہ شبلی کی مایہ ناز تصنیف الفاروق کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ اصلاً تاریخی سوانح عمری ہے جس سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد کی مفصل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

یہ بھی مولانا عبدالسلام ندوی کی اہم تصنیف ہے اسے دارالمصنفین نے ۱۹۱۹ء میں شائع کیا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تاریخی مقالات

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی تصنیفی زندگی میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں علمی ادبی اور تاریخی مقالات سپرد قلم کیے جو ماہنامہ الندوہ، الہلال اور معارف اعظم گڑھ کی

فائلوں میں محفوظ ہیں ادبی مقالات کا ایک مجموعہ دارالمصنفین نے مقالات عبدالسلام کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ البتہ تاریخی مقالات ان رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں یہاں ان کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے جس سے ان کی تاریخی خدمات اور مورخانہ بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ اسلام اور نصرانیت کی کشمکش روس میں۔ اس میں مولانا نے روس میں اسلام اور نصرانیت کے درمیان جو کشمکش ہوئی اس کی تاریخ لکھی۔ یہ مقالہ اپریل ۱۹۱۸ء سے ستمبر ۱۹۱۸ء تک پانچ قسطوں میں لکھا ہے۔

۲۔ اسلام کے مختلف فرقوں کی نشوونما۔ اس میں فرق اسلامی کی ابتدائی تاریخ ہے یہ مقالہ اپریل، مئی ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔

۳۔ قسطنطنیہ کے کتب خانے (الندوہ، مارچ ۱۹۱۰ء)

۴۔ العرب قبل الاسلام (الندوہ، ستمبر ۱۹۱۰ء)

۵۔ عمارات اسلام (معارف، جولائی تا اکتوبر ۱۹۱۶ء)

۶۔ اسلامی یتیم خانے (معارف، اگست ۱۹۱۷ء) موجودہ مشرقی کتب خانے۔ ترکی، شام و مصر (معارف، جولائی تا ستمبر ۱۹۱۹ء) علمائے اسلام کا اخلاق (معارف، مئی تا ستمبر ۱۹۴۶ء) اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے (معارف، اگست تا نومبر ۱۹۴۹ء) تاریخ اخلاق یورپ (معارف مارچ ۱۹۱۸ء) مسلمانان روس (معارف، مئی ستمبر ۱۹۱۸ء) تصوف کی اجمالی تاریخ (معارف، اپریل تا اکتوبر ۱۹۳۵ء) تاریخ طب کے پوشیدہ ورق (معارف، جون ۱۹۳۰ء) اسلامی طب کی مختصر تاریخ (معارف، جنوری، فروری ۱۹۴۸ء) عربی نظم و نثر کی تاریخ (معارف، دسمبر ۱۹۴۹ء و جنوری فروری ۱۹۵۰ء) وغیرہ۔

ان تاریخی مقالات کے علاوہ دارالمصنفین کی شائع کردہ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے" میں ان کے پانچ تاریخی مقالات شامل ہیں۔ پہلے مقالہ میں ہندوستان کے فرمانرواؤں کے عہد میں رفاہ عام کے جو کام ہوئے ان کی تاریخ لکھی ہے دوسرے مقالہ میں اس عہد کے نئے شہر، قصبے اور گاؤں کی تاریخ ہے۔ تیسرے مقالہ میں باغات کی تاریخ اور چوتھے مقالہ میں ترقی حیوانات کا ذکر ہے اور پانچویں مقالہ میں تعلیم کی ترقی کے عنوان سے مسلمانوں کے عہد کے مدارس و مکاتب کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

اردو میں تذکرہ و سوانح نگاری بھی فن تاریخ کی ایک شاخ ہے اس لیے اگر مولانا کے وہ مقالات جس میں انھوں نے، صحابہؓ و تابعین، علماو فضلا، محدثین و مہندسین، مورخین اور بزرگان دین کے حالات و سوانح لکھے ہیں شامل کر لیا جائے تو ان کی تاریخ نویسی کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ کے مستند مآخذ و مراجع کے حوالہ سے لکھا ہے اور اصول تاریخ کے مطابق لکھا ہے۔ غرض یہ کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی دوسرے علوم کے ساتھ فن تاریخ کی بڑی خدمت کی اور ان کا شمار دارالمصنفین کے زمرہ مورخین میں اہمیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مولانا سید ابو ظفر ندوی

مولانا سید ابو ظفر ندوی علامہ شبلی کے شاگرد، ندوۃ العلماء کے نامور فرزند اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بھتیجے تھے۔ علمی دنیا میں ان کی شہرت مایہ ناز مورخ کی حیثیت سے ہے۔ تاریخ ان کا خاص موضوع ہے اور وہ مدۃ العمر اسی میدان کے شہسوار رہے اور ایک درجن سے زاید کتابیں تصنیف کیں۔

انھیں گجرات کی تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس کے ماہر خصوصی اس لیے بھی تسلیم کیے گئے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی اسی دیار میں گذرا اور بقول سید صباح الدین عبدالرحمن وہ اپنی عمر کے آخری لمحے تک گجرات کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تدقیق کرتے رہے۔(۱)

مختصر حالات زندگی

مولانا سید ابو ظفر ندوی ۳ر ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ مطابق مارچ ۱۸۸۹ء میں دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سید ابو حبیب صاحب سے حاصل کی جو دیگر علوم کے ساتھ فن طب کے ماہر اور صاحب تصوف و سلوک تھے۔ بارہ سال کی عمر میں ندوۃ العلماء آئے اور ۱۹۱۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا شبلی متکلم ندوی اور مولانا عبدالباری فلسفی ندوی ان کے ہم جماعت تھے۔ یہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ تحصیل علم کے بعد ملتان کے ایک مدرسہ میں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ وہاں سے ۱۹۱۵ء میں رنگون برما چلے گئے جہاں سے

۱- گجرات کی تمدنی تاریخ۔ حالات مصنف ص ۶۔

بقول صباح الدین صاحب پوری دنیا کی سیاحت کا ارادہ رکھتے تھے (۱)۔ مگر یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور وہ ۱۹۲۲ء میں احمد آباد آئے اور گاندھی جی کے قائم کردہ مہاودیالے (महाविद्यालय) میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور قومی یونیورسٹی کے سینٹ اور ممبر بھی نامزد کیے گئے۔ یہاں سے کچھ دنوں کے بعد جمالیہ کالج کے پرنسپل ہو کر مدراس چلے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین میں تاریخ ہند کے منصوبہ کی تدوین و تکمیل کے لیے اعظم گڑھ بلا لیا۔ دارالمصنفین میں پانچ چھ برس رہ کر انھوں نے تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند اور تاریخ خاندان غزنہ جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔

۱۹۳۹ء میں دارالمصنفین سے رابندر ناتھ کے شانتی نکیتن میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد ودیا سبھا (विद्या सभा) احمد آباد نے ان کی خدمات حاصل کر لیں جہاں وہ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیتے رہے۔ ۲۸ر مئی ۱۹۵۸ء میں اپنے وطن دیسنہ میں وفات پائی۔

سیاست

مولانا سید ابو ظفر ندوی کو تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے ساتھ عملی سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

> "وہ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کے بڑے سرگرم رکن تھے اور اسی وجہ سے آخر عمر تک ان کے سیاسی خیالات وہی رہے جو قوم پرور مسلمانوں کے تھے"۔ (۲)

تصنیف و تالیف

مولانا سید ابو ظفر ندوی اگرچہ مدۃ العمر پیشہ درس و تدریس سے وابستہ رہے لیکن یہ ان کا اصل میدان نہ تھا بلکہ وہ اصلاً تحقیق و تصنیف کے میدان کے شہسوار تھے۔ تاریخ ان کا محبوب موضوع تھا، ایک درجن سے زیادہ تاریخی کتابیں لکھیں، یہ کتابیں حد درجہ معیاری اور بلند پایہ ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ مرحوم نے اپنے تدریسی مصروفیات کے باوجود یہ تحقیقی اور تاریخی کارنامے کس طرح انجام دیئے۔

۱- گجرات کی تمدنی تاریخ۔ حالات مصنف ص ۴۔ ۲- ایضاً ص ۵۔

یہاں ان کی تاریخی تصانیف اور مقالات کا تعارف ان کی خصوصیات اور پھر قدر و قیمت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تاریخ گجرات

گجرات کے زمانہ قیام میں گجرات کے محکمہ آثار قدیمہ نے گجرات کی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے یہ کام بڑی سرگرمی اور مستعدی سے شروع کیا اس کے تمام مآخذ دیکھ ڈالے اور اس کے لیے ہندوستان کے علاوہ عرب شام اور قسطنطنیہ کے بعض مصنفین اور اہل علم سے بھی خط و کتابت کی(۱) اور کئی سال کی مسلسل محنت اور تلاش و تفحص کے بعد گجرات کی مفصل تاریخ لکھی۔ محکمہ آثار قدیمہ اپنی مالی دشواریوں کے سبب اسے شائع نہ کر سکا بالآخر ۱۹۵۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے ان کی وفات کے بعد یہ کتاب شائع کی۔

یہ چار ابواب پر مشتمل ہے شروع میں ایک طویل اور مبسوط مقدمہ ہے جس میں گجرات کے جغرافیائی حالات، اس کے حدود اربعہ، طول و عرض، سواحل، راستے، جزیرے، پہاڑ، دریا، جھیلیں، صحرا، آب و ہوا، صحت افزاء مقامات، پیداوار، پھل، غلہ، حیوانات، معدنیات، صنعت و حرفت، کپڑا، کاغذات، تجارت، سلسلہ آمد و رفت، ڈاک، ریلوے لائن وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔ نیز گجرات کی قوموں اور زبانوں کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ گجراتی زبان کے قواعد اس کی شاعری اور شعراء کے حالات بھی قلمبند کیے گئے ہیں۔ پھر گجرات کے تمام اضلاع کی آبادی، ان کا مذہب اور طرز معاشرت کا بیان ہے۔ یہ تمام تفصیلات عہد وار بیان کی گئی ہیں اس مقدمہ سے گجرات کی تمدنی تاریخ کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں شروع میں آرین راج کی تاریخ اور ماقبل اسلام کے جادو بنسی موریہ، ترّی کوٹک، گوجر، مہر، چالوکیہ، ولبھی راج، راشٹ کوٹ، گجراتی راشٹ کوٹ، جاڑوا، سولنگی، باگھیلا خاندانوں کے تمام حکمرانوں کے مختصر حالات اور ان کے عہد کی سیاسی تاریخ لکھی ہے۔ دوسرے باب میں عرب و ہند کے قدیم تعلقات اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سکونت اور تجارت کی تاریخ ہے۔

تیسرے باب میں پہلے محمود غزنوی کے حالات و فتوحات کے ذکر کے علاوہ غوری خاندان اور قطب الدین ایبک کے حالات اور اس کے عہد کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ ضمناً غیاث

۱۔ تاریخ گجرات ص ا۔

الدین بلبن کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

چوتھے اور آخری باب میں علاء الدین خلجی کے عہد کے گجرات کی تاریخ ہے۔ اس کے گورنروں اور ناظموں کے حالات و کارناموں کا بھی مختصر تذکرہ ہے، قطب الدین مبارک شاہ کے عہد کا سیاسی احوال قلمبند کیا گیا ہے، نیز خسرو خاں ناظم گجرات اور اس کے بعد خاندان تغلق کے عہد کے گجرات کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح سلسلہ وار محمد شرف الملک الپ خاں والئی گجرات، ملک نجبا، شیخ معزالدین، نظام الدین جونا بہادر ترک ناظمین گجرات کے دور نظامت و حکمرانی کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ آخر میں سلطان محمد تغلق کے بعض حالات ہیں نیز سلطان فیروز شاہ تغلق، ظفر خاں ناظم گجرات، دریا خاں ناظم گجرات، شمس الدین دامغانی ناظم گجرات، ملک مفرح سلطانی ناظم گجرات، ملک یعقوب سکندر خاں ناظم گجرات، تغلق شاہ، ابو بکر بن ظفر خاں، ناصر الدین محمد شاہ، ظفر خاں ناظم گجرات، سکندر شاہ تغلق، سلطان ناصر الدین محمود تغلق کے حالات اور ان کے عہد حکمرانی و فرمانروائی کے گجرات کی سیاسی تاریخ لکھی گئی ہے۔

اس طرح اس میں کرشن مہاراج کے عہد سے محمود تغلق شاہ اور ظفر خاں آخری ناظم گجرات تک کے تاریخی حالات آ گئے ہیں۔ گجرات کی اس قدر طویل تاریخ اب تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی ہے یہ مولانا کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

یہ کتاب تاریخ گجرات کی پہلی جلد ہے اس کی دوسری و تیسری جلدیں بھی مصنف کے پیش نظر تھیں۔ دوسری جلد تو مکمل ہو گئی تھی جس میں شاہان گجرات کا حال لکھا گیا تھا مگر وہ شائع نہ ہو سکی اور معلوم نہیں اس کا مسودہ اب کس حال میں ہے۔ البتہ تیسری جلد جس میں سلطنت مغلیہ، مرہٹہ اور برطانوی عہد کے گجرات کی تاریخ لکھی جانی تھی مکمل نہ ہو سکی۔ (۱)

تاریخ اولیائے گجرات

گجرات ہی کے زمانہ قیام میں انھوں نے حاجی بدرالدین حسین نظامی تاجر کتب احمد آباد کی فرمائش پر ایک اہم فارسی کتاب مرآۃ احمدی کا اردو ترجمہ کیا جسے حاجی صاحب موصوف نے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ اس میں احمد آباد، گجرات کے اولیاء و صوفیاء و مشائخ کے حالات و سوانح خدمات اور کارناموں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

۱- تاریخ گجرات دیباچہ ص ۱-۲۔

مختصر تاریخ گجرات

اس میں گجرات کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے جو ہندو مسلمان دونوں ادوار کے راجاؤں اور سلاطین کے سیاسی تاریخ اور کسی قدر برٹش گورنمنٹ کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ابتدائی درجات کے طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس سے پہلے اردو میں اس انداز کی کوئی دوسری کتاب موجود نہیں تھی۔ گجرات کے اسکولوں میں گجراتی میں جو کتابیں رائج تھیں وہ غیر معیاری تھیں اس ضرورت کے تحت مولانا نے یہ کتاب مرتب کی۔

تاریخ بوہرہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے کہ احمد آباد اور جوناگڑھ کے زمانہ قیام میں مولانا ابو ظفر ندوی کو بوہروں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ بوہروں کے بعض اکابر کی فرمائش پر اس فرقہ کی ایک تاریخ لکھی۔ لیکن جب وہ شائع ہوئی تو بعض حلقوں میں اس کے چند مشمولات پر اعتراض ہوا جس کی وجہ سے اس کی اشاعت روک دی گئی۔(۱)

مختصر تاریخ ہند

ہندوستان کی یہ مختصر تاریخ مدرسوں کے طالب علموں اور چھوٹے بچوں کے لیے آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی اس کتاب کے متعلق مولانا سید ابو ظفر ندوی لکھتے ہیں:

> "افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کے لیے ہندوستان کی تاریخ اس لب ولہجہ میں لکھی جاتی ہے کہ جن کو پڑھ کر اس ملک کے رہنے والوں کے باہم تعلقات نہایت خراب ہوتے ہیں بلکہ وہ اس بدقسمت ملک کی بدامنی کا سبب ہیں۔
>
> ہندوستان کی یہ مختصر تاریخ اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ ہمارے ملک کے بچے اپنے وطن کی پچھلی تاریخ اس طرح پڑھیں کہ انھیں معلوم ہو کہ اس ملک کے بنانے میں دنیا کی کن کن قوموں نے حصہ لیا ہے۔(۲)

اس میں جغرافیائی حالات کے بعد قدیم ہندوستان کی قوموں اور اس زمانہ کی اہم ریاستوں جین، مگدھ سلطنت، نند خاندان کی حکومت موریہ، گپت، سفید ھن، ہرش،

۱۔ گجرات کی تمدنی تاریخ۔ حالات مصنف ص ۶۔ ۲۔ دیباچہ مختصر تاریخ ہند۔

راجپوت اور گوجروں وغیرہ کا اختصار سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سلسلہ وار عرب و ہند کے تعلقات، سندھ میں عربوں کی حکومت، غزنوی خاندان کے سلاطین، غوری، غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغلوں میں بابر و ہمایوں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں سوری خاندان، بنگال، جونپور، ملتان، کشمیر، خاندیش، مالوہ، گجرات کے بادشاہوں کی مختصر تاریخ کے ساتھ بہمنی، نظام شاہی، عادل شاہی، عماد شاہی اور ملیبار و معبر کے بادشاہوں کا بھی حال درج کیا گیا ہے۔ آخر میں متحدہ اسلامی سلطنت کے نام سے سلطنت مغلیہ کے سلاطین (ہمایوں سے بہادر شاہ ظفر تک) کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ضمنی طور پر سکھوں، مرہٹوں اور ریاست میسور کی بھی مختصر تاریخ آگئی ہے۔ اس طرح اس میں صرف دہلی کے حکمرانوں کا ہی ذکر نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی تاریخ کا ایک جامع مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اس نصابی کتاب میں بھی اسی طرز نگارش و تحقیق کا تتبع کیا گیا ہے جس کے لیے دبستان شبلی ممتاز ہے اور جس کے امتیازات کو ہم بار بار دہراتے رہے ہیں۔

دارالمصنفین سے شائع ہونے والی اس کتاب کے اب تک دسیوں ایڈیشن نکل کر مقبول ہو چکے ہیں حال میں جدید کمپیوٹر ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔

تاریخ سندھ اوّل و دوم

مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ ہند کی تدوین کا جو منصوبہ بنایا تھا اس سلسلہ کی تاریخ سندھ پہلی جلد ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے اس میں سندھ کی ایک ہزار سال سے زیادہ کی سیاسی، علمی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

اس کے گرانقدر مقدمہ میں سندھ کی وجہ تسمیہ، حدود اربعہ، جدید و قدیم طول و عرض، قدیم و جدید آبادی، دریا، ندی، جھیل، چشمے، جزیرے، بندرگاہیں، پہاڑ، پیداوار، حیوانات، معدنیات اور سندھ کی قوموں اور زبانوں وغیرہ کا مفصل ذکر آگیا ہے۔ اس کے بعد سندھ میں ماقبل اسلام ہندو حکومتوں کے آخری زمانہ کی تاریخ ہے۔ بعد ازاں اسلامی عہد کی مفصل سیاسی تاریخ میں ہباری، اسماعیلی، سومرہ خاندانوں کے فرمانرواؤں اور ان کے عہد حکمرانی کے مفصل واقعات لکھے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ سندھ کی تہذیبی و تمدنی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس عہد کے علما و شعراء و

دیگر ارباب کمال کے حالات اور اصلاحات ورفاہ عام کے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس طرح تاریخ سندھ کے دونوں حصوں میں خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ اور حکومت بنی عباس کے زیر انتظام حکمرانوں اور پھر خود مختار اسلامی حکومتوں کی مفصل سیاسی، علمی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ آگئی ہے۔سندھ کی اس قدر مبسوط اور مفصل تاریخ بلاشبہ مولانا سید ابو ظفر ندوی کا اہم تصنیفی کارنامہ ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اردو میں سندھ کی پہلی مفصل مستند اور مستقل تاریخ ہے(۱)۔اس مبسوط کتاب میں سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ کے عین مطابق ہے۔

تاریخ خاندان غزنہ

مولانا سید ابو ظفر ندوی نے دارالمصنفین کے زمانہ قیام میں یہ کتاب لکھی تھی مگر شائع نہ ہو سکی۔اب ہم صرف اس کے نام سے واقف ہیں۔

گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں

۱۹۵۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سید محمود کے مشورے سے دارالمصنفین میں تاریخ ہند کی تدوین کا ایک پنج سالہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا اس میں گجرات کی تمدنی تاریخ بھی شامل تھی۔تاریخ گجرات کے ماہر خصوصی ہونے کی وجہ سے اس کام کے لیے مولانا سید ابو ظفر ندوی کی طرف نظر گئی اور انھوں نے اس کام کو قبول کیا اور مکمل کر کے دارالمصنفین کے حوالہ کیا۔لیکن افسوس کہ یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی بعد میں ۱۹۶۲ء میں دارالمصنفین نے اسے شائع کیا اس میں فاضل مورخ نے مختلف مراجع سے گجرات کی تمدنی تاریخ مرتب کردی ہے یہ ان کا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔

گجرات کا اسلامی عہد حکومت نہایت شاندار رہا ہے جس کے سایہ میں گجرات نے علمی، تہذیبی اور تمدنی ہر لحاظ سے بڑی ترقی کی اس کتاب میں اسی روشن باب کی تفصیل ہے۔

اوّلاً گجرات میں مسلمانوں کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔پھر ڈاک کے نظام، صنعت وحرفت میں ترقی، رفاہ عام کے کام، مختلف قسم کی تعمیرات اور گجرات میں اس کے آثار، فنون لطیفہ اور گجراتیوں کے عام حالات زندگی اور ان کی خصوصیات غرض

۱۔ مقدمہ تاریخ سندھ ص ۱۴۔

تہذیب و تمدن کے ہر پہلو کو تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔ مدارس و مکاتب اور کتب خانوں کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی علمی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سلاطین گجرات کے توپ خانوں، بحری بیڑوں، بندرگاہوں، جہازوں، جہاز رانوں اور بحری تصانیف کا حال بھی شرح وبسط سے کیا گیا ہے۔ آخر میں مآخذ کی فہرست ہے۔ اس طرح گجرات کی مفصل تمدنی تاریخ اس میں آگئی ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ:

> "اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کا ایک اہم رُخ سامنے آجائے گا جو عام نگاہوں سے اب تک مستور تھا"۔(۱)

تاریخی مقالات

مذکورہ بالا معرکتہ الآرا کتابوں کے علاوہ مولانا سید ابو ظفر ندوی نے تاریخ ہند کے مختلف گوشوں پر مقالات بھی لکھے جو اپنے اپنے موضوع پر خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مقالات معارف، اعظم گڑھ اور شہاب، جونا گڑھ کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ شہاب کی فائلیں دستیاب نہ ہو سکیں البتہ معارف میں مندرجہ ذیل مقالات شائع ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں کاغذ سازی کی تاریخ (۵۴/۱)(۲)۔ سلاطین غزنہ کے ہندوستانی حکام (۴۱/۲) شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی (۳۱/ ۲-۳) ہندوستان میں توپ کی تاریخ (۶۴/ ۲، ۶۵/ ۱-۳) گجرات کا بحری بیڑہ (۶۸ /۱-۳) گجراتی بادشاہوں کے سکّے (۷۵ /۱) تاریخ گجرات کا ایک ورق (۳۰/۱-۲) گجرات کا پہلا گورنر اسلامی عہد میں (۱۹/ ۴-۵) ہندوستان کے کتب خانے وغیرہ۔

مذکورہ بالا تاریخی تصانیف اور مقالات کے تعارف و تجزیہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا سید ابو ظفر ندوی نے تاریخ کی بڑی خدمت انجام دی اور یہی ان کی علمی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا ابوالحسنات ندوی

مولانا ابوالحسنات عبدالشکور ندوی مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فیض یافتہ تھے۔ دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں اس سے وابستہ ہوئے اور

۱- دیباچہ گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۲۔ ۲- ۵۴/ ۱ سے مراد معارف جلد ۵۴ شمارہ ۱ ہے۔

تقریباً چھ برس تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کی۔ اس اثنا میں ان کے قلم سے بیسیوں اہم علمی مضامین نکلے جو ماہنامہ معارف اور بعض دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی تصنیف تھی یہاں ان کے حالات و خدمات کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا ابوالحسنات ندوی ۱۸۹۰ء میں اشرف پور ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں بقول مولانا سید سلیمان ندوی "اسلامی سیاسی جوش کی کشش نے ان کو ہلال کلکتہ تک پہنچادیا"۔ یہیں سید صاحب نے جوہر قابل پاکر ان کی تعلیم و تربیت شروع کی اور اپنے قیام کلکتہ کے پورے عرصہ میں ان پر توجہ کرتے رہے۔ جب سید صاحب نے کلکتہ کو خیر باد کہا تو مولوی ابوالحسنات کو ندوہ بھیج دیا جہاں انھوں نے مزید تعلیم حاصل کی۔ وہ ندوہ میں ۱۹۱۶ء تک رہے، ۱۹۱۸ء میں سید صاحب نے دارالمصنفین بلا لیا۔ دارالمصنفین کے لیے ان پر نظر انتخاب اس لیے بھی پڑی کہ خود علامہ شبلی ان کو دارالمصنفین کے لائق سمجھتے تھے۔ یہاں انھوں نے مسئلہ خلافت پر معارف کے لیے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا اسے بڑے شوق سے پڑھا گیا۔ اس کے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں:

> "جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکوں کی مدافعت میں ہندوستانی زبان میں سب سے پہلا مضمون انھی کا نکلا جو اس وقت بہت پسند کیا گیا اور لوگوں نے اس کو علیحدہ چھاپ کر شائع کیا"۔(۱)

یہ مضامین گو اس وقت ملک کے ایک وقتی اور ہنگامی مسئلہ کے پیش نظر لکھے گئے تھے مگر آج ہندوستان کی تحریک خلافت کی تاریخ پر کام کرنے والے اسکالر اور محقق اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

مولانا کو شعر و سخن کا بھی بڑا پاکیزہ اور معیاری ذوق تھا۔ وہ خود اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی پر قادر تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی خدمت میں چند فارسی قصائد بھیجے تھے جن کو دیکھ کر علامہ نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تعریف و تحسین کی تھی(۲)۔ مولانا

۱- ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، تصنیف اور مصنف ص ۳۔
۲- مکاتیب شبلی بنام مولانا مسعود علی ندوی مکتوب نمبر ۲۵۔

سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

"انھوں نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ فارسی کے ساتھ خاص ذوق تھا اور ان کی فارسی و اردو غزلیں، قصائد اور ترکیب بند عرصہ تک پڑھنے والوں کو گرم رکھیں گے"۔(۱)

ان کا یہ کلام معارف کی فائلوں میں محفوظ ہے۔

دارالمصنفین میں ان کے ذمہ ایک اہم کام رقعات عالمگیری کی ترتیب و تدوین کا سپرد کیا گیا تھا مگر افسوس کہ ابھی یہ کام شروع بھی نہ ہو پایا تھا کہ ۱۲/ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ مطابق نومبر ۱۹۲۴ء کو عین شباب کے عالم میں انتقال کیا۔

تحریریں

مولانا ابوالحسنات ندوی نے مختصر زندگی پائی اس لیے ان کے تحریری کاموں کی فہرست بھی مختصر ہے۔ چند مضامین معارف اور دو کتابیں ان کا تحریری ورثہ ہیں۔ لیکن ان کی صرف ایک کتاب "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" نے ان کو وہ شہرت دی جو اکثر کثیر التصانیف مصنفوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہاں ان کی اسی تصنیف "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کی مورخانہ کاوش و کوشش کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

اس عنوان سے انھوں نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں ایک خطبہ دیا تھا جس کے اضافہ و تکمیل کے زمانہ میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ سید صاحب نے اسے پہلے معارف میں اگست تا دسمبر ۱۹۳۸ء میں قسط وار شائع کیا بعد ازاں دارالمصنفین نے ۱۹۷۱ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔

اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی اسلامی درسگاہوں کی تاریخ مستند مآخذ اور بڑی محنت اور تلاش و تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

۱-یادرفتگاں ص ۵۴۔

مقدمہ میں تصنیف کے دشوار گذار مراحل اور کامیابی کا ذکر ہے۔ سید صاحب کے قلم سے مصنف کا تعارف بھی کتاب میں شامل ہے۔ شروع میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ ہے اس کے بعد اجمیر، دہلی، پنجاب، آگرہ، اودھ، بہار، بنگال، دکن، مالوہ، ملتان، کشمیر، گجرات اور سورت کے مدارس کی تاریخ اس تفصیل سے بیان کی گئی ہے کہ ان کے بانیوں، مدارس کے نام، ان کی عمارتیں، جائے وقوع اور ان مدارس کے اساتذہ اور تعلیم و تربیت کا سیر حاصل ذکر آگیا ہے۔

چونکہ پہلے مساجد اور خانقاہیں تعلیم وتربیت کے مراکز بھی ہوا کرتی تھیں اس لیے بعض مساجد اور خانقاہوں کے نظام تعلیم وتربیت کا ذکر بھی اس کتاب میں آگیا ہے۔

آخر میں ان مدارس کے علاوہ اشاعت تعلیم کے دیگر ذرائع مثلاً شخصی تعلیم، علماء کی آمد اور اشاعت تعلیم وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ پھر عربی کے قدیم نصاب درس کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی خوبیوں کے ساتھ ان کے نقائص کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ عربی نصاب تعلیم کی مختلف موضوعات کی کتابیں اور ان کے نظام تعلیم اور طریقہ درس و تدریس کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

فارسی زبان اور اس کے علوم وفنون کی تعلیم اور فارسی کے بعض ہندو مسلم شعراء کا مختصر تذکرہ بھی اس میں آگیا ہے۔ آخر میں فارسی زبان وعلوم فارسی کی اشاعت کے اسباب، طریقہ تعلیم اور فارسی نصاب درس کا مفصل ذکر بھی ہے۔

آج اس موضوع پر متعدد اہم تحقیقی مقالات اور کتابیں وجود میں آچکی ہیں لیکن جب یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ اس سے مصنف کی محنت و تحقیق اور عربی وفارسی تاریخ و تذکرہ کی مستند و معتبر کتابوں سے ریزہ ریزہ جمع کرنے کی صلاحیت کی خوبی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالحسنات ندوی کی یہ اگرچہ واحد تصنیف ہے لیکن اردو ادب کی علمی تاریخ میں اس کے ذریعہ ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مولانا حاجی معین الدین ندوی

مولانا حاجی معین الدین ندوی بھی دارالمصنفین کے ابتدائی رفقاء میں سے ہیں۔ وہ

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے بعد ہی ۱۹۱۴ء میں دارالمصنفین آئے اور کئی سال تحقیق و تصنیف میں مصروف رہے۔ خلفائے راشدین اور مہاجرین اول جیسی اہم اور معرکۃ الآرا کتابیں ان ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

مختصر حالات زندگی

مولانا حاجی معین الدین ندوی ۱۸۹۱ء میں گیلانی یا استھانواں (بہار) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کے تمام مراحل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں طے کیے ۱۹۱۲ء میں فراغت حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں فریضہ حج سے مشرف ہوئے اسی سے حاجی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

۱۹۱۴ء کے آخر میں دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور اس کے رفیق بنائے گئے۔ خلفائے راشدین اور مہاجرین لکھی۔ یہاں سے کتب خانہ ندوہ کی ترتیب کے لیے لکھنؤ گئے کچھ ہی دنوں بعد امپیریل لائبریری کلکتہ چلے گئے۔ وہاں عربی کتابوں کی انگریزی فہرست کئی جلدوں میں مرتب کی جو حکومت کی طرف سے شائع ہوئی۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد نے بھی ان کی خدمات مستعار لیں وہاں انھوں نے قدیم ہندوستانی تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں مرتب کیا جسے دائرۃ المعارف نے شائع کیا۔ اس کے بعد سرکاری لائبریری رامپور نے بھی ان کی خدمات حاصل کرلیں آخر میں وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور یہیں ۵؍ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

حاجی صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ خلفائے راشدین اور مہاجرین کی تصنیف و ترتیب ہے۔ یہاں انھیں دونوں کتابوں کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جس سے حاجی صاحب کی محنت و کاوش اور تحقیق و تالیف کا اندازہ ہو سکے۔

خلفائے راشدین

دارالمصنفین نے سیرت نبویؐ کے ساتھ سیر الصحابہؓ کی تسوید و ترتیب کا جو اہم منصوبہ بنایا تھا یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علیؓ کے ذاتی حالات، سوانح زندگی اور ان کے اخلاق و فضائل و کمالات اور ان کے مذہبی، سیاسی، انتظامی، علمی اور دینی خدمات اور ملکی

فتوحات کی پوری تفصیل آگئی ہے جس سے اس عہد زریں کی بیشتر سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور مذہبی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "یہ کتاب اس طرح لکھی گئی ہے کہ ان کے (خلفائے راشدینؓ) ذاتی حالات و سوانح کے ساتھ ساتھ عہد خلافت راشدہ کی ۳۲ برسوں کی پوری تاریخ ان اوراق میں سمٹ گئی ہے"۔(۱)

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ معتبر و مستند تاریخی کتابوں سے لیا گیا ہے اور رطب ویابس روایت اور واقعات اس میں درج نہیں کیے گئے ہیں۔ اردو زبان میں خلفائے راشدین اور اس عہد زریں کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں مگر اس کتاب کو جو حسن قبول حاصل ہوا وہ بے مثال ہے۔

مہاجرین اوّل

یہ کتاب سلسلہ سیر الصحابہؓ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرات عشرہ مبشرہ اور قریش بنو ہاشم کے ان صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح، اخلاق و فضائل اور ان کے علمی، دینی، سیاسی، تمدنی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے ایک مبسوط اور پُر مغز مقدمہ بھی ہے جس میں قریش کی مفصل تاریخ لکھی گئی ہے۔ اس میں قبل از اسلام مہاجرین کے خانوادوں کا ذکر ہے پھر آل عدنان کی معرکہ آرائیوں اور قریش کے مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ بعد ازاں قریش کی جنگی، سیاسی اور تمدنی تاریخ لکھی گئی ہے پھر ہجرت کے واقعات اور اس کی تاریخ ہے۔ آخر میں مہاجرین کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔

یہ دونوں کتابیں تاریخ کے مستند و معتبر حوالوں سے مزین ہیں اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بڑی تحقیق و تفتیش اور چھان پھٹک کے بعد لکھا گیا ہے۔ سیرت نبویؐ کے بعد سلسلہ سیر الصحابہؓ کے یہ اہم حصے ہیں اب تک ان دونوں کتابوں کے متعدد ایڈیشن نکل کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں کی وجہ سے اسلامی تاریخ کی خدمت کرنے والوں میں حاجی معین الدین ندوی کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

۱۔ شذرات، معارف ستمبر ۱۹۲۷ء، ص ۱۶۴۔

مولانا سعید انصاری

دارالمصنفین کے مشہور سلسلہ تاریخ اسلام کے حصہ سیر الصحابہؓ کی تدوین و تکمیل میں جن رفقاء نے حصہ لیا ان میں ایک اہم نام مولانا سعید انصاری کا بھی ہے۔ سیر الصحابہؓ دو جلدوں میں اور سیر الصحابیاتؓ ایک جلد، ان کے قلم سے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا سعید انصاری ۱۶ر فروری ۱۸۹۴ء میں محلہ خیلدار ضلع فتحپوری ہسوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب موضع یلین پور کے انصاری خاندان سے ملتا ہے جنھیں اکبر کے زمانہ سے آخری شاہان مغلیہ تک برابر خطابت کا عہدہ ملتا رہا۔(۱)

سعید انصاری صاحب ۱۹۰۲ء میں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تعلیم کے لیے داخل ہوئے ۱۹۱۱ء میں فراغت حاصل کی پھر مدرسہ الٰہیات میں داخل ہوئے اور مزید تعلیم حاصل کی۔ دارالمصنفین کے ابتدائی دور (۱۹۱۵ء) میں اس سے بحیثیت رفیق وابستہ ہوئے اور ایک وقفہ کے ساتھ کئی سال تک اس ادارہ میں علم و فن کی خدمت کی۔

۱۹۳۷ء میں کچھ دنوں کے لیے وہ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد چلے گئے تھے جہاں رسالہ ہندوستانی کے مدیر بنائے گئے پھر مختلف اسکولوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ کئی سال جامعہ ملیہ میں بھی مدرس رہے۔ آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کا تقرر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے شعبہ اردو میں کرادیا۔ وہاں انھوں نے اس کی تدوین میں نمایاں حصہ لیا۔ ۴/ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

سعید انصاری شعر و شاعری اور اردو زبان و ادب کا بڑا ستھرا اور عمدہ مذاق رکھتے تھے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں داد سخن دیتے تھے۔ ان کے اردو کلام کا انتخاب جمالیاتی شاعری کے نام سے اصغر گونڈوی نے کیا تھا جو ان کے الٰہ آباد کے زمانہ قیام کی یادگار ہے۔ فارسی غزلوں کا مجموعہ بھی ۱۹۶۲ء کے بعد لاہور سے شائع ہوا ہے۔ انھیں عربی زبان پر بھی بڑا عبور حاصل تھا ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر کے اقتباسات جو مختلف کتابوں میں تھے انھیں انتہائی محنت

۱- سید محمد قادری ارباب نثر اردو ص ۱۳۹۔

سے جمع کیا جسے دارالمصنفین نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ان کی عربی نثر کو مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ بہت پسند کرتے تھے اور اسی بنا پر انھیں عربک لٹریری ایسوسی ایشن آف لندن کا ۱۹۱۷ء میں ممبر منتخب کیا گیا۔

سعید انصاری صاحب نیک اور فرشتہ خصلت آدمی تھے مگر استقلال نہ تھا اس لیے کہیں جم کر نہ رہ سکے اور اسی بنا پر ان کی صلاحیتوں کا کامل مظاہرہ نہ ہو سکا۔

سعید انصاری صاحب کا اصل میدان تاریخ تھا۔ انھیں تصنیف و تالیف کا بہت اچھا سلیقہ تھا ان کی مندرجہ ذیل قلمی یادگاریں ہیں۔

۱- مختصر تاریخ اسلام ۲- فلسفہ اسلام کی تاریخ ۳- اسلامی جغرافیہ ۴- سیر الانصارؓ (دو جلدیں) ۵- سیر الصحابیاتؓ ۶- سیر الصحابہؓ

پہلی تینوں کتابیں شائع نہ ہو سکیں۔ سیر انصارؓ اور سیر الصحابیاتؓ دارالمصنفین کے زمانہ قیام کی یادگار ہیں جو بہرحال تذکرہ ہیں تاریخ نہیں۔

ان کتابوں اور مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فن تاریخ پر ان کی نظر بڑی عمیق تھی جیسا کہ سیر الصحابہؓ کے مقدمہ سے بھی ظاہر ہے جس میں انھوں نے تاریخ کے اہم اصولوں، روایت و درایت اور رجال وغیرہ پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔

تذکرہ و سوانح کی کتابوں کا ماخذ اصلاً تاریخ کی کتابیں ہوتی ہیں اس لحاظ سے بھی ان کی نظر دقیقہ سنج اور دوررس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیر الانصارؓ کی دونوں جلدوں اور سیر الصحابہؓ و صحابیات میں بھی اس عہد کی اجمالی تاریخ بڑے سلیقہ سے پیش کی گئی ہے جو مصنف کے گہرے تاریخی شعور کی عکاسی کرتی ہے اور اسی بنا پر ہم نے ان کا شمار بھی دارالمصنفین کے مورخین میں کیا ہے۔

سید نجیب اشرف ندوی

سید نجیب اشرف ندوی کا شمار دارالمصنفین کے اہم تاریخ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ تقریباً دس برس دارالمصنفین سے بحیثیت رفیق وابستہ رہے اور اس عرصہ میں ان کا خاص موضوع تحقیق اورنگزیب عالمگیر اور ان کا عہد رہا۔ انھوں نے اورنگزیب عالمگیر کے رقعات جمع کر کے اس پر ایک گرانقدر مقدمہ لکھا جو مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری

کی اصل کتاب سے زیادہ مشہور ہوا۔ صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ یہ مقدمہ نہ صرف ان کی زندگی کا بلکہ دار المصنفین اور تاریخ وادب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔(۱)

رقعات عالمگیر اور مقدمہ رقعات عالمگیر کے علاوہ انھوں نے متعدد علمی و تحقیقی مقالات بھی سپرد قلم کیے جو تاریخی لحاظ سے بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ یہاں پہلے ان کی زندگی کے مختصر حالات پھر ان کے تاریخی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

حالات زندگی

سید نجیب اشرف ندوی یکم نومبر ۱۹۰۰ء کو موضع آر موی ضلع چاندہ مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن دیسنہ بہار تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سید محمد مبین سے حاصل کی۔ ۱۹۰۹ء میں سید صاحب کی خواہش پر ندوہ آئے ۱۹۱۳ء تک ابتدائی درجات میں تعلیم حاصل کی اور یہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔(۲)

ندوہ سے علامہ شبلی کے مستعفی ہو جانے کے بعد اور لوگوں کے ساتھ انھوں نے بھی ندوہ کو خیر باد کہہ کر پٹنہ کا رخ کیا جہاں سے ۱۹۱۷ء میں میٹرک اور ۱۹۱۹ء میں انٹر میڈیٹ درجہ اول میں پاس کیا۔ یہاں ان کے استاذوں میں مشہور مورخ سر جدوناتھ سرکار بھی شامل تھے۔

اس وقت ملک میں ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ چنانچہ نجیب اشرف صاحب نے قومی جذبہ سے سرشار ہو کر تعلیم چھوڑ دی اور ملک کی سیاسی تحریکوں میں سرگرم ہو گئے۔ اسی زمانہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو دار المصنفین اعظم گڑھ بلا لیا وہ یہاں ۲۱-۱۹۲۰ء میں آئے اور ان کے ذمہ عالمگیر سے متعلق مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا کام سپرد ہوا۔ یہاں تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں ان کو اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھیں(۳)۔ اس زمانہ میں ان کی تقریریں اس قدر باغیانہ اور آتش بار ہوتی تھیں کہ مولانا عبد السلام ندوی کہتے تھے کہ یہ ایک روز ہم لوگوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں گے۔(۴)

دار المصنفین کے زمانہ قیام ہی میں انھیں اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا

۱- بزم رفتگاں حصہ دوم ص ۱۷۸۔
۲- سید ریاست علی ندوی شخصیت اور کارنامے ص ۲۸۔
۳- بزم رفتگاں حصہ دوم ص ۱۷۵۔
۴- ایضاً۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اس کی تائید کی، چنانچہ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ء میں تاریخ سے بی۔ اے آنرز اور ۱۹۲۶ء میں فارسی سے بدرجہ امتیاز ایم۔ اے کیا اور طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں انعام میں پائیں۔

کلکتہ جانے میں تعلیم کے علاوہ ایک خاص دلچسپی یہ بھی تھی کہ وہاں رہ کر اپنے استاذ اور مشہور مورخ سر جدوناتھ سرکار جو اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کے ذاتی کتب خانہ سے استفادہ کریں گے جو عالمگیر اور عہد عالمگیر کے ماہر خصوصی تھے اور اپنے خاص مطمح نظر میں مغل امپائر لکھی تھی اور ان کے ذاتی کتب خانہ میں عہد مغلیہ کی تاریخ خصوصاً عالمگیریات کا بڑا ذخیرہ تھا۔ چنانچہ نجیب صاحب نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔

تکمیل تعلیم کے بعد وہ دارالمصنفین آئے اور عالمگیر کے رقعات کی ترتیب و تدوین کے ساتھ اس پر ایک مبسوط اور گرانقدر مقدمہ لکھا جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ان دونوں کتابوں کے علاوہ انھوں نے تاریخ کے موضوع پر پچاسوں علمی و تاریخی مقالات سپرد قلم کیے جو معارف کی زینت بنے۔ سید صاحب ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے، فرماتے تھے کہ ان کی علمی اٹھان غضب کی ہے۔ کم سنی کے باوجود انھیں معارف کے مرتبین میں شامل کیا انھوں نے معارف کے مستقل کالموں تلخیص و تبصرہ اور اخبار علمیہ کے لیے بقول صباح الدین صاحب آٹھ برس تک بڑے اچھے علمی اور سائنسی معلومات فراہم کیے۔ معارف میں مطبوعات جدیدہ پر تبصرہ بھی انھیں کے ذمہ تھا ان کے تبصرے بڑے تحقیقی ہوا کرتے تھے۔ نیاز فتحپوری کی علمی بددیانتیوں کا پردہ سب سے پہلے انھوں نے ہی معارف میں چاک کیا تھا۔ وہ جب تک دارالمصنفین میں رہے اس کی تمام علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں پوری طرح منہمک رہے۔

۱۹۳۰ء میں وہ دارالمصنفین سے گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے لکچرر ہو کر چلے گئے۔ ایک ہی سال بعد ۱۹۳۱ء میں بمبئی کے اسماعیل یوسف کالج میں اردو کے لکچرر ہو گئے اور پھر پوری زندگی اسی عروس البلاد میں اردو زبان کی خدمت میں گذاری اور یہیں ۵/ دسمبر ۱۹۶۸ء میں انتقال کیا اور ''اندھیری'' قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

بمبئی میں انھوں نے لغات گجری مرتب کی۔ اس میں انھوں نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں گجرات کا حصہ دکھایا ہے اور بقول صباح الدین صاحب اس میں انھوں نے اپنی اسی

تحقیق، تلاش، محنت اور دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے جو انھوں نے رقعات کی ترتیب و تدوین میں دیا تھا۔(۱)

بمبئی میں وہ تاریخ پر کوئی کام نہ کر سکے البتہ یہاں انھوں نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علاوہ متعدد طلبہ سے ریسرچ و تحقیق کرائی۔ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی نمایاں کام انجام دیے۔ اس کے ترجمان نوائے ادب (سہ ماہی) کے وہ برسوں مدیر رہے اس میں سیکڑوں علمی و ادبی مضامین لکھے جو ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیے جاتے رہے۔

نجیب صاحب بڑے اچھے مترجم بھی تھے مندرجہ ذیل ترجمے ان کی یادگار ہیں:

۱- سوراج(۲)، ۲- ممالک غیر میں عدم تعاون(۳)، ۳- رہنمائے صحت(۴)، ۴- تاریخ ادبیات عربی(۵)، ۵- برطانوی ہند کا نظام سیاسی(۶)۔

دارالمصنفین میں وہ جب تک رہے تاریخ کے میدان میں کام کرتے رہے۔ لیکن تعجب ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد اگرچہ وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں مسلسل منہمک رہے لیکن رقعات عالمگیر کی دوسری جلدیں مکمل نہ کر سکے۔ اس کی اصل وجہ کچھ بھی ہو لیکن خود ان کا یہ کہنا دل کو لگتا ہے کہ ان جلدوں کی تکمیل کے لیے علامہ شبلی نعمانی کا مزار نظروں کے سامنے رہنا ضروری ہے۔(۷)

یہاں ان کی کتاب مقدمہ رقعات عالمگیر اور رقعات عالمگیر جلد اول کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی مورخانہ صلاحیتیں کس پایہ کی تھیں اور ان کتابوں کی تصنیف و تالیف میں انھوں نے کس قدر گہرے تاریخی شعور سے کام لیا ہے اور ان کتابوں کی اہمیت و حیثیت کیا ہے۔

مقدمہ رقعات عالمگیر

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں رقعات عالمگیر کی ترتیب و تدوین کا کام مولانا سید سلیمان

۱- بزم رفتگاں حصہ دوم ص ۱۸۹۔ ۲- یہ گاندھی جی کی کتاب (Home Rule) کا اردو ترجمہ ہے۔ ۳- (Non-Co-Operation in other Countries) ۴- یہ بھی گاندھی جی کی کتاب (A Guide to Health) کا ترجمہ ہے۔ ۵- یہ کلیمنٹ ہرٹ کی کتاب (History of Arabic Literature) کا ترجمہ ہے۔ ۶- یہ اے۔ ای۔ ہورنس (Political System of British India, A.E.Horness) کا ترجمہ ہے۔ ۷- بزم رفتگاں حصہ دوم ص ۱۸۶۔

ندوی نے پہلے مولانا ابوالحسنات ندوی کو سپرد کیا تھا۔ان کی وفات کے بعد یہ کام سید صاحب نے سید نجیب اشرف ندوی کے ذمہ کیا چنانچہ انھوں نے دس برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تفحص کے بعد رقعات عالمگیر کی پہلی جلد مرتب کی اور اس پر ایک مبسوط اور جامع مقدمہ سپرد قلم کیا جسے دارالمصنفین نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔زیر نظر کتاب دراصل وہی مقدمہ ہے جو اپنی ضخامت اور مشمولات کے اعتبار سے خود ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس میں پہلے عالمگیر کے مجموعہ رقعات اور خطوط و مراسلات پر فاضلانہ تبصرہ ہے اس کے بعد اسلام میں فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی اجمالی تاریخ، نیز ہندوستان کے صیغہ انشاء کا مفصل حال اور انشاء کے اصول اور خاص عالمگیر کی انشاء پر بحث و تحقیق کی گئی ہے اور عالمگیر کی تاریخ کے مآخذ اور اس کی پیدائش سے لے کر برادرانہ جنگ کے تمام حالات و واقعات پر خود اس کے خطوط ورقعات کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔

اپنے موضوع پر یہ سب سے اہم کتاب ہے۔اس کا اعتراف عالمگیر کی تاریخ کے ماہر خصوصی خود جدوناتھ سرکار نے بھی کیا اور اس کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ:

"اورنگ زیب کی شخصیت اور فن پر یوں تو بہت سے مورخین نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ لیکن نجیب اشرف ندوی کی کتاب مقدمہ رقعات عالمگیر اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے ان سب میں اہم ہے۔اس کے لیے نجیب اشرف ندوی قابل مبارکباد ہیں"۔(۱)

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عالمگیر پر عائد کردہ سارے الزامات و اعتراضات کی عالمگیر کے رقعات کی روشنی میں تردید کی گئی ہے اور مصنف نے عالمگیر کی شخصیت کے گرد و غبار کو صاف کر کے اس کی اصل شخصیت کو پیش کیا ہے۔خاص طور سے عالمگیر کی شہزادگی کے زمانہ کی سرگرمیوں کی تفصیلات جس مورخانہ شعور و آگہی اور ژرف نگاہی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں وہ بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن:

"ہندوستان میں مغلوں کی تاریخ کا ایک بہت ہی قیمتی سرمایہ بن گئی ہیں۔اس میں اس زہر کا تریاق بھی موجود ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے مخالفوں نے اس کے خلاف پھیلانے کی کوشش کی ہے"۔(۲)

۱-ماہنامہ سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۹ء ص ۳۲۔ ۲-نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۱۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان تمام ابواب میں عالمگیر کی ولادت سے لے کر اس کی تخت نشینی تک کے مکمل حالات وواقعات، سیاسی کوائف، برادرانہ معاملات بلکہ ہر طرح کی تفصیلات آگئی ہیں۔ دیگر ماخذوں سے بھی مصنف نے استفادہ کیا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ روایت ودرایت کے اصولوں کے ساتھ استنباط نتائج اور زبردست قوت استقرائی سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب تحقیق وتدقیق کا مثالی نمونہ قرار دی جاتی ہے۔

اس کتاب نے مصنف مرحوم کو ہندوستان خصوصاً عہد مغلیہ کے بڑے مورخین کی صف میں لا کھڑا کیا اور اہل فکر و نظر ان کی مورخانہ بصیرت کے معترف ہوئے۔ مولانا ماہر القادری اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "رقعات عالمگیر کی تدوین وترتیب اور تحقیق کا جو کام انھوں نے انجام دیا وہ ان کا عظیم کارنامہ ہے جس کی بدولت ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا"۔(۱)

یہاں کتاب سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے تاکہ ندوی صاحب کی مورخانہ بصیرت کا اندازہ ہو سکے۔

عالمگیر پر ایک بڑا الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے باپ کے ساتھ بد سلوکی کی، قید کیا اور طرح طرح کی تکالیف سے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ نجیب صاحب نے اس الزام کا مفصل جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ عالمگیر شاہجہاں کا اتنا ہی ادب و احترام کرتا تھا جو ایک مطیع، فرمانبردار اور سعادت مند بیٹا کر سکتا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں دلائل و شواہد پیش کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> "اورنگ زیب نے باپ کے احترام کو جس حد تک قائم رکھا اور جس درجہ تک اس نے شاہجہاں کے مقابل براہ راست اپنے کو پیش کرنے سے گریز کیا اس کی مثال مغل تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکتی۔ یہ خود شاہجہاں تھا جو باپ کے خلاف علانیہ برسر جنگ ہو گیا تھا یہ جہانگیر تھا جس نے اپنے باپ کے مقابلہ میں اعلان جنگ کر دیا تھا"۔(۲)

یقیناً مقدمہ رقعات عالمگیر ایک عظیم الشان تحقیقی کارنامہ ہے جس کی مثال اردو

۱-یادرفتگاں ج۲، ص۷۴ ۳۔

۲-مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۵۰ ۴۔

زبان میں مشکل سے ملے گی۔

رقعات عالمگیر

یہ دراصل رقعات عالمگیر کا مجموعہ ہے جو نجیب اشرف صاحب کی برسوں کی محنت و تحقیق کا نتیجہ ہے۔

کسی بھی شخص کے خطوط کی روشنی میں اس کی اصل شخصیت کو دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ خطوط سے اس کی جو شخصیت سامنے آتی ہے اصلاً وہی اس کی اصل شخصیت ہوتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سچ لکھا ہے کہ:

"یہ خصوصیت صرف خطوط ہی کو حاصل ہے کہ ان میں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گذرتے ہیں۔ جنھیں نہ انشاء کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات واستعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحہ پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت ہر خیال اور تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے"۔(۱)

ظاہر ہے اورنگ زیب کی اصل شخصیت کو جو مغربی مورخین کے بے سروپا الزامات کے گرد و غبار میں دب گئی تھی پیش کرنے کے لیے سب سے عمدہ اور معیاری ماخذ اس کے خطوط تھے۔ چونکہ عالمگیر کے دامن کو صاف کرنے کا آغاز علامہ شبلی نے کیا تھا اس لیے دارالمصنفین کے پیش نظر عالمگیر کی شخصیت پر بھی ایک مفصل اور تحقیقی کتاب کی تصنیف تھی زیر نظر کتاب اسی کوشش کا حصہ ہے۔

نجیب اشرف صاحب نے یہ رقعات انتہائی تلاش و تفحص کے بعد جمع کیے تھے۔ اس کے جمع کرنے میں بڑی دشواریاں تھیں کیونکہ یہ خطوط مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ نجیب اشرف صاحب کے الفاظ میں "یہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی کسی لائبریری، ایک شہر یا ایک صوبہ میں جمع نہیں بلکہ یورپ میں بھی مختلف مقامات پر منتشر ہیں۔ کوئی برطانوی عجائب خانہ میں ہے اور کوئی دفتر وزارت ہند میں کوئی پیرس میں، کوئی لندن میں و قس علیٰ ہذا"۔(۲)

چنانچہ نجیب اشرف صاحب نے یہ دشوار گزار مرحلہ اپنے استاذ جدو ناتھ سرکار

۱- بابائے اردو مولوی عبدالحق مقدمہ خطوط شبلی۔ ۲- ماہنامہ معارف جولائی دسمبر ۱۹۲۷ء ص ۴۵۱-۴۵۷۔

کے تعاون اور تلاش و تحقیق کی محنت سے حل کیا اور عالمگیر کی تخت نشینی تک کے اس کے تمام رقعات و مراسلات جمع کیے جو ان کی تحقیقی زندگی کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں موضوع کے اعتبار سے دراصل ایک ہی ہیں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کی افادیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

> "مولوی نجیب اشرف ندوی پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے کتاب کی اصلی عظمت اور حقیقی وقعت سے روشناس کرایا۔ انھوں نے نہ صرف اس کا دعویٰ کیا بلکہ اپنے دعوے کو دلائل سے ثابت بھی کر دکھایا۔ کتاب کا تعلق جس قدر ادب و انشاء سے ہے اس سے کہیں زیادہ تاریخ و سیاست سے ہے۔ شاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حالات پر اردو میں بھی اب تک اچھا خاصا لکھا جا چکا ہے اور اردو و فارسی، مرہٹی، انگریزی میں اس کی مخالفت و موافقت پر ایک پورا ذخیرہ تصانیف جمع ہو چکا ہے لیکن اب تک کسی نے اس جانب توجہ نہیں کی تھی کہ دوسرے مورخوں کے بیانات سے کہیں زیادہ معتبر و مستند بیان اورنگ زیب سے متعلق خود اورنگ زیب کی زبان سے ہو سکتا ہے۔ اس اوّلیت کا سہرا اس نوجوان ندوی کے سر ہے"۔(۱)

رقعات عالمگیر میں عالمگیر کے رقعات کے علاوہ ضمیمہ میں شاہجہاں، جہاں آراء اور دوسرے شہزادوں کے خطوط بھی شامل ہیں۔ ان خطوط سے بھی عہد عالمگیری کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز بعض سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

عالمگیر کے بے ساختہ اور قلم برداشتہ ان خطوط کی تاریخی اہمیت کے علاوہ ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ ان خطوط میں عالمگیر ایک مصلح بھی نظر آتا ہے، شاید ہی کوئی ایسا خط ہو جو نصیحت آمیز جملوں سے خالی ہو۔ نجیب صاحب نے سچ لکھا ہے کہ:

> "اورنگ زیب کے خطوط گلہائے رنگا رنگ کا بہترین مجموعہ ہیں۔ کہیں سیاسی و معاشی واقعات پر تنقید کی ہے، کہیں شوق وصال بے چین کیے ہوئے ہے، تو کہیں درد فراق نے مضطرب کر رکھا ہے۔ کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے، تو کہیں کسی کی موت کا ماتم۔ کسی جگہ کسی افسر کی

۱- سچ لکھنؤ ۲۰ر مئی ۱۹۳۰ء۔

سفارش ہے، تو کہیں تنبیہ۔ اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل
حالات سے مملو ہے، تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر ہے،
کہیں عتاب ہے، تو کہیں عنایت کہیں گرم جوشی ہے، تو کہیں سرد مہری۔
غرض وہ کون سی چیز ہے جو اس کے مجموعہ میں نہیں"۔(۱)

تاریخی مقالات و مضامین

سید نجیب اشرف ندوی نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے علاوہ سیکڑوں علمی، ادبی تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے جو بے حد مقبول ہوئے خاص طور سے وہ مضامین جن میں نیاز فتحپوری کی علمی بددیانتیوں کا راز فاش کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہیں۔

یہاں ان کے چند تاریخی مضامین کے عناوین لکھے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ عہد مغلیہ کی تاریخ پر کس قدر گہری نظر رکھتے تھے۔

بابر یا بابرو (معارف، اگست ۱۹۲۲ء) ایک تاریخی غلطی کی اصلاح (ستمبر ۱۹۲۳ء) کتب خانہ مشرقی (مارچ ۱۹۲۳ء) دیوان حافظ اور سلاطین مغلیہ (جون ۱۹۲۳ء) دو اہم تاریخی دستاویز (مارچ ۱۹۲۸ء) کیا داراشکوہ مسیحی مرا؟ (اپریل ۱۹۲۸ء) ایک تاریخی معمہ شاہجہاں نامہ صادق (ستمبر اکتوبر ۱۹۲۸ء) وغیرہ۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے نجیب صاحب نے اے ای ہورنس (A. E. Horness) کی کتاب (Political System of British India) کا اردو ترجمہ بھی ان کے مورخانہ ذوق اور فہم و بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

بہر حال سید نجیب اشرف صاحب کی حیثیت ان کی قیمتی تصانیف اور معرکہ آراء مضامین کی وجہ سے ایک بڑے مورخ کی ہے۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ ہمیشہ ایک بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے یاد کیے جاتے رہیں گے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی

مولانا سید ریاست علی ندوی دارالمصنفین کے مشہور مصنف ہیں۔ ان کا خاص موضوع تاریخ ہے، تاریخ صقلیہ اور تاریخ اندلس اس فن میں ان کی معرکۃ الآراء کتابیں ہیں

۱۔ رقعات عالمگیر ص ۵۶۔

ان کے علاوہ کئی اور کتابیں اور سیکڑوں مقالات سپرد قلم کیے جو ان کے مورخانہ شعور کی شہادت دیتے ہیں یہاں ان کی زندگی کے مختصر حالات اور ان کے تاریخی تحریروں کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا ریاست علی ندوی آنگیلہ ضلع گیا (بہار) میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ندوۃ العلماء گئے جہاں سے ۱۹۲۴ء میں فراغت حاصل کی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ان کے ہم جماعت تھے اسی سال مولانا سید سلیمان ندوی کی خواہش پر دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور اس کے رفیق منتخب ہوئے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی کو مضمون نگاری کا ذوق ابتداء ہی سے تھا۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی ان کے مضامین ملک کے مؤقر رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ ۲۱ سال کی عمر میں علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ فسخ الملام عن ائمۃ الاسلام کا اردو ترجمہ ائمہ اسلام کے نام سے کیا جو ۱۹۲۶ء میں الہلال بک ایجنسی لاہور سے شائع ہوا۔ دارالمصنفین میں سید صاحب کی تربیت میں اس ذوق میں مزید جلا پیدا ہوئی اور انھوں نے اپنی محنت و ریاضت سے بہت جلد سید صاحب کی خاص توجہ حاصل کرلی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم رقمطراز ہیں:

> "وہ ۱۹۲۴ء میں جناب شاہ معین الدین کے ساتھ ندوہ کی تعلیم ختم کر کے حضرت سید صاحب کی خواہش پر یہاں (دارالمصنفین) آئے اور تھوڑے ہی دنوں میں سید صاحب کو اپنی علمی ریاضت و محنت سے متاثر کیا۔ ۱۹۲۶ء میں ان کو اپنی نگرانی میں معارف کے مضامین کی ترتیب کا کام سپرد کیا جس میں وہ اچھے اچھے مضامین کی تلخیص کرتے اور مطبوعات جدیدہ پر ریویو بھی لکھتے رہے"۔(۱)

مولانا سید ریاست علی ندوی دارالمصنفین میں تقریباً ۲۵ برس رہے۔ دو جلدوں میں صقلیہ کے مسلمانوں کی تاریخ لکھی اور اندلس کی تاریخ بھی کئی جلدوں میں لکھی تھی جس کی ایک جلد دارالمصنفین سے شائع ہو سکی۔ ان کتابوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کے سیکڑوں

۱- بزم رفتگاں ج ۲، ص ۲۱۹۔

مضامین ماہنامہ معارف میں چھپے۔ کبھی کبھی وہ معارف کے شذرات لکھتے ان کے بعض مضامین کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں پٹنہ کی مشہور درسگاہ شمس الہدیٰ میں پرنسپلی کے امیدوار ہوئے مگر منتخب نہ ہوسکے تو اپنے وطن گیا کے مشہور رسالہ ندیم سے وابستہ ہو گئے۔ اسے اپنے ادارتی تجربہ سے معارف جیسا ایک علمی رسالہ بنانا چاہا مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے کامیابی نہیں ملی چنانچہ دوبارہ دارالمصنفین واپس آگئے اور کئی سال تک اس کی خدمت میں مصروف رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں سید صاحب کی سفارش سے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے مگر بحیثیت پرنسپل وہ اساتذہ اور طلبہ کو خوش نہ رکھ سکے (۱)۔ اس لیے عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ منتقل ہو گئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

پٹنہ کے زمانہ قیام میں دارالمصنفین کے طرز پر ادارۃ المصنفین قائم کرنا چاہا لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔

وظیفہ یابی کے بعد اپنے وطن آبگیلہ میں ہی اقامت اختیار کی۔ دارالمصنفین کے ارباب حل و عقد کا اصرار تھا کہ وہ دارالمصنفین آکر تاریخ اندلس کی بقیہ جلدیں مکمل کردیں جس کے لیے وہ راضی بھی ہو گئے تھے مگر اسی اثنا میں یکایک ۱۴ر نومبر ۱۹۷۶ء کو وفات پائی اور اپنے وطن ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

تصانیف

مولانا سید ریاست علی ندوی کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱-ائمہ اسلام ۲-سرگذشت ادب ترکی ۳-اسلامی نظام تعلیم

۴-تاریخ اندلس ۵-تاریخ صقلیہ (دو جلدیں) ۶-عہد اسلامی کا ہندوستان

۷-عہد رسالت و خلافت راشدہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد کتابیں ہیں جو شائع نہ ہو سکیں۔ تاریخ اندلس کی بقیہ تین جلدیں وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ایک کتاب تاریخ التاریخ کے نام سے لکھی تھی یہ مسودات ان کے گھر پر تھے معلوم نہیں اب محفوظ ہیں یا نہیں اگر ضائع ہو گئے تو یہ ایک بڑا علمی سانحہ ہوگا۔

۱- بزم رفتگاں ج ۲، ص ۲۱۹۔

یہاں ان کی مطبوعہ تاریخی تصانیف کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کی مورخانہ حیثیت اور ان کے تاریخی کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

تاریخ صقلیہ اوّل و دوم

مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ اسلام کی تدوین کے منصوبہ کو مشرقی و مغربی دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ مشرقی تاریخ اسلام کی تدوین کی ذمہ داری مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے ذمہ تھی اور مغربی حصہ کی تدوین و تکمیل کا کام مولانا سید ریاست علی ندوی کو سپرد کیا گیا تھا۔ تاریخ صقلیہ اسی منصوبہ کی پہلی کڑی ہے۔

صقلیہ یعنی سسلی میں مسلمانوں نے ڈھائی سو برس تک حکمرانی کی اور اس عرصہ میں اس سرزمین کو خیر و برکت کا سرچشمہ اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنادیا۔ مگر افسوس کہ اردو انگریزی کیا عربی میں بھی اس کی کوئی مستقل تاریخ نہیں تھی۔ دارالمصنفین نے مولانا سید ریاست علی ندوی سے صقلیہ کی مفصل اور مستند تاریخ دو جلدوں میں لکھوا کر اس کمی کو پورا کیا، یہ کتاب فاضل مورخ کی پندرہ سالہ محنت و تحقیق اور تلاش و تفحص کا نتیجہ ہے۔

پہلی جلد: اس جلد میں پہلے ایک گرانقدر مقدمہ ہے جس میں عربوں کے صقلیہ کا تعارف اور اس کی تحقیق ہے۔ پھر طبعی و تاریخی اور جغرافیائی حالات ہیں۔ اس میں مساحت، زمین کے طبعی حالات، باشندے، آبادیاں، زبان اور مذاہب کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد صقلیہ کے قدیم تاریخ کا ذکر ہے پھر اسلامی حکومت کا قیام، دولت، اغالبہ، فاطمیہ، کلبیہ اور صقلیہ اور دور طوائف الملوکی کی سلطنتوں کی مفصل تاریخ لکھی گئی ہے۔ نارفنی فتنہ اور اسلامی سلطنت کے خاتمہ کا بیان ایک باب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ آخر میں دوسری اسلامی سلطنتوں پر سلطنت صقلیہ کے زوال کا جو اثر پڑا اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بعد ازاں مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کے دور کی مفصل تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

یہ حصہ صقلیہ کی سیاسی تاریخ پر مشتمل ہے اس سے صقلیہ میں اسلامی سلطنت کے قیام اور اس کے عروج و زوال کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ یہ حصہ دارالمصنفین نے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔

دوسری جلد: یہ حصہ سسلی کی تمدنی تاریخ کا مرقع ہے۔ اس میں مسلمانان صقلیہ

کے قبائلی حالات، ان کی آبادیاں، عہد اسلامی کی زبان، مذاہب اور یہاں کے باشندوں کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ پھر نظام حکومت اور اس کے مختلف شعبوں اور ان کی کارگذاریوں کا ذکر ہے۔ بعد ازاں مسلمانوں کی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کا بھی ذکر ہے اس عہد کے مختلف علوم وفنون قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، تاریخ، کلام، مناظرہ، شعر و شاعری، علوم عقلیات، ریاضی، طبعیات کی مفصل تاریخ اور عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ پیش کیا گیا ہے نیز ان علوم وفنون کے ماہرین و مشاہیر کے حالات و سوانح اور ان کے علمی، دینی اور تصنیفی کارناموں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ایک باب میں سسلی کے اسلامی تہذیب و تمدن سے یورپ نے جو استفادہ کیا اس کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

درحقیقت تاریخ صقلیہ کی یہ دونوں جلدیں ایک ایسی تمدن آفریں قوم کی سرگذشت ہے جس کی تمدنی ترقیاں یورپ کی جدید ترقیوں کی بنیادوں میں سے اہم بنیاد ہے۔

دار المصنفین کے سلسلہ تاریخ میں یہ دونوں انتہائی مقبول ترین کتابیں ہیں اور سچ یہ ہے کہ اردو زبان میں اس قدر بلند پایہ اور معیاری تصانیف کم ہیں۔

تاریخ اندلس

اندلس پر مسلمانوں کی تقریباً پانچ سو برس کی حکمرانی نے اس ملک کو تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنادیا تھا۔ اس کی تاریخ پر اردو میں متعدد کتابیں، ناولیں اور مضامین اور افسانے لکھے گئے۔ مگر اس کی ایک مستقل مستند اور مبسوط تاریخ کی ضرورت باقی تھی۔ دار المصنفین نے اس کی ذمہ داری مولانا سید ریاست علی ندوی کے سپرد کی۔ چنانچہ انھوں نے پندرہ بیس برس کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد اندلس کی پانچ سو سالہ مفصل تاریخ چار جلدوں میں مرتب کی جس سے اندلس کے سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی پہلوؤں پر جامعیت سے معلومات فراہم کیے۔

جلد اول: اس میں اندلس کے نام، وجہ تسمیہ اور اس کا مفہوم واضح کرنے کے بعد اس کا طبعی و تاریخی جغرافیہ اور قدیم تاریخ لکھی گئی ہے۔ بعد ازاں اندلس پر مسلمانوں کے حملے اور اس کے اسباب کا ذکر ہے۔ اس میں فاتح اندلس طارق بن زیاد سے لے کر عہد بہ عہد ان ولاۃ کا ذکر ہے جو مرکزی حکومت کی طرف سے یہاں حکمرانی کرتے رہے۔ اس کے بعد اندلس کی

آزاد اموی حکومت کی تاریخ اور عبدالرحمٰن الداخل سے عبدالرحمٰن الاوسط تک کے حکمرانوں اور ان کے عہد کی سیاسی و تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

اس طرح اس کتاب میں فاتح اندلس طارق بن زیاد ۹۳ھ / ۷۱۲ء سے لے کر عبدالرحمٰن الاوسط بن حکم ۲۳۸ھ / ۸۵۲ء تک کے اندلس کے اسلامی دور کی مفصل سیاسی، علمی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ آگئی ہے۔

یہ دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب ہے یہ پہلی بار ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔

جلد دوم: اس میں امیر محمد (۲۳۸-۲۷۳ھ) کے دور سے لے کر حکم ثانی (۳۵۰-۳۶۶ھ) تک کے اندلس کی سیاسی اور تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

جلد سوم: اس میں ہشام ثانی (۳۶۶-۳۹۹ھ) کے دور سے امویوں کے آخری تاجدار ہشام ثالث (۴۱۸-۴۲۲ھ) کے عہد تک کی سیاسی و تمدنی تاریخ لکھی گئی ہے۔ اسی میں المنصور عامر اور اس کے خاندان کی سرگذشت بھی آگئی ہے جو ایک خاص زمانہ تک اندلس کی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ پر قابض رہا۔ اس جلد کے آخر میں دولت امویہ پر ایک نظر کے عنوان سے اندلسی بنوامیہ کی حکمرانی پر مختلف نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔

جلد چہارم: اس جلد میں اندلس میں ملوک طوائف کی سلطنتوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہے اور پھر زوال ہسپانیہ تک کی تاریخ ہے۔

جلد پنجم: یہ جلد مرتب نہ ہو سکی تھی یہ اندلس کے مشاہیر اور ارباب کمال کے تذکرہ کے لیے وقف تھی اس کا خاص حصہ لکھا جا چکا تھا۔

افسوس کہ تاریخ اندلس کی یہ بقیہ جلدیں شائع نہ ہو سکیں۔ ان کے مسودے مولانا ریاست علی ندوی دارالمصنفین سے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ نظر ثانی کے بعد دارالمصنفین کے حوالہ کر دیں گے مگر انھیں نظر ثانی کا موقع نہ مل سکا خدا جانے یہ مسودے اب کس حال میں ہیں۔ اگر شائع ہو جاتے تو نہ صرف اندلس کی تاریخ مکمل ہو جاتی بلکہ دارالمصنفین کے منصوبہ تاریخ اسلام کا ایک سلسلہ بھی مکمل ہو جاتا۔

عہد اسلامی کا ہندوستان

مولانا سید ریاست علی ندوی نے عہد اسلامی کا ہندوستان کے عنوان سے معارف

میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا جو معارف کے کئی شماروں میں شائع ہوا۔ یہ کتاب انھی مقالات کا مجموعہ ہے گو اس میں مولانا کے چند دوسرے چھوٹے بڑے مقالات بھی شامل ہیں جو انھوں نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق لکھے تھے۔ قدیم ہندوستان کے اصل باشندوں، قوموں، حکومتوں کے علاوہ، سندھ و ملتان کی حکومتوں اور غزنوی و غوری سلاطین ہند اور مملوک سلاطین کے عہد کی تاریخ کا اضافہ کر کے اسے ایک مستقل تصنیف کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کتاب میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے پہلے کی پُر امن اسلامی نو آبادیاں (جنوری ۱۹۴۹ء) ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملے اور ان کے اسباب (فروری ۱۹۴۹ء) سندھ کے حملوں کے اسلامی قیدی (مئی ۱۹۳۵ء) شہاب الدین غوری کے قاتل، مقتل، مرقد (جون ۱۹۴۳ء) ہندوستان آٹھویں صدی میں (دسمبر ۱۹۳۰ء) عیدین کے مراسم اسلامی ہند میں (فروری ۱۹۳۸ء) پٹھان اور مغل کی اصلیت (جون ۱۹۴۳ء و جنوری ۱۹۴۷ء) پٹھانوں کی تاریخ کے ماخذ (جولائی ۱۹۴۴ء) گیتا کا منظوم فارسی ترجمہ، کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی جرم تھی (مئی ۱۹۳۲ء) عالمگیر کے عہد میں مندروں کا انہدام (فروری ۱۹۴۷ء) عہد مغلیہ کے مناصب ہفت ہزاری (جون ۱۹۴۳ء) ہندوستان کے عہد اسلامی میں مالگذاری کی تشخیص اور تحصیل کا انتظام (جون ۱۹۴۳ء) ہندوستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کا نظام (جون ۱۹۴۳ء) ہندوستان کے عہد اسلامی کی تعلیمی زندگی (اکتوبر ۱۹۳۷ء) بنگال و بہار میں عہدہ نظامت (جون ۱۹۳۶ء) آب گلہ کا گور غریباں (اکتوبر ۱۹۳۸ء) وغیرہ۔

ان عنوانات سے مقالات کی اہمیت اور صاحب قلم کے گہرے تاریخی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب مستقل تصنیف نہ ہونے کے باوجود ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا بہترین مرقع ہو گئی ہے۔ اسے ۱۹۵۰ء میں ادارۃ المصنفین پٹنہ نے شائع کیا۔

عہد رسالت وخلافت راشدہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں عہد رسالت و خلافت راشدہ کے مبارک دور کی تاریخ اس انداز سے قلمبند کی گئی ہے کہ اس عہد زریں کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر اس میں آگیا ہے۔

مقدمہ میں مسلمانوں کے فن تاریخ اور اس کی خصوصیات و امتیازات کا ذکر ہے۔
پھر قدیم عرب قبل از اسلام کی مختصر تاریخ اور اس کا جغرافیہ لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت و سوانح، اخلاق و فضائل اور انقلاب آفریں تعلیمات کے ساتھ عہد رسالت کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ بھی قلمبند کی گئی ہے۔ بعد ازاں الگ الگ ابواب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے حالات و سوانح سیرت و اخلاق اور فضائل و مناقب اور ان کی خلافت اور عہد خلافت راشدہ کے مذہبی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی و معاشرتی انقلابات، ملکی فتوحات اور انتظامی کمالات کی مفصل تاریخ ہے۔ اس میں امام حسنؓ کے حالات و سوانح اور اخلاق و فضائل کے ساتھ عہد حسنی کے دوسرے واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں عہد خلافت راشدہ کے نظام حکومت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان تفصیلات کی وجہ سے یہ کتاب تاریخ اسلام کے اس زریں دور کی مفصل تاریخ اور تہذیبی و تمدنی کارناموں کا بہترین مرقع ہو گئی ہے۔

یہ کتاب اصول تاریخ کی روشنی میں لکھی گئی ہے اس لیے اپنے موضوع پر اردو میں یہ ایک مستند و معتبر کتاب اور نظریہ تاریخ کا عملی نمونہ ہے۔ اسے بہار اردو اکادمی پٹنہ نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔

تاریخ التاریخ

مولانا سید ریاست علی ندوی نے اس کتاب کا تذکرہ عہد رسالت و خلافت راشدہ کے مقدمہ میں کیا تھا مگر یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔ اس میں مسلمانوں کے فن تاریخ کی تاریخ غالباً قلمبند کی گئی ہے اگر شائع ہو جاتی تو بلاشبہ اردو میں ایک اہم تصنیف کا اضافہ ہوتا۔
۱۹۰۳ء میں جب علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے تو مسلمانوں کے علم تاریخ کی تاریخ مرتب کرانے کا خیال پیدا ہوا تھا جس کا ذکر انھوں نے انجمن کی رپورٹ میں کیا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں مولانا مرتضیٰ صاحب نے تاریخ التاریخ کے نام سے ایک کتابچہ لکھا تھا جو ۱۹۱۱ء میں امرتسر سے شائع ہوا مگر وہ اپنے موضوع پر بہت ہی مختصر تھا۔ مولانا سید ریاست علی ندوی کی اگر یہ کتاب شائع ہو جاتی تو علامہ شبلی کے دوسرے کاموں کی طرح اس

خواہش کی تکمیل بھی ان کے تلامذہ کے ذریعہ ہو جاتی۔

مقالات

مولانا نے متعدد تاریخی مقالات بھی لکھے ان میں ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق مقالات تو کتاب عہد اسلامی کا ہندوستان میں آگئے ہیں لیکن تاریخ اسلام کے متعلق انھوں نے جو تاریخی مقالات سپرد قلم کیے ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ یہ اہم اور متنوع موضوعات پر ہیں اور بعض تو تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں یہاں ان کی ایک سرسری فہرست نقل کی جاتی ہے جس سے مولانا کی مورخانہ شان اور جلالت کا اندازہ ہوگا۔

عربوں کا علم طب شام میں (جون ۱۹۲۶ء) امام غزالی اور حکمائے یورپ (اگست ۱۹۲۸ء) ابن رشیق صقلیہ میں (اپریل، اگست، ستمبر ۱۹۲۹ء) خان اعظم تاتاری (فروری ۱۹۳۲ء) اغلبیوں کا عدالتی نظام (دسمبر ۱۹۳۳ء) سسلی میں مسلمانوں کا تمدن (ستمبر تا دسمبر ۱۹۳۵ء و جنوری ۱۹۳۶ء) بوہرے (۵۳/۱) عہد اسلامی میں جیل خانوں کا موجد (۵۶/۲) عرب اور فن زراعت (۲۶/۵) مسلمان سلاطین کے لوازم شاہی (۵۳/۱) وغیرہ۔

مولانا سید ریاست علی ندوی کی قلمی زندگی کا غالب حصہ فن تاریخ کی خدمت میں گذرا اس لیے وہ تاریخ نویسی کے رموز و نکات سے پوری طرح آگاہ ہو گئے تھے۔ تاریخ صقلیہ اور تاریخ اندلس نہ صرف اردو میں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایک ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ راقم الحروف ان کتابوں کے بار بار کے مطالعہ کے بعد یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان کی تصانیف بلاشبہ دبستان شبلی کے اصول تاریخ نویسی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں اور اسی خوبی سے مولانا سید ریاست علی ندوی ممتاز مورخ تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عزیر

ڈاکٹر محمد عزیر کا تعلق ضلع اعظم گڑھ سے ہے اس کا ایک موضع بی بی پور ان کا مولد ہے۔ یہیں ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی، ”اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ“ کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی (Ph. D) کی ڈگری حاصل کی یہ مقالہ انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہو چکا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ غالباً ۱۹۳۲ء میں دارالمصنفین سے بحیثیت رفیق علمی منسلک ہوئے یہ سید صاحب کا دور نظامت تھا۔ سید صاحب نے انھیں دولت عثمانیہ کی تاریخ کی تدوین و تکمیل کا کام سپرد کیا۔ چنانچہ انھوں نے کئی برسوں کی محنت و تحقیق کے بعد دولت عثمانیہ کے نام سے دو جلدوں میں ترکوں کی قدیم و جدید تاریخ لکھی اور اسی کتاب سے ڈاکٹر صاحب علمی دنیا میں شہرت کے بلند مقام پر فائز رہے۔ اس کا آئندہ صفحات میں ہم ایک جائزہ پیش کریں گے۔

۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر صاحب کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے دارالمصنفین کو خیر باد کہہ کر علی گڑھ کو آباد کیا وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی ڈاکٹر صاحب کے مزید حالات دستیاب نہ ہو سکے۔

تاریخ دولت عثمانیہ

یہ کتاب دارالمصنفین کے مجوزہ منصوبہ تاریخ اسلام کی آخری کڑی ہے۔ اس میں دولت عثمانیہ کی مکمل سیاسی، تہذیبی و تمدنی اور علمی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ خود فاضل مورخ نے اس مفصل کتاب کا تعارف مختصراً اس طرح بیان کیا ہے:

> "عثمانی ترک جن کا یہ نام کسی نسل یا قوم کی طرف نہیں بلکہ ان کے پہلے فرمانروا عثمان خاں کی طرف منسوب ہے ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی۔ تین سو برس گذرنے نہ پائے تھے کہ عثمانی سلطنت بن گئی اس کے عروج کا دور مشرق میں سلطان سلیم اول اور مغرب میں سلیمان اعظم کی فتوحات پر ختم ہوتا ہے جس کی حکومت ایشیاء یورپ اور افریقہ کے وسیع حصوں میں قائم ہوئی۔ اس عہد میں عثمانی ترک ایک مرکزی یورپین طاقت تھے۔ ہنگری ان کے زیر نگیں تھا اور آسٹریا کے پایہ تخت دیانہ کی دیواروں تک ان کی فوجیں پہنچ چکی تھیں۔ ان کی ہیبت سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔

لیکن سلیمان اعظم کی زندگی ہی میں سلطنت کے اندر بعض کمزوریوں کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے جو ان کی وفات کے بعد روز بروز نمایاں ہوتے گئے۔ سلیمان کے بعد جتنے سلاطین تخت پر بیٹھے ان میں معدودے چند کے علاوہ کسی میں سلطنت عثمانیہ کی فرمانروائی کی اہلیت جیسی چاہیے نہ تھی۔ چنانچہ جس طرح آہستہ آہستہ اس سلطنت کا عروج ہوا تھا اسی آہستگی کے ساتھ اس کا زوال بھی شروع ہوا اور اس کے زوال کی مدت بھی اس کے عہد عروج کی طرح تین سو سال ہے۔ ان میں سے آخری ڈیڑھ سو برس میں سلطنت عثمانیہ اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور سلطنتوں کا مقابلہ کرتی رہی مگر اندرونی کمزوریوں کے باعث ایسی پے در پے شکستیں اٹھائیں کہ بالآخر ۱۹۱۸ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔(۱)

تاریخ دولت عثمانیہ اسی ایجاز کا اطناب ہے یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

جلد اول: پہلی جلد میں ترکوں کی ابتدائی تاریخ اختصار سے بیان کی گئی ہے پھر عثمان اول (۶۸۷ھ بمطابق ۱۲۸۸ء) سے مصطفےٰ رابع (۱۲۲۳ھ بمطابق ۱۸۰۸ء) تک تمام ترکی خلفاء کے حالات اور ان کے عہد کی سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور علمی تاریخ قلمبند کی گئی ہے یہ حصہ پانچ سو برسوں سے زاید کی سلطنت عثمانیہ کی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس میں اس عہد کے تقریباً تمام قابل ذکر چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر آگیا ہے۔ یہ حصہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

جلد دوم: دوسری جلد میں محمود ثانی (۱۲۲۳ھ بہ مطابق ۱۸۰۸ء) سے جنگ عظیم (۱۳۳۸ھ بہ مطابق ۱۹۱۹ء) تک کے تمام حکمرانوں کے حالات اور ان کے عہد حکمرانی کی جامع تاریخ لکھی گئی ہے۔ یہ جلد گویا سلطنت عثمانیہ کے انحطاط و زوال کی مکمل سیاسی و تمدنی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے یہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

ان دونوں حصوں سے دولت عثمانیہ کی مکمل تاریخ اور اس کے عروج و زوال کا کامل مرقع سامنے آجاتا ہے۔ تیسری جلد بھی مصنف کے پیش نظر تھی اور اس کا خاصا حصہ مرتب بھی کیا جا چکا تھا جس میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد جمہوریہ ترکی (۱۹۱۸ء) اور واقعات مابعد کے حالات قلمبند کیے گئے تھے مگر اسی زمانہ میں ڈاکٹر عزیر صاحب نے دارالمصنفین سے

۱۔ تاریخ دولت عثمانیہ اول دیباچہ ص ۲-۳۔

ترک تعلق کیا نتیجتاً یہ حصہ تشنہ تکمیل رہ گیا۔

چند خوبیاں

دولت عثمانیہ ڈاکٹر عزیر کی سات سالہ محنت و مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا حاصل ہے۔ یہ اردو میں سلطنت عثمانیہ کی پہلی مفصل اور مستند تاریخ ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا وہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے۔(۱)

کتاب کے مصادر و مراجع کے استناد و اعتبار کے متعلق خود مصنف کا خیال ہے کہ:

> ''ان صفحات کی ترتیب میں عثمانی ترکوں کی تاریخ سے متعلق انگریزی، عربی اور فارسی کی مستند ترین کتابوں نیز بعض منتخب ترکی اور فرانسیسی تاریخوں کے ترجموں سے مدد لی گئی ہے اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔(۲)

اس میں جہاں یہ کوشش کی گئی کہ ہر سیاسی و جنگی واقعات مکمل شکل میں قلمبند کیے جائیں وہیں عہد عثمانی کے تہذیبی و تمدنی کارناموں کی ایک ایک جزئی تفصیلات بھی لکھی گئی ہیں جس سے عہد عثمانی کی طرز حکمرانی و سیاست کے ساتھ تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ صحت روایات کی تعیین، واقعات کے اسباب و علل کی تلاش اور ان سے مفید نتائج کا استنباط، غیر جانبداری کا التزام اور سند و حوالہ کا خصوصی اہتمام جیسے معروف اصول تاریخ نویسی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کتاب کا اسلوب نگارش وہی ہے جو دارالمصنفین کا طرہ امتیاز ہے۔

اس کتاب کے مفصل مطالعہ کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ علامہ شبلی اور دبستان شبلی کے دیگر مورخین کی تحریروں میں جن اصول تاریخ نگاری کا ہم نے بار بار ذکر کیا ہے دولت عثمانیہ اس کا بہترین نمونہ ہے اور اسے اردو زبان کے تاریخی سرمایہ میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالسلام قدوائی

مولانا عبدالسلام قدوائی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل، مولانا سید سلیمان ندوی،

۱۔ تاریخ دولت عثمانیہ ج اول دیباچہ ص ا۔ ۲۔ ایضاً ص ۴۔

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا شبلی جیراجپوری کے شاگرد خاص تھے۔ فراغت کے بعد جامعہ ملیہ میں انھوں نے عصری تعلیم حاصل کی۔ اس طرح وہ ندوہ اور جامعہ کے افکار و نظریات کا خوشگوار امتزاج تھے۔ وہ ایک اچھے مدرس، اچھے مصنف اور اچھے خطیب تھے۔ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے بے پناہ عقیدت تھی اور اسی بنا پر دارالمصنفین سے بھی ان کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ آخر عمر میں اس کے شریک ناظم اور علمی مشیر مقرر ہوئے۔ ان کی دو کتابیں "ہندوستان کی کہانی" اور "ہماری بادشاہی" دارالمصنفین کی مقبول کتابوں میں سے ہیں۔

مختصر حالات زندگی

مولانا عبدالسلام قدوائی ۷ر مارچ ۱۹۰۷ء میں تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلماء آئے۔ ان کے اہم اساتذہ کا ذکر اوپر آچکا ہے مولانا محمد ناظم ندوی اور مولانا رئیس احمد جعفری ان کے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۳۰ء میں فراغت حاصل کی پھر عصری تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی گئے جہاں تین سال عصری علوم کی تحصیل میں صرف کیے۔ اس کے بعد بمبئی کے اس وقت کے مشہور اخبار "خلافت" کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں مدرس کی حیثیت سے بلائے گئے ۱۹۴۳ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک ماہنامہ الندوہ کے مدیر رہے۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ادارہ تعلیمات اسلام قائم کیا، ۱۹۵۱ء تک اس کی خدمت میں مصروف رہے یہاں تعلیم یافتہ حضرات کو قرآن پاک کا درس دیتے اور آسان ریڈروں کے ذریعہ عربی سکھاتے رہے۔ یہیں انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مل کر ایک مفید و مقبول جریدہ تعمیر نکالا۔ ۱۹۵۱ء میں ناظم دینیات ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی گئے جہاں ۲۱ سال تک اس شعبہ کی خدمت کی۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ندوۃ العلماء کے اعزازی معتمد تعلیم بنائے گئے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد مارچ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین کے شریک ناظم اور ماہنامہ معارف کی مجلس ادارت کے رکن بنائے گئے اور آخر دم تک وہ اسی سے وابستہ رہے۔ ۲۴ر اگست ۱۹۷۹ء میں اپنے وطن تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں انتقال کیا اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

مولانا درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی مدۃ العمر

مصروف رہے اور مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱- مثالی حکمراں ۲- ہماری بادشاہی ۳- ہندوستان کی کہانی ۴- دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد ۵- مسلمان اور وقت کے تقاضے ۶- عربی زبان کے دس سبق ۷- قرآن مجید کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب ۸- حضرت بلالؓ ۹- حیدر حسن خاں ۱۰- تعلیمات اسلام (دو جلدیں) ۱۱- روح القرآن ۱۲- حدیث نبویؐ کے اولین صحیفے ۱۳- میزان و منشعب جدید وغیرہ۔

ان کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے جو "خلافت" بمبئی "تعمیر" لکھنؤ "الندوہ" لکھنؤ اور "معارف" اعظم گڑھ کی فائلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں مولانا کی ان تصانیف کا تعارف کرایا جاتا ہے جو تاریخ سے متعلق ہیں دوسری کتابیں ہمارے مباحث سے خارج ہیں ان کا کسی اور مقام پر ذکر آئے گا۔

۱- مثالی حکمراں

یہ ایک مختصر کتاب ہے اس میں خلافت راشدہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد زریں کے چند سبق آموز تاریخی، سیاسی اور علمی واقعات کو جمع کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ مذکورہ دور حقیقی جمہوری دور تھا۔ یہ اصلاً اس سلسلہ مضامین کا مجموعہ ہے جو "سروری در دین ماخدمت گریست" کے عنوان سے پہلے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ پھر رسالہ تعمیر میں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں مزید اضافہ و ترمیم کے ساتھ ان کو سلیقہ سے مرتب کر دیا گیا ہے۔ ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان کے انتخاب میں غور و فکر اور مقصد نمایاں ہے اور اس میں حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں سے ہی رجوع کیا گیا ہے۔ مولانا قدوائی نے لکھا ہے کہ "واقعات کے بارے میں نقل کرنے سے پہلے خوب غور کر لیا گیا ہے اور جب صحت کے متعلق پورا اطمینان ہو گیا ہے تو کتاب میں درج کیے گئے ہیں" (۱)۔ اس کے متعدد ایڈیشن اب تک ملک کے مختلف ناشروں نے شائع کیے ہیں میرے پیش نظر نظیر بک کتب خانہ کا شائع کردہ نسخہ ہے۔ ادارہ تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ نے اس کا ہندی ترجمہ "آدرش شاشک" کے نام سے شائع کیا ہے۔

۱- مقدمہ مثالی حکمراں ص ۱۔

۲-ہماری بادشاہی

اس میں تیرہ سو برس کی اسلامی تاریخ ابتدائی درجات کے طالبعلموں کے لیے عام فہم اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے تاکہ طلبہ اپنی قومی تاریخ سے مکمل اور جامع واقفیت حاصل کر سکیں۔ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اسلام سے پہلے کی دنیا کی حالت بیان کی گئی ہے پھر سیرت نبویؐ اور عہد رسالت کے غزوات کا ذکر ہے اس میں آنحضرت ﷺ کی وفات تک کی مختصر تاریخ بیان ہوئی ہے۔ دوسرے باب میں خلفائے راشدین کا ذکر خیر ہے پھر بالترتیب خلفائے بنوامیہ، خلفائے بنوعباس اور مصر کی عباسی سلطنت کی تاریخ ہے اسی طرح اندلس، دولت عثمانیہ اور اسلامی ہند کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ آخری باب میں عالم اسلام کی موجودہ صورت حال اور مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "یہ مسلمانوں کی ان تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں روئے زمین کے اطراف میں انھوں نے قائم کیں گو تمام سلطنتوں کا اس میں استقصاء نہیں کیا گیا ہے تاہم کوئی بڑی سلطنت چھوٹنے نہیں پائی ہے۔(۱)

یہ کتاب بلاشبہ بچوں کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد تاریخ کی کتاب ہے اور آج بھی نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

۳-ہندوستان کی کہانی

مولانا نے یہ کتاب بھی بچوں ہی کے لیے لکھی ہے اور "ہماری بادشاہی" ہی کے انداز پر لکھی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی مختصر تاریخ آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ آخر میں برطانوی حکومت اور آزاد ہندوستان کی بھی تاریخ مختصراً قلمبند کردی گئی ہے اور تاریخ کے ساتھ Civics بھی اس میں آگئی ہے جو آج ایک ضروری مضمون ہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے ابتدائی درجات کے طالب علموں کو واقف کرانے کے لیے یہ انتہائی مفید کتاب ہے۔

۱-ہماری بادشاہی ص ا۔

ان تینوں کتابوں کی روشنی میں مولانا قدوائی کو ایک وسیع المطالعہ مورخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کتابیں اگرچہ بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی گئی ہیں تاہم اس میں صداقت کا پورا اہتمام کیا گیا ہے اور اصول تاریخ نگاری کو شعوری طور پر برتا گیا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب سرائمیر کے مدرستہ الاصلاح کے نامور فرزند اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے خصوصی تربیت یافتہ ہیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے اب تک سیکڑوں تحقیقی مقالات اور کئی گرانقدر علمی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ ان کا ابتدائی تصنیفی کام بھی تاریخ ہی سے متعلق ہے جناب سید صباح الدین عبدالرحمن کی وفات (۱۹۸۷ء) کے بعد دارالمصنفین کے ناظم مقرر ہوئے اور اب انھیں کے دم سے دارالمصنفین کی بزم علمی پُر رونق اور آباد ہے اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے۔

مختصر حالات زندگی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب اپنے نانیہال جیراج پور ضلع اعظم گڑھ میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی گاؤں اسی ضلع کا موضع سہریا ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ نظام آباد میں حاصل کی علوم اسلامیہ کی تکمیل مدرستہ الاصلاح سرائمیر میں کی اور فراغت کے بعد ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین آئے۔ اس وقت سے آج تک دارالمصنفین میں تحقیق و تصنیف میں مصروف ہیں۔ سیکڑوں مقالات معارف، برہان اور ملک کے دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں نیز مندرجہ ذیل کتابیں دارالمصنفین سے طبع ہو چکی ہیں۔

۱- ہندوستان عربوں کی نظر میں (دو جلدیں) ۲- تذکرۃ المحدثین (تین جلدیں)
۳- چند ارباب کمال ۴- مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔

مولانا معارف میں عرصہ تک کتابوں پر تبصرے کرتے رہے اور اب معارف کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ معارف کے شذرات کا وقار الحمدللہ انھوں نے بہت بلند کر دیا ہے۔ ان کے شذرات شاہ صاحب کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

یہاں ان کی تاریخی تحریروں کا تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ ان کی اہمیت کا اندازہ

ہو سکے۔

ہندوستان عربوں کی نظر میں: ہندوستان سے عربوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ انگریز مورخین نے اپنی تصانیف میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق محض حملہ آور اور فاتح کا رہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں قدیم عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور مورخین کے ان بیانات کو جو انھوں نے ہندوستان سے متعلق اپنی تصانیف میں پیش کیے تھے جمع کر دیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے علمی، مذہبی اور تجارتی رہا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: پہلے حصہ میں جاحظ، خردازبہ، سلیمان تاجر، ابوزید سیرافی، بلاذری، یعقوبی، ابن فقیہ ہمدانی، ابن رستہ، بزرگ بن شہریار، مسعودی، طاہر مقدسی، اصطخری، بشاری مقدسی وغیرہ کی کتابوں اور سفر ناموں کے ان اقتباسات کو جمع کیا گیا ہے جن کا تعلق قدیم ہندوستان کی تاریخ سے ہے۔ اصل عبارت کے ساتھ اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے تاکہ عربی کے ساتھ اردو خواں طبقہ بھی بھرپور استفادہ کر سکے۔ مذکورہ مورخین، جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے مختصر حالات بھی دے دیئے ہیں۔ بعض مقامات پر مفید حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔ کتاب کی ترتیب سنین کے اعتبار سے ہے جس سے عہد بہ عہد کے خیالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

یہ حصہ دارالمصنفین نے ۱۹۵۹ء میں حکومت ہند کے مالی تعاون سے شائع کیا۔

دوسرا حصہ: اس حصہ میں ابن الندیم، عبدالقاہر بغدادی، صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، قاضی رشید بن زبیر، ادریسی، ابن ابی اصیبعہ، ابن بطوطہ اور قلقشندی کے ہندوستان سے متعلق بیانات کو اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے یہ حصہ بھی دارالمصنفین نے ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند ہی کے تعاون سے شائع کیا:

ان دونوں حصوں میں نویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک کے قدیم عرب مصنفین، سیاحوں، جغرافیہ نویسوں کے بیانات آگئے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں:

> ”یہ کتاب تیسری صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک چھ سو سال کے ہندوستان اور ہندوؤں کی قدیم تاریخ کا مرقع ہے۔ اس دور کے

متعلق اپنے قدیم، مستند اور متنوع معلومات خود ہندوستانی زبانوں میں بھی مشکل سے ملیں گے اس لیے یہ کتاب تاریخ ہند کے طلبہ اور مورخین کے لیے ایک اہم ماخذ ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ عرب مصنفین نے ہندوؤں کی تاریخ کے ساتھ کتنا اعتناء کیا اور اس کی بڑی خدمت کی ہے"۔(۱)

مولانا کی یہ دونوں کتابیں قدیم ہندوستان کی تاریخ بھی ہیں اور آج کے مورخ کے لیے ان کی حیثیت تاریخ قدیم کے بنیادی ماخذ کی بھی ہے۔ مولانا کی اس اہم تاریخی خدمت کو کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔

مولانا کی مشہور تصنیف تذکرۃ المحدثین ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چونکہ یہ اصلاً تذکرہ ہے جو ہمارا موضوع نہیں اس لیے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی

حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی دسمبر ۱۹۵۳ء میں اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ دریاباد میں پیدا ہوئے، جسے مشہور ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی ۱۹۶۲ء میں قرآن پاک حفظ کیا۔ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں عربی واسلامیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء گئے جہاں سے ۱۹۷۵ء میں امتیاز کے ساتھ فراغت حاصل کی۔ دوران تعلیم ندوۃ العلماء کے ترجمان رسالہ تعمیر حیات کے شاہ معین الدین نمبر کے لیے شاہ صاحب کے شذرات معارف پر ایک عمدہ مقالہ سپرد قلم کیا جسے بے حد پسند کیا گیا اور اسی مقالے کی وجہ سے دارالمصنفین کے اس وقت کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن نے ان کی مخفی صلاحیتوں کا اندازہ کرکے فراغت کے فوراً بعد دارالمصنفین بلالیا۔ بحمد اللہ اب تک وہ دارالمصنفین کی خدمت میں مصروف ہیں اب تک وہ متعدد علمی و تحقیقی مقالات معارف میں لکھ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مطبوعات جدیدہ پر تبصرہ اور اخبار علمیہ کا کالم پابندی سے لکھ رہے ہیں اخبار علمیہ میں خاص طور سے اہم علمی سائنسی اور ایجادات کی خبریں لکھتے رہتے ہیں۔

ان کا موضوع تحقیق تاریخ فقہائے اسلامی ہے جس کی پہلی جلد ابھی حال ہی (۱۹۹۷ء) میں دارالمصنفین نے شائع کی ہے اور دوسری جلدیں زیر ترتیب ہیں۔ اس سے پہلے

۱۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں ص ۳-۴۔

انھوں نے مشہور شاہ بانو کیس کے متعلق سپریم کورٹ کے ایک اہم فیصلہ کا علمی جائزہ لے کر اس کا مدلل و مسکت جواب ایک کتاب کی شکل میں لکھا جو بہت مقبول ہوا اور اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔

معارف کے ایک خاص کالم باب الا ستفسار میں ان کی متعدد تاریخی تحریر شائع ہو کر موجودہ دور کے مورخین سے داد تحقیق حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً معارف میں ایک استفسار آیا کہ سلطان شمس الدین ایلتمش کے لقب کا صحیح تلفظ کیا تھا التمش، التمش، ایلتمش وغیرہ ان میں سے صحیح ترین کون ہے؟

چنانچہ انھوں نے تاریخ کے اصل اور بنیادی ماخذوں سے ثابت کیا کہ سلطان شمس الدین کے لقب کا صحیح تلفظ ایلتمش ہے۔(۱)

اسی طرح ایک استفسار میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ موضع دیوراج ضلع چمپارن بہار میں اشوک کی لاٹ ہے جس کے ایک پتھر پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کندہ ہے اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا عالمگیر بہار گیا تھا؟ چنانچہ انھوں نے معتبر تاریخوں کے مطالعہ کے بعد معارف میں یہ لکھا کہ چمپارن کیا بہار میں عالمگیر کا جانا کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ ممکن ہے آسام کوچ کے دوران اس کی فوجیں بہار میں رکی ہوں اور یادگار کے طور پر اس مقام پر عالمگیر کا نام کندہ کرادیا ہو۔(۲)

ایک مراسلہ میں اکبر کی بیگمات کے نام اور القاب دریافت کیے گئے تھے۔ چنانچہ اس کے جواب میں انھوں نے ایک مختصر مگر جامع مضمون میں اکبر کی معلوم بیگمات کا تعارف جس میں ان کے خانوادوں کا ذکر ہے معتبر تاریخوں سے پیش کیا۔ اس سے پہلے منشی ذکاء اللہ کے علاوہ کسی اور مورخ نے اردو زبان میں ان بیگمات کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ چنانچہ اس تحقیق کے ذیل میں یہ بات سامنے آئی کہ جودھ بائی نام کی اکبر کی کوئی بیوی نہیں تھی البتہ جہانگیر کی بیویوں میں ایک بیوی کا نام جودھ بائی ضرور ملتا ہے۔

مولانا عمیر الصدیق ندوی نے اس طرح کے اور بھی متعدد مختصر تاریخی مضامین لکھے ہیں جو بڑے قیمتی اور معلومات افزاء ہیں اور مولانا کا یہی کل تاریخی سرمایہ ہے۔ امید ہے تاریخ کے موضوع پر ان کی اس طرح کی معلومات افزاء تحریریں ان کے قلم سے نکلتی رہیں گی۔

۱-ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۹۴ء۔ ۲-ایضاً مئی ۱۹۹۵ء ص ۹۵۔

باب ہفتم

دارالمصنفین کے تاریخی کارناموں کا مجموعی جائزہ

زیر نظر باب میں دارالمصنفین کے عہد ساز تاریخی کارناموں کا مجموعی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ دارالمصنفین کی وسیع، متنوع اور اہم تاریخی خدمات کی قدرو قیمت اور اہمیت وافادیت کا بیک نظر اندازہ ہو سکے اور یہ بھی واضح ہو سکے کہ دارالمصنفین نے اپنے مقصد کے حصول میں کس حد تک کامیابی کی منزلوں کو سر کیا اور اردو زبان کا دامن کس قدر قیمتی ثروت ودولت سے بھر دیا۔

دارالمصنفین کے متعلق مفصل بحث گذر چکی ہے یہاں صرف یہ اشارہ کافی ہے کہ علامہ شبلی اپنے عہد کے حالات اور ضروریات علمیہ کو عہد عباسیہ کے مثل تصور کرتے تھے۔ عہد عباسیہ میں نئے حالات وضروریات کے مطابق اسلامی علوم وفنون میں تغیر وانقلاب کی ضرورت محسوس کی گئی اور اسی کے پیش نظر آل عباس نے اپنی ثروت وحکومت کی بدولت بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور اہل علم وفضل ودانش کی ایک نامور جماعت کے ذریعہ اس وقت کی دنیائے علم کے مختلف علوم وفنون پر توجہ کی اور مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم کے ذریعہ ترقی پذیر عربی زبان وادب کے خزانہ کو بے مثال بنادیا۔ یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ دولت عباسیہ نے اسلامی علوم وفنون کی سادہ دیواروں پر نقش آرائی اور میناکاری کر کے علم وفن کا بازار سجادیا۔ علامہ شبلی نے بھی اپنے عہد میں اسی طرح کی ضرورت محسوس کی اور اسی خاص کام کے لیے اپنے تلامذہ کو تیار کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ تغیر پذیر حالات وضروریات کے مطابق تصنیف وتالیف وترجمہ اور ان کے طبع واشاعت کا اہتمام ہو۔ علامہ شبلی کی نظر میں دارالمصنفین دراصل عباسی بیت الحکمت کا مثنیٰ اور اسی کا جدید قالب تھا فرق صرف یہ تھا کہ آل عباس صاحب تخت وتاج اور علامہ شبلی ایک گدائے بے نوا تھے اور اس فرق کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو دارالمصنفین کا قیام اور اس کے مقاصد کے حصول کی اہمیت بیت الحکمت سے زیادہ اہم اور قابل قدر نظر آتی ہے۔

دارالمصنفین نے اپنے قیام (۱۹۱۴ء) سے آج تک (جون ۱۹۹۸ء) اپنی پچاسی سالہ زندگی میں مختلف علوم و فنون کی گرانقدر خدمات جس بلند تحقیقی و تصنیفی معیار اور اسلوب و انداز میں انجام دی ہے اس کی نظیر عالم اسلام کی پوری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ قرآن و حدیث، سیرت و سوانح، تذکرہ، ادبیات، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، اسلامی علوم و فنون کی تاریخ اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر دو سو سے زاید علمی اور بلند پایہ کتابیں اس دعوی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

دارالمصنفین کے پاس اپنے رفقاء (فیلوز) ہیں، اپنا کتب خانہ اور مطبع ہے بلند پایہ علمی تحقیقات کے لیے از اول تا آخر جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے وہ دارالمصنفین کے پاس موجود ہیں۔ اس طرح کا ادارہ کم از کم عالم اسلام میں آج بھی نظر نہیں آتا۔ بظاہر یہ بڑا دعویٰ ہے لیکن اس کے ثبوت کے لیے عالم عرب کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی شہادت ہمارے دعویٰ کی تقویت کے لیے کافی ہے وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

> "میں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی مگر علم کی مملکت دارالمصنفین میں دیکھی جس کے قلمرو میں اپنا کتبخانہ اپنے رفقاء اپنا پریس اپنا دفتر اپنا گھر اور اپنی مسجد ہے"۔(۱)

اس کی مطبوعات کے بارے میں یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ یہ تحقیق و تدقیق اور تلاش و تفحص کا بہترین نمونہ ہیں جس کی وجہ سے دارالمصنفین کی شہرت برصغیر کے علاوہ عالم اسلام بلکہ یورپ، افریقہ اور امریکہ تک جا پہنچی۔ علوم اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی ایسا صاحب علم و تحقیق ہو جو دارالمصنفین سے نا آشنا ہو۔

برطانیہ کے مشہور مستشرقین پروفیسر مارگولیتھ اور پروفیسر گولیم اور دارالمصنفین کے درمیان تو کئی بار علمی معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ چنانچہ ان مستشرقین نے اسلام، داعی اسلام، اسلامی علوم و آداب اور اسلامی تاریخ وغیرہ پر اپنے استشراقی خیالات بلکہ الزامات کے ذریعہ جو حملے کیے تھے دارالمصنفین کی تحقیقات سے آشنا ہونے کے بعد صرف پسپا ہی نہیں ہوئے بلکہ اعتراف شکست بھی کیا۔

ہمارا موضوع چونکہ دارالمصنفین کی تاریخی خدمات تک محدود ہے اس لیے ہم

۱-ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۹۰ء ص ۳۶۴-۳۶۵۔

یہاں اب تک کے مباحث کا ایک اجمالی لیکن حتی الامکان جامع جائزہ پیش کرتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ دارالمصنفین کی جملہ خدمات میں سب سے نمایاں تاریخ ہی کی خدمت ہے۔ دیگر علوم و فنون کی طرح فن تاریخ بھی متعدد اقسام پر مشتمل ہے۔ مثلاً سیاسی تاریخ جس میں سلاطین اور امراء و رؤسا کے حالات ان کی فتوحات اور نظام حکومت کا بیان ہوتا ہے۔ ایک قسم تہذیبی و تمدنی اور معاشرتی تاریخ کی ہے جو کسی قوم کی تہذیب و ثقافت اور اس کے تمدن اور معاشرت پر مبنی ہے۔ اسی طرح علوم و فنون کی تاریخ جس میں کسی قوم کے علوم و آداب کے احوال قلمبند کیے جاتے ہیں۔ اصلاحی سرگرمیوں اور تحریکوں کی تاریخ جس کا موضوع ملک و معاشرہ میں کسی خاص تحریک و تنظیم اور اس کے اثرات و نتائج سے بحث کی جاتی ہے۔ دارالمصنفین کے دائرہ عمل میں ان اقسام کا تنوع صاف نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ بعض اہم تاریخی مصادر و مآخذ کی تدوین و تلخیص کا فرض بھی انجام دیا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی کتاب ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' ایسی ہی ایک مفید علمی کاوش ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اصل مضمون کے مشمولات پیش خدمت ہیں:

سلسلہ سیرۃ النبیؐ

دارالمصنفین کا آغاز پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی حیات طیبہ کی تالیف سے ہوا۔ سیرۃ النبیؐ کے نام سے یہ بے نظیر سیرت سات جلدوں پر مشتمل ہے ابتدائی دو جلدیں علامہ شبلی اور بقیہ پانچ جلدیں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہیں۔ بلاشبہ یہ دارالمصنفین کی مقبول ترین اور سرمایہ صد افتخار کتاب ہے جس کی مثال اردو ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ اس کی عظمت و مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ملیالم اور پشتو وغیرہ میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہم اس کا مفصل ذکر علامہ شبلی اور سید صاحب کے باب میں کر چکے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ کے علاوہ دارالمصنفین نے سیرت پر مولانا سید سلیمان ندوی کی دو اور کتابیں خطبات مدراس اور رحمت عالم بھی شائع کی۔ خطبات مدراس کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود سیرۃ النبیؐ پر اس قدر جامع مجموعہ مضامین اب تک نہیں لکھا گیا۔

سیرۃ نبویؐ کے متعلق بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ سیرت بھی ہے اور تاریخ بھی۔ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی شناخت جلیل القدر مورخ کی حیثیت سے مسلم ہے اس لیے سیرۃ النبیؐ کو سیرت نگاری کے علاوہ تاریخی حیثیت سے کارنامہ قرار دیا جائے تو یہ بالکل درست اور برحق ہوگا۔ عہد رسالتؐ کی پوری تاریخ کا احاطہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

سلسلہ سیر الصحابہؓ

دارالمصنفین کا ایک اور بڑا تاریخی کارنامہ حضرات صحابہ کرامؓ کے احوال و واقعات کی تحقیق و تدوین ہے جو سیر الصحابہؓ کے سلسلہ کی شکل میں بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہم ان کا تعارف و تجزیہ گذشتہ صفحات میں مختلف مقامات پر پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اس قدر لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح اور ان کے کارناموں کا ایسا مفصل، جامع اور مکمل سلسلہ تالیف موجود نہ تھا۔ بلکہ اس مرتب صورت میں خود عربی زبان میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی جس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق و معاشرت اور ان کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کے واقعات مربوط شکل میں پیش کیے گئے ہوں۔ اس سلسلہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس سے عہد رسالتؐ و صحابہ کرامؓ کے سیاسی اور معاشرتی دونوں طرح کے حالات کا واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

سلسلہ تابعینؒ و تبع تابعینؒ

حضرات صحابہ کرامؓ کے فیض یافتہ بے شمار تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے حالات و سوانح کے عمل جمع و تدوین کو اگر تاریخ انسانی کے ایک انتہائی زریں دور سے تعبیر کیا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ دارالمصنفین نے تابعین اور تبع تابعین کے نام سے اس اہم تاریخی دور کی دو جلدیں مرتب کیں جو صرف ان شخصیات کے سوانح کی عکاسی ہی نہیں کرتیں بلکہ تیرہ سو سال پہلے کی تاریخ انسانی کا بھرپور مطالعہ و تجزیہ بھی پیش کرتی ہیں۔

تاریخ اسلام

دارالمصنفین کا ایک اور نمایاں کارنامہ دور اسلام کی مکمل تاریخ ہے تفصیل پہلے گذر

چکی ہے یہاں ایک جھلک پھر پیش کی جاتی ہے۔

۱-۴ تاریخ اسلام (چار جلدیں) از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ۵-۶ تاریخ دولت عثمانیہ (دو جلدیں) از ڈاکٹر محمد عزیر، ۷-۸ تاریخ صقلیہ (دو جلدیں)، ۹- تاریخ اندلس از مولانا ریاست علی ندوی، ۱۰- اسلام اور عربی تمدن، ۱۱- عرب کی موجودہ حکومتیں از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۲-۱۳ تاریخ دعوت و عزیمت (دو جلدیں) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ۱۴- اسلام کا سیاسی نظام از مولانا محمد اسحاق سندیلوی، ۱۵- ہماری بادشاہی از مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، ۱۶- عرب و ہند کے تعلقات، ۱۷- عربوں کی جہازرانی از مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دارالمصنفین نے مسلمانوں کی تاریخ کے ذریعہ ایشیا اور یورپ کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ فراہم کردیا۔

دارالمصنفین کی ان تاریخی تصانیف کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں نے ان کو اپنے نصاب تعلیم میں بھی شامل کیا۔ صقلیہ یعنی سسلی میں مسلمانوں نے ڈھائی سو برس تک حکمرانی کی مگر اردو کیا عربی و انگریزی میں بھی اس کی کوئی مفصل اور مبسوط تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ دارالمصنفین نے اس کی طرف بھی توجہ کی اور مولانا سید ریاست علی ندوی نے دو جلدوں میں اس کی نہایت جامع، مستند اور مکمل تاریخ قلمبند کی۔ اسی طرح تاریخ دولت عثمانیہ بھی اس کی بے نظیر اور معرکۃ الآرا کتاب ہے تاریخ اندلس بھی دارالمصنفین کا اہم تحقیقی کام ہے۔

اسی طرح چینی مسلمانوں کی تاریخ پر بدرالدین چینی کی کتاب "چینی مسلمان" بھی بہت اہم ہے اس سے پہلے اس موضوع پر جیمز کارکرن کی کتاب تاریخ ممالک چین تھی جو ۱۸۴۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

ان اشاعتوں سے ظاہر ہے کہ دارالمصنفین کی یہ کوشش رہی کہ ہر ایسے ملک کی تاریخ اردو میں آجائے جہاں مسلمانوں نے اپنے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی وجود کا احساس دلایا ہے۔ راقم الحروف اپنی معلومات کی بنیاد پر بے جھجک یہ کہہ سکتا ہے کہ تاریخ اسلام کی اس طرح تدوین کی کوشش عالم اسلام کے کسی ادارہ نے نہیں کی۔ یہ بلاشبہ دارالمصنفین کا امتیازی کارنامہ ہے۔

تاریخ ہند

ہندوستان کی معلوم تاریخ کو اگر مسلم تاریخ سے تعبیر کیا جائے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ دارالمصنفین نے روز اول ہی سے اس عظیم تاریخ کی تدوین و ترتیب پیش نظر رکھی، علامہ شبلی کے مقاصد میں اس مقصد کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ ہند کی تدوین کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا جس کا ذکر ہم تفصیل سے ان کے تاریخی کارناموں کے باب میں کر چکے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن تک دارالمصنفین کے رفقاء نے تقریباً پچیس جلدوں میں اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی ایک مختصر جھلک پیش کی جاتی ہے۔

۱- تاریخ سندھ ۲- مختصر تاریخ ہند ۳- مختصر تاریخ گجرات ۴- گجرات کی تمدنی تاریخ از مولانا سید ابو ظفر ندوی ۵- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلی نعمانی ۶- رقعات عالمگیر ۷- مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی ۸- ہندوستان کی کہانی از مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ۹-۱۰ ہندوستان عربوں کی نظر میں (دو جلدیں) از مولانا ضیاءالدین اصلاحی ۱۱- ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں از مولانا ابوالحسنات ندوی وغیرہ۔

تاریخ ہند کی ترتیب و تدوین میں سب سے زیادہ حصہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کا ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱۲- بزم مملوکیہ ۱۳-۱۵ بزم صوفیہ ۱۷- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ۱۸- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک ۱۹- ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر ۲۰- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام ۲۱- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے ۲۲- عہد مغلیہ ہندو مسلم مورخین کی نظر میں(۱) ۲۳-۲۴ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دو جلدیں) ۲۵- ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری وغیرہ۔

صباح الدین صاحب نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ کیا تھا اور وہ اس موضوع کے ہر پہلو اور ہر گوشہ پر وسیع و عمیق نظر رکھتے تھے۔ اس موضوع پر

۱- کتاب کا دوسرا ایڈیشن "ظہیر الدین محمد بابر ہندو مسلم مورخین کی نظر میں" کے نام سے شائع ہوا۔

انھوں نے اپنی کتابوں میں اتنا مواد جمع کر دیا کہ وہ اس دور کے ماہر اور ممتاز مورخ تسلیم کیے گئے۔ ان کے تاریخی کارناموں کے باب میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ان میں مقصدی پہلو غالب تھا۔ ان کا مقصد دراصل ملک میں قومی یک جہتی، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی کے جذبات کو فروغ دینا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انگریز مورخوں نے تعصب و منافرت پیدا کی تھی اس کا سدّ باب ہی ان کی محققانہ تحریروں کا محرک رہا۔ یہ کتابیں ثابت کرتی ہیں کہ دارالمصنفین کی مقصدی تاریخ نویسی بھی اپنی مثال آپ ہے۔

اس سلسلہ تاریخ ہند میں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے تاریخی مقالات کا مختصراً ذکر بھی ناگزیر ہے۔ علامہ شبلی کے تمام تاریخی مقالات کو سید صاحب نے دو جلدوں میں مرتب کیا جس میں اسلام اور مسلمان سلاطین پر جو بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے تھے ان کی تردید کی گئی ہے۔ اسی طرح سید صاحب کے مقالات بھی دارالمصنفین نے شائع کیے ان کے مقالات کی پہلی جلد بھی خالص تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے۔

علامہ شبلی کی ایک معرکہ آراء اور بے مثل کتاب ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' کا ذکر بھی ضروری ہے عالمگیر پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے اس کی اشاعت کے بعد عالمگیر کا دامن الزامات واتہامات کے داغوں سے بالکل صاف ہو گیا۔

تاریخ ہند کے سلسلہ میں مقدمہ رقعات عالمگیر بھی دارالمصنفین کا بڑا کارنامہ ہے۔ عالمگیر پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ اب تک شمع راہ بنی ہوئی ہے۔ بزم تیموریہ میں تیموری بادشاہوں کے دربار کی پہلی بار علمی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ فارسی میں ترجمہ ہو کر اہل ایران کی نظر سے بھی گذری۔(۱)

علوم وفنون کی تاریخ

دارالمصنفین نے مختلف اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بھی اپنے مورخین سے لکھوا کر شائع کی اور اس سلسلہ میں بھی اس نے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ہم یہاں اس کی مختصر وضاحت کرتے ہیں:

علم کلام کی تاریخ

علم کلام خاص مسلمانوں کا ایجاد کردہ ایک فن ہے، اسلام میں نامور متکلمین پیدا

۱۔ مقدمہ بزم تیموریہ۔

ہوئے۔ علامہ شبلی نے جب علم کلام کی طرف توجہ کی تو اس کی ایک مبسوط اور جامع تاریخ بھی علم الکلام کے نام سے قلمبند کی۔ دارالمصنفین نے علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی دوسری تصانیف کے ساتھ علم الکلام بھی شائع کیا جو اپنے موضوع کی سب سے اہم کتاب آج تک تسلیم کی جاتی ہے۔

اسلامی فقہ کی تاریخ

دارالمصنفین نے اسلامی فقہ کی تاریخ "تاریخ فقہ اسلامی" کے نام سے شائع کی جو اصلاً محمد الخضری کی تصنیف التشریع الاسلامی کا مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے سلیس اور رواں ترجمہ ہے۔ فقہائے شافعیہ کی تاریخ اور ان کے کارناموں کی تدوین بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے۔ اس کی ایک جلد تذکرۃ الفقہاء مولانا عمیر الصدیق ندوی کے قلم سے ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر دو اور کتابیں القضا فی الاسلام اور اسلامی قانون فوجداری بھی دارالمصنفین نے شائع کی ہیں جو مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہیں:

مشہور ادیب اختر جوناگڑھی کی کتاب طبقات الامم بھی علوم و فنون کی تاریخ کا حصہ ہے جس کے شائع کرنے کا سہرا بھی دارالمصنفین کے سر ہے۔

علم التفسیر

اس موضوع پر نسبتاً کم کام ہوا ہے صرف ایک کتاب تذکرہ مفسر ہند کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب مفسرین ہند کا خالص تذکرہ ہے۔ ضرورت تھی کہ فن تفسیر کی تاریخ پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا جاتا جو اس کتاب کو اور زیادہ کار آمد بنا دیتا۔ یہ مولانا محمد عارف اعظمی کے قلم سے ہے۔

فلسفہ تاریخ

دارالمصنفین نے اس موضوع پر کئی کتابیں شائع کیں۔ انقلاب الامم اور تاریخ اخلاق، تاریخ اسلامی اسی موضوع کا حصہ ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے نکلی ہیں۔ مولانا سید ریاست علی ندوی نے تاریخ التاریخ کے عنوان سے ایک مکمل کتاب لکھی تھی جو بدقسمتی سے اب تک شائع نہ ہو سکی۔ فن تاریخ کی تاریخ مرتب کرنے

کا خیال سب سے پہلے علامہ شبلی کے دل میں آیا تھا اس وقت وہ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری تھے۔ چنانچہ ان کے اس خیال سے متاثر ہو کر مولانا سید مرتضیٰ صاحب نے اس عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جو ۱۹۱۱ء میں امر تسر سے کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔ بہر حال فلسفہ تاریخ بھی دار المصنفین کی توجہ کا مرکز رہا مگر خاطر خواہ کام نہ ہو سکا۔

اسلامی درسگاہوں کی تاریخ

یہ تاریخ کا ایک اہم موضوع تھا چنانچہ دار المصنفین کے رفیق مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم نے نہایت تحقیق و تدقیق سے ایک کتاب "قدیم ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں" لکھی جو اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے تاریخ کے اس پہلو پر توجہ نہیں کی گئی تھی۔

جغرافیائی تاریخ

جغرافیائی تاریخ کا موضوع بھی دار المصنفین سے اوجھل نہیں رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی مہتم بالشان تصنیف ارض القرآن اس کی مثال ہے۔ اس کا مفصل جائزہ ہم سید صاحب کے باب میں پیش کر چکے ہیں۔ روسی عالم علامہ جار اللہ ہندوستان آئے تو فرمایا کہ مجھ کو دار المصنفین کی اہم خدمت کا اندازہ اسی کتاب کی اشاعت سے ہوا تھا۔

غرض یہ کہ تاریخ اسلام و ہندوستان کے علاوہ دار المصنفین کی دیگر کتابیں ادب و تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

سلسلہ ناموران اسلام

اس تاریخی سلسلہ تصانیف کا منصوبہ بھی علامہ شبلی نے ہی بنایا تھا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ ناموران اسلام اور نامور فرمانروایان اسلام کے تحت خود علامہ شبلی نے المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم اور الغزالی وغیرہ لکھیں۔ دار المصنفین نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا اور مندرجہ ذیل کتابیں اپنے مصنفین سے لکھوا کر شائع کی۔

سیرت عمر بن عبد العزیز، امام رازی، ابن خلدون، اقبال کامل، حکمائے اسلام از مولانا عبد السلام ندوی، خیام، سیرت عائشہؓ، حیات مالک، حیات شبلی از مولانا سید سلیمان

ندوی، حکیم الامت نقوش و تاثرات از مولانا عبدالماجد دریابادی، حیات سلیمان از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ابن رشد از مولانا محمد یونس فرنگی محلی، سید محمود، محمد علی کی یاد میں، صوفی امیر خسرو از سید صباح الدین عبدالرحمن وغیرہ۔

ان تمام کتابوں کی قدر و قیمت کا جائزہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے۔ اہل نظر نے جس طرح ان کی داد دی ہے وہ بھی بیان کی جاچکی ہے۔ ان کتابوں نے جس طرح نسل در نسل اپنا اثر قائم رکھا وہ ان کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ سر سید نے المامون کے متعلق لکھا کہ "یہ تاریخ نویسی کا کمال ہے" (۱)۔ الفاروق کے بارے میں پروفیسر حامد حسن قادری نے لکھا کہ "یہ ایسی جامع و مکمل کتاب تالیف ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا اس کے بعد اردو میں حضرت عمر فاروق کی تین چار ضخیم اور متعدد مختصر سوانح عمریاں لکھی گئیں مگر یہ سب علامہ شبلی کی خوشہ چینیاں ہیں"۔ (۲)

سیرت عائشہؓ کے متعلق علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ "یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمہ سلیمانی ہے اس کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا" (۳)۔ اس کا انگریزی، ترکی اور عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے البتہ عربی ترجمہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

خیام نے تحقیق و تدقیق اور کدو کاوش کا جو بلند معیار قائم کیا اس کی داد ہندوستان سے لے کر افغانستان اور ایران تک کے اصحاب علم و فضل نے دی۔ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف بھیجے تھے ان میں ایک تحفہ یہ کتاب خیام بھی تھی۔ علامہ اقبال نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ "اس میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اب اس پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا"۔ (۴)

خود علامہ شبلی کی سوانح عمری حیات شبلی جو مسلمانوں کی گذشتہ دو سو برس کی علمی تاریخ کا مرقع ہے اس کی اہمیت کا اندازہ شیخ محمد اکرام کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے کہ "سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو حیات جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا (۵)۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی دور طالب علمی کی یادگار حیات مالک کے طبع و اشاعت کا سہرا بھی دارالمصنفین کے سر ہے۔ یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی متعدد ایڈیشن اور تلگو ترجمہ

۱- دیباچہ المامون۔ ۲- داستان تاریخ ادب اردو۔ ۳- اقبال نامہ حصہ اول ص

~~ایضاً~~ ص ۱۷۸-۱۷۹۔ ۵- شبلی نامہ ص ۸۔

بھی شائع ہو چکا ہے۔

سلسلہ ناموران اسلام میں بیشتر کتابیں گو سوانح کا حصہ ہیں تاہم چند اہم کتابیں تاریخ کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ مثلاً المامون، الفاروقؓ، سیرۃ النعمان، سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور سیرت عائشہؓ وغیرہ۔ ان کا مفصل ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

ان تاریخی سلسلوں کے علاوہ دارالمصنفین کی دیگر ایسی مطبوعات جو موضوعات کے لحاظ سے اگرچہ تاریخ کے ضمن میں نہیں آتیں تاہم فن تاریخ سے وہ بالکل بیگانہ بھی نہیں۔ مثلاً تاریخ دعوت و عزیمت از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ۔

ماہنامہ معارف کی تاریخی خدمات

دارالمصنفین کے ماہوار علمی رسالہ معارف کا ذکر پچھلے صفحات میں متعدد بار آچکا ہے۔ اردو کے اس بے مثال علمی و تحقیقی رسالہ کو ملک و بیرون کے نامور محققین و مورخین کا قلمی تعاون برابر حاصل رہا۔ اس کی ۸۲ سال کی فائل کسی معرکۃ الآرا انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔

معارف کی علمی خدمات میں مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے علوم کی تاریخ کی ترتیب کا باب نمایاں ہے۔ مورخین دارالمصنفین کی مسلسل اور پیہم تاریخی تحقیق و تدوین کا اصل آئینہ معارف ہی ہے۔ ان کے علاوہ اس کے صفحات ملک کے ممتاز مورخوں کی نگارشات سے بھی ہمیشہ مزین رہے۔

دارالمصنفین کے تاریخی کارناموں میں اگر معارف کے تاریخی ذخیرہ کو بھی شامل کر دیا جائے تو بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دارالمصنفین نے فن تاریخ کی ایسی بے مثال خدمت کی ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

خلاصہ بحث

خلاصہ یہ کہ دارالمصنفین کے تمام تاریخی کارناموں کے تفصیلی مطالعہ و جائزہ سے یہ صاف طور سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالمصنفین نے تاریخ کی جس قدر خدمت انجام دی بر صغیر میں کسی ایک ادارہ کی جانب سے اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی اور اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو شاید عالم اسلام کا کوئی علمی و تحقیقی ادارہ اس کی مثال نہ پیش کر سکے۔

کتابیات

(الف)

۱	آغاز اسلام ترجمہ بدء الاسلام از علامہ شبلی	مترجمہ میمونہ سلطان	مطبع سلطانی ریاست بھوپال	۱۹۱۵ء
۲	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	علامہ شبلی نعمانی	اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱ اسوئیوالان دہلی	ب ت
۳	المامون	ایضاً	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۲ء
۴	الفاروق	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۲ء
۵	الغزالی	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۶ء
۶	الکلام	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۲ء
۷	اسلام کی عالمگیر خدمات	ایضاً	ریپلیکا پریس کراچی	۱۹۶۲ء
۸	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۹	آثار الصنادید (اول تا سوم)	سر سید احمد خاں	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۹۰ء
۱۰	اردو ادب کی ایک صدی	ڈاکٹر سید عبداللہ	ساقی بک ڈپو اردو بازار دہلی	۱۹۸۹ء
۱۱	اشخاص و افکار	ضیاء الحسن فاروقی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی	۱۹۷۳ء
۱۲	انشائے ماجدی	مولانا عبدالماجد دریابادی	ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ	۱۹۹۱ء
۱۳	افادات مہدی	بیگم مہدی افادی	سر سید بک ڈپو علی گڑھ	۱۹۸۵ء
۱۴	ابن خلدون کی عظمت اور علمائے یورپ	نکہت شاہجہاں پوری	علی بھائی اشرف علی اینڈ کمپنی	۱۹۴۴ء

۱۵	اردو نثر میں سیرت رسولؐ	ڈاکٹر انور محمود خالد	اقبال اکادمی پاکستان لاہور	۱۹۸۹ء
۱۶	اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء	الطاف فاطمہ	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی	ب ت
۱۷	اردو میں سوانح نگاری	ڈاکٹر سید علی شاہ	گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی	۱۹۶۱ء
۱۸	اودھ کے تاریخ نگار	انور حسین اکبر پوری	دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو	۱۹۹۱ء
۱۹	اصح السیر	مولانا عبد الرؤف داناپوری	مطبع ستارہ ہند کلکتہ	ب ت
۲۰	اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر	اوم پرکاش پرساد	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۱۹۹۰ء
۲۱	ارض القرآن اول	مولانا سید سلیمان ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۵۵ء
۲۲	ارض القرآن دوم	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۶ء
۲۳	امام رازی	مولانا عبد السلام ندوی	ایضاً	۱۹۵۰ء
۲۴	انقلاب الامم	ایضاً	ایضاً	۱۹۴۵ء
۲۵	اسلامی قانون فوجداری	ایضاً	ایضاً	۱۹۲۹ء
۲۶	اقبال کامل	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۵ء
۲۷	اسوۂ صحابیاتؓ	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۷ء
۲۸	القضا فی الاسلام	ایضاً	ایضاً	۱۹۲۹ء
۲۹	التربیۃ الاستقبالیہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۲۶ء
۳۰	ابن خلدون	ایضاً	ایضاً	۱۹۴۰ء
۳۱	اسوۂ صحابہؓ (اول)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱ء
۳۲	اسوۂ صحابہؓ (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۲۲ء

۳۳	اسلام اور عربی تمدن	شاہ معین الدین احمد ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۵۲ء
۳۴	ادبی نقوش	ایضاً	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۰ء
۳۵	اورنگ سلیمان	سید فخر الحسن	مجلس علوم اسلامیہ کراچی	۱۹۸۵ء
۳۶	اسلام اور مستشرقین (اول)	سید صباح الدین عبدالرحمن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۵ء
۳۷	اسلام میں مذہبی رواداری	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۷ء
۳۸	اسلامی نظام تعلیم	سید ریاست علی ندوی	ایضاً	۱۹۳۸ء
۳۹	آئینہ تاریخ نما (اول)	بابو شیو پرشاد	گورنمنٹ پریس الہ آباد	۱۹۷۰ء
۴۰	ارباب نثر اردو	سید محمد قادری	مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی حیدر آباد	۱۹۲۷ء
۴۱	اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۹۳۰ء
۴۲	اقبال نامہ	مرتبہ شیخ عطاء اللہ	شیخ مبارک علی لاہور	۱۹۵۰ء
۴۳	ارمغان فاروقی	مجلس فاروقی	مجلس ارمغان فاروقی	۱۹۷۱ء

(ب)

۴۴	باقیات شبلی	مشتاق حسین	آزاد کتاب گھر دہلی	۱۹۶۴ء
۴۵	بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۷۱ء
۴۶	بزم تیموریہ (اول)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۵ء
۴۷	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۱ء
۴۸	ایضاً (سوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۱ء
۴۹	بزم مملوکیہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۴ء
۵۰	بزم رفتگاں (اول)	ایضاً	مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی	۱۹۸۱ء

۵۱	بزم رفتگان (دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	ب ت
۵۲	بابری مسجد	سید صباح الدین عبدالرحمن	ایضاً	۱۹۹۰ء
۵۳	بہادر خواتین اسلام	مولانا سید سلیمان ندوی	ایضاً	۱۹۸۶ء
۵۴	برید فرنگ	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۶ء

(پ)

۵۵	پرانے چراغ (اول)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	مکتبہ فردوس لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۵۶	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۰ء
۵۷	ایضاً (سوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۴ء
۵۸	پیر حسام الدین راشدی اور ان کے علمی کارنامے	سید صباح الدین عبدالرحمن	انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ وسٹ ایشین اسٹڈیز کراچی	۱۹۸۵ء

(ت)

۵۹	تاریخ اسلام (اول)	شاہ معین الدین احمد ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۶ء
۶۰	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۸ء
۶۱	ایضاً (سوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۴۴ء
۶۲	ایضاً (چہارم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۳ء
۶۳	تابعین	ایضاً	ایضاً	۱۹۳۸ء
	تاریخ	حکیم شمس اللہ قادری	تاریخ پریس حیدر آباد	

۶۴	تاریخ دولت عثمانیہ (اول)	ڈاکٹر محمد عزیر	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۸۱ء
۶۵	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	
۶۶	تاریخ اندلس (اول)	سید ریاست علی ندوی	ایضاً	۱۹۵۰ء
۶۷	تاریخ صقلیہ (اول)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۲ء
۶۸	تاریخ صقلیہ (دوم)	سید ریاست علی ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ	۱۹۸۲ء
۶۹	تاریخ گجرات	سید ابو ظفر ندوی	ندوۃ المصنفین دہلی	۱۹۵۸ء
۷۰	تاریخ اولیائے گجرات	ایضاً	حاجی بدرالدین حسینی نظامی تاجر کتب احمد آباد	۱۹۳۳ء
۷۱	تاریخ سندھ	ایضاً	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۷۰ء
۷۲	تذکرہ اقدس	ایضاً	معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۳۴ء
۷۳	تاریخ التاریخ	مولانا محمد مرتضیٰ	روز بازار اسٹیم پریس امرتسر	۱۹۱۱ء
۷۴	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	منشی تیج کمار لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۷۵	تاریخ ادب اردو مکمل	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	ب ت
۷۶	تاریخ فقہ اسلامی	مولانا عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۱ء
۷۷	تاریخ الحرمین الشریفین	ایضاً	صوفی پرنٹنگ پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین پنجاب	ب ت
۷۸	تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات	ڈاکٹر سید جمال الدین	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۷۹	تاریخ شیر شاہی	مترجم مظہر علی ولا	سلمان اکیڈمی کراچی	۱۹۶۳ء

۸۰	تاریخ ہندوستان (اول)	منشی ذکاء اللہ دہلوی	انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ	۱۹۱۵ء
۸۱	تاریخ سوانحات سلاطین اودھ	سید کمال الدین حیدر	مطبع نول کشور لکھنؤ	
۸۲	تاریخ ممالک چین (اول)	جیمز کارکرن	مطبع پادری طامس کلکتہ	۱۸۴۲ء
۸۳	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۸۴۸ء
۸۴	تواریخ نادر العصر	منشی نول کشور	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۱۹۹۰ء
۸۵	تواریخ (شہزادہ ریسلاس)	ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی	افضل نعیمی پریس مئو	۱۹۸۳ء
۸۶	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند جلد ۸ اردو ادب (جلد سوم)	کیپٹن فیاض احمد	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۱ء
۸۷	تذکرہ سلیمان	غلام محمد	ادارہ مجلس علمی کراچی	۱۹۶۰ء
۸۸	تذکرہ علمائے اعظم گڑھ	حبیب الرحمٰن قاسمی	جامعہ اسلامیہ بنارس	۱۹۷۶ء
۸۹	تذکرہ اردو مخطوطات (اول)	محی الدین قادری زور	ترقی اردو بیورو دہلی	۱۹۸۴ء
۹۰	تعارف تاریخ اردو	شجاعت علی سندیلوی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۳ء
۹۱	تعارف دارالمصنفین	ادارہ	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	
۹۲	تنقیدیں	خورشید الاسلام	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۶۴ء
۹۳	تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	مشتاق بک ڈپو کراچی	۱۹۶۳ء
۹۴	تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۴ء
۹۵	تاریخ صحافت اردو	امداد صابری	سبھاش بکڈپو دہلی	۱۹۵۳ء

(چ)

۹۶	چینی مسلمان	بدرالدین چینی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۳۵ء

۹۷	چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	

(ح)

۹۸	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۳ء
۹۹	حیات مالک	ایضاً	ایضاً	ب ت
۱۰۰	حسن البیان فیمانی سیرۃ النعمان	عبدالعزیز محمدی	مطبع فاروقی دہلی	۱۳۱۱ھ
۱۰۱	حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۰ء
۱۰۲	حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	ایضاً	۱۹۸۵ء
۱۰۳	حیات سلطانی	امین زبیری	عزیزی پریس آگرہ	۱۹۳۹ء
۱۰۴	حکمائے اسلام (اول)	مولانا عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۵۳ء
۱۰۵	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۶ء
۱۰۶	حیات جاوید	الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو دہلی	۱۹۳۹ء
۱۰۷	حواشی ابوالکلام آزاد	مسیح الحسن	ثمر آفسیٹ پرنٹرز دہلی	۱۹۸۸ء

(خ)

۱۰۸	خطوط سرسید	سرراس مسعود	نظامی پریس بدایوں	۱۹۳۱ء
۱۰۹	خطبات شبلی	مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۹ء
۱۱۰	خیام	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۴ء

۱۱۱	خطبات مدراس	مولانا سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۶ء
۱۱۲	خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام	ایضاً	دارالاشاعت سیاسیات مشرقیہ دہلی	ب ت
۱۱۳	خطوط شبلی	امین زبیری	ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال	ب ت
۱۱۴	خطوط مشاہیر	مولانا عبدالماجد دریابادی	نسیم بکڈپو رلاٹوش روڈ لکھنؤ	
۱۱۵	خطوط محمد علی	محمد سرور	مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی	۱۹۴۰ء
۱۱۶	خلاصہ حیات شبلی	عبدالرزاق قریشی	عثمانیہ بکڈپو بمبئی	
۱۱۷	خلفائے راشدین	حاجی معین الدین ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۵۴ء

(د)

۱۱۸	دارالمصنفین کی ادبی خدمات	ڈاکٹر خورشید نعمانی	رحیمی پریس بمبئی	۱۹۷۷ء
۱۱۹	دستاویز	مصنفین کے اپنے قلم سے	اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۱۲۰	دنیا اسلام سے پہلے اسلام کے بعد	مولانا عبدالسلام قدوائی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی	۱۹۷۲ء
۱۲۱	دیوان فغاں	مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۵۰ء
۱۲۲	دین رحمت	شاہ معین الدین احمد ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۷ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۲۳	دید و شنید	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل کشمیری بازار لاہور	۱۹۴۸ء
۱۲۴	دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز	اثر انصاری	نکھار پبلی کیشنز منو	۱۹۹۰ء
۱۲۵	داستان تاریخ زبان اردو	حامد حسن قادری	لکشمی نرائن تاجر کتب آگرہ	۱۹۶۶ء

(ذ)

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۲۶	ذکر رفتگاں	محمد ایوب واقف	قادری پریس اعظم گڑھ	۱۹۸۶ء

(ر)

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۲۷	ریویو سیرۃ النعمان	قزلباس	اودھ پریس لکھنؤ	۱۸۹۳ء
۱۲۸	رحمۃ للعالمین	قاضی سلیمان منصور پوری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	
۱۲۹	رحمت عالم	سید سلیمان ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۵ء

(س)

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۳۰	سید محمود	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۷۲ء
۱۳۱	سیرۃ النبیؐ (اول)	علامہ شبلی نعمانی	ایضاً	۱۹۹۶ء
۱۳۲	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۶ء
۱۳۳	ایضاً (سوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	ایضاً	۱۹۸۲ء
۱۳۴	ایضاً (چہارم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۱ء
۱۳۵	ایضاً (پنجم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۱ء

١٣٦	سیرۃ النبیؐ (ششم)	مولانا سید سلیمان ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	١٩٤١ء
١٣٧	ایضاً (ہفتم)	ایضاً	ایضاً	١٩٨٠ء
١٣٨	سیرۃ النعمان	علامہ شبلی نعمانی	مکتبہ اعزازیہ دیوبند	ب ت
١٣٩	سفر نامہ روم و مصر و شام	ایضاً	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	١٩٤٠ء
١٤٠	سرسید اور ان کے نامور رفقاء	ڈاکٹر سید عبد اللہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	١٩٩٤ء
١٤١	سیر المصنفین اول و دوم	محمد یحییٰ تنہا	مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی	١٩٢٨ء
١٤٢	سید سلیمان ندوی حیات و ادبی کارنامے	ڈاکٹر سید محمد ہاشم	مکتبہ جامعہ دہلی	١٩٩٥ء
١٤٣	سرمایہ سلیمان	مرتبہ ایس مناتی	لیاقت گورنمنٹ کالج کراچی	١٩٨٢ء
١٤٤	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	١٩٩٦ء
١٤٥	سفر نامہ افغانستان	ایضاً	ایضاً	١٩٩٢ء
١٤٦	سید سلیمان ندوی	مرتبہ عتیق احمد صدیقی	شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	١٩٨٥ء
١٤٧	سیر افغانستان	مولانا سید سلیمان ندوی	نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن	١٩٤٥ء
١٤٨	سید سلیمان ندوی	مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	١٩٨٦ء
١٤٩	سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	١٩٨٣ء
١٥٠	سفر نامہ برہما	سید ابو ظفر ندوی	محبوب المطابع دہلی	١٩٢١ء

۱۵۱	سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۴۶ء
۱۵۲	سیر الصحابہؓ (جلد ششم)	شاہ معین الدین احمد ندوی	ایضاً	۱۹۸۰ء
۱۵۳	ایضاً (ہفتم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۳۳ء
۱۵۴	سیر الانصارؓ (اول)	مولانا سعید انصاری	ایضاً	ب ت
۱۵۵	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۳۴۳ھ
۱۵۶	سیر الصحابیاتؓ	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۲ء
۱۵۷	سیر الصحابہؓ (اول)	ایضاً	صوفی پرنٹنگ پبلشنگ کمپنی پنڈ بہاءالدین پنجاب	ب ت
۱۵۸	سید نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے	ریاست علی تاج	مکتبہ شعر و حکمت حیدر آباد	۱۹۸۱ء
۱۵۹	سیر المنازل از مرزا سنگین بیگ	مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۱۹۸۲ء

(ش)

۱۶۰	شبلی کا ذہنی ارتقاء	سید یحیٰ احمد ہاشمی	مجلس یادگار ہاشمی کراچی	۱۹۹۵ء
۱۶۱	شبلی بحیثیت مورخ	اختر وقار عظیم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۷۹ء
۱۶۲	شبلی نامہ	شیخ محمد اکرم	الواعظ صفدر پریس لکھنؤ	۱۹۲۶ء
۱۶۳	شبلی بلادِ اسلامیہ میں	محمد واصل عثمانی	درج نہیں	ب ت
۱۶۴	شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں	سید شہاب الدین دسنوی	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۸۴ء
۱۶۵	شبلی بحیثیت انشاپرداز	سعید انصاری	الناظر بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۳۴ء
۱۶۶	شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری	کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ	۱۹۹۰ء

(ص)

۱۶۷	صوفی امیر خسرو	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۰ء
۱۶۸	صلیبی جنگیں	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۰ء

(ظ)

۱۶۹	ظہیر الدین محمد بابر ہندو مسلم مورخین کی نظر میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	

(ع)

۱۷۰	علامہ شبلی کی علمی وادبی خدمات	ڈاکٹر خلیق انجم	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۹۶ء
۱۷۱	علم الکلام	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۳ء
۱۷۲	علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات	ڈاکٹر نعیم صدیقی	مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۱۷۳	عرب وہند کے تعلقات	مولانا سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۲ء
۱۷۴	عربوں کی جہاز رانی	ایضاً	اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی	ب ت
۱۷۵	عہد اسلامی کا ہندوستان	سید ریاست علی ندوی	ادارۃ المصنفین پٹنہ	۱۹۵۰ء
۱۷۶	عہد رسالت وخلافت راشدہ	ایضاً	اردو اکادمی پٹنہ	۱۹۸۷ء
۱۷۷	عہد مغلیہ ہندو مسلم مورخین کی نظر میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۷ء

۱۷۸	علامہ سید سلیمان ندوی اور حیدر آباد آصفی	غلام محمد	بہادر یار جنگ اکادمی کراچی	۱۹۸۵ء
۱۷۹	علامہ سید سلیمان ندوی		اردو اکادمی پٹنہ	۱۹۸۸ء
۱۸۰	عرب کی موجودہ حکومتیں	شاہ معین الدین احمد ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۳۴ء
۱۸۱	علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم	ڈاکٹر عبید اللہ فراہی	لیتھو ورکس سیماپوری دہلی	۱۹۸۸ء

(ف)

۱۸۲	فتح گڑھ نامہ	کالے رائے	مطبع اردو اخبار دہلی	۱۹۴۹ء
۱۸۳	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم	فائن آفسیٹ ورکس الہ آباد	۱۸۸۳ء

(ک)

۱۸۴	کسوف الشمسین	احسن مارہروی	نظامی پریس بدایوں	۱۹۱۵ء
۱۸۵	کتاب کی تاریخ	شایاں قدوائی	ترقی اردو بیورو دہلی	۱۹۸۰ء
۱۸۶	کتاب نامہ شبلی	اختر راہی	مسلم اکیڈمی لاہور	۱۹۸۱ء
۱۸۷	کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات ایک تذکرہ	سید مقیت الحسن	عثمانیہ بکڈپو کلکتہ	۱۹۸۰ء

(گ)

۱۸۸	گجرات کی تمدنی تاریخ	سید ابو ظفر ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۲ء
۱۸۹	گل کرسٹ اور اس کا عہد	عتیق احمد صدیقی	انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی	۱۹۶۰ء

(م)

۱۹۰	مقالات شبلی (اول)	مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۵۴ء
۱۹۱	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۸ء
۱۹۲	ایضاً (سوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۵ء
۱۹۳	ایضاً (چہارم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۳۴ء
۱۹۴	ایضاً (پنجم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۵ء
۱۹۵	ایضاً (ششم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۱ء
۱۹۶	ایضاً (ہفتم)	مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۳۸ء
۱۹۷	ایضاً (ہشتم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۲ء
۱۹۸	مقالات حالی	مولانا الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	۱۹۳۶ء
۱۹۹	مقالات سلیمان (اول)	مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۶ء
۲۰۰	ایضاً (دوم)	مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی	ایضاً	۱۹۶۸ء
۲۰۱	ایضاً (سوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۱ء
۲۰۲	مقالات شیروانی	مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی	شیروانی پرنٹنگ پریس علیگڑھ	۱۹۴۶ء
۲۰۳	مقالات یوم شبلی	مرتبہ حافظ نذر احمد	مسلم اکیڈمی لاہور	۱۹۸۶ء
۲۰۴	مقالات احسان	مرزا احسان احمد بیگ	معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۶۸ء
۲۰۵	ماہر القادری کے تبصرے	مولانا ماہر القادری	مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی	۱۹۹۱ء

۲۰۶	مضامین ڈار	پروفیسر محمد ابراہیم ڈار	ڈار پبلی کیشن بمبئی	ب ت
۲۰۷	مصنفین اردو	سید زوار حسین	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۳۹ء
۲۰۸	مختصر تاریخ ہند	سید ابو ظفر ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۳ء
۲۰۹	مختصر تاریخ گجرات	ایضاً	ایضاً	۱۹۲۷ء
۲۱۰	مکاتیب شبلی (اول)	مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی	ایضاً	۱۹۲۸ء
۲۱۱	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۱ء
۲۱۲	مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم	علامہ شبلی نعمانی	قومی پریس لکھنؤ	ب ت
۲۱۳	مسلمانوں کی آئندہ تعلیم	مولانا سید سلیمان ندوی	مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی	۱۹۳۳ء
۲۱۴	مہدی حسن افادی	عبدالقوی دسنوی	نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۲۱۵	مطالعہ تاریخ	مولانا کوثر نیازی	علمی پرنٹنگ پریس لاہور	۱۹۷۵ء
۲۱۶	مولانا شبلی ایک مطالعہ	مفتون احمد	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۸۶ء
۲۱۷	مضامین سلیم (اول)	وحید الدین سلیم	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۶۱ء
۲۱۸	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۸ء
۲۱۹	معاصرین	مولانا عبدالماجد دریابادی	ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ	۱۹۷۹ء
۲۲۰	مطالعہ سلیمانی	مسعود الرحمٰن خاں ندوی	بزم سلیمانی دار العلوم تاج المساجد بھوپال	۱۹۸۶ء
۲۲۱	مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	مولانا محمد عمران خاں ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۴۶ء

۲۲۲	مثالی حکمراں	مولانا عبدالسلام قدوائی	نظریہ کتب خانہ لکھنؤ	ب ت
۲۲۳	مستشرقین اور تحقیقات اسلامی	سید عبدالقدوس ہاشمی	مکتبہ مکی کراچی	ب ت
۲۲۴	مشاہیر کے خطوط	مرتبہ ضیاءالدین اصلاحی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۲ء
۲۲۵	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	ایضاً	۱۹۸۸ء
۲۲۶	محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۷۷ء
۲۲۷	مہاجرین (اول)	حاجی معین الدین ندوی	ایضاً	۱۹۲۸ء
۲۲۸	ایضاً (دوم)	شاہ معین الدین احمد ندوی	ایضاً	
۲۲۹	مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	ایضاً	۱۹۸۵ء
۲۳۰	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	ادبی دنیا دہلی	۱۹۹۱ء
۲۳۱	مقدمہ رقعات عالمگیر	سید نجیب اشرف ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۱ء
۲۳۲	مرحوم دہلی کالج	بابائے اردو مولوی عبدالحق	انجمن ترقی ہند دہلی	۱۹۴۵ء
۲۳۳	مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن قادری	ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد	۱۹۳۹ء

۲۳۴	ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن قدوائی	شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی	۱۹۶۱ء
۲۳۵	مختصر تاریخ ادب اردو	سید اعجاز حسین	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۲۳۶	مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	عبداللطیف اعظمی	مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی	

(ن)

۲۳۷	نقوش سلیمانی	مولانا سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۸۰ء
۲۳۸	نذیر احمد شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۷۴ء

(ہ)

۲۳۹	ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں	مولانا سید سلیمان ندوی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی	۱۹۸۲ء
۲۴۰	ہم نفسان رفتہ	رشید احمد صدیقی	سرسید بک ڈپو علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۲۴۱	ہماری بادشاہی	مولانا عبدالسلام قدوائی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۴۴ء
۲۴۲	ہندوستان کی کہانی	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۶ء
۲۴۳	ہندوستان عربوں کی نظر میں (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	ایضاً	۱۹۵۹ء
۲۴۴	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۲ء
۲۴۵	ہندوستانی دور وسطیٰ کے مورخین	پروفیسر محب الحسن	ترقی اردو بیورو دہلی	۱۹۸۵ء
۲۴۶	ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	مولانا ابوالحسنات ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۷۱ء

۲۴۷	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۶۰ء
۲۴۸	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۹ء
۲۴۹	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۶ء
۲۵۰	ایضاً (سوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۳ء
۲۵۱	ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۰ء
۲۵۲	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۶ء
۲۵۳	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	ایضاً	ایضاً	۱۹۵۸ء
۲۵۴	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۳ء

(ی)

۲۵۵	یادرفتگاں	مولانا سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۱۹۹۳ء
۲۵۶	یادرفتگاں (اول)	مولانا ماہرالقادری	مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی	۱۹۹۴ء
۲۵۷	ایضاً (دوم)	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۴ء
۲۵۸	یادگار سلیمان	عبدالقوی دسنوی	بہار اردو اکیڈمی پٹنہ	۱۹۸۴ء

ENGLISH BOOKS

259	Allama Shibli Nomani	Al-Farooq: Omar the great, the second Caliph of Islam. Translated by Zafar Ali Khan, 4th ed. Lahore Shiekh Mohd Ashraf, 1956.
260	Allama Shibli Nomani	Imam Abu Hanifa Translated by Hadi Hussain, Lahore Institute of Islamic Culture, 1978.
261	Allama Shibli Nomani	Seerat-un-Nabi Translated by Tayyab Bakhsh Badayuni, Lahore, Qazi Publication, 1979.
262	Abdul Qadeer	Famous Urdu Poets and Writers, Lahore, New Book society.
263	E.H. Carr	What is History, Harmondsworth Pliean Books, 1964.
264	R.G. Collingwood	The Idea of History, New York, Oxford university Press, 1966.
265	H.w. Dray	Philosophy of History, Englewood Clffs Prntice Hall 1964.
266	G.R. Elton	The Proclice of History, New York, 1967.
267	P.Smith	The History and Historian, New York, Vintoge Books 1966.

رسائل وجرائد

ا۔ خصوصی نمبر

رسالہ	مدیر	مقام	سنہ
۲۶۸ البصیر (شبلی نمبر)	مدیر عبید اللہ خاں	اسلامیہ کالج چنیوٹ پاکستان جون تا دسمبر	۱۹۵۷ء
۲۶۹ تعمیر حیات (یادرفتگاں)	نور عظیم ندوی	ندوۃ العلماء لکھنؤ جنوری	۱۹۸۰ء
۲۷۰ الفرقان، ماہنامہ (وفیات نمبر)	مولانا منظور نعمانی	مکتبہ الفرقان لکھنؤ	
۲۷۱ سہ ماہی فکرو نظر (شبلی نمبر)	شہر یار	مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جون	۱۹۹۶ء
۲۷۲ نقوش (رسول نمبر) مکمل	محمد طفیل	ادارہ فروغ اردو لاہور	۱۹۸۳ء
۲۷۳ فکرو نظر۔ سہ ماہی (سیرت نمبر)	صاحبزادہ ساجد الرحمٰن	اسلام آباد، اپریل وجولائی تا دسمبر	۱۹۷۶ء
۲۷۴ فکرو نظر۔ سہ ماہی (مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نمبر)	ایضاً	اسلام آباد، مارچ	۱۹۸۸ء
۲۷۵ صبا (شبلی نمبر)	سلیمان ادیب	حیدر آباد	۱۹۵۸ء
۲۷۶ ریاض (سلیمان نمبر)	رئیس احمد جعفری	کراچی	۱۹۵۴ء
۲۷۷ نیادور (یادرفتگاں نمبر)	امیر احمد صدیقی	لکھنؤ، اپریل تا دسمبر	۱۹۸۸ء
۲۷۸ نیادور (اودھ نمبر حصہ اول)	سید امجد صدیقی	لکھنؤ مارچ اپریل	۱۹۹۴ء
۲۷۹ ایضاً (دوم)	ایضاً	لکھنؤ، اکتوبر نومبر	۱۹۹۴ء

۲۸۰	ماہنامہ معارف (سلیمان نمبر)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	اعظم گڑھ، مئی	۱۹۵۵ء
۲۸۱	شبلی نیشنل کالج میگزین (عبدالسلام ندوی) کی یاد میں	کبیر احمد جائسی	شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ	۱۹۵۸ء
۲۸۲	دلی کالج میگزین (قدیم دلی کالج نمبر)	خواجہ احمد فاروقی	دہلی یونیورسٹی دہلی	۱۹۵۳ء

۲۔ عام رسائل

۱	ماہنامہ برہان دہلی	فروری، اپریل، مئی، اگست ۱۹۴۰ء۔ ستمبر ۱۹۴۲ء۔ مئی ۱۹۶۰ء۔ فروری، مئی، نومبر، دسمبر ۱۹۶۱ء۔ دسمبر ۱۹۶۳ء
۲	ماہنامہ جامعہ دہلی	جون ۱۹۳۳ء۔ جنوری، اپریل، ۱۹۳۴ء۔ نومبر ۱۹۳۵ء۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ اپریل ۱۹۴۰ء
۳	ماہنامہ آجکل دہلی	دسمبر ۱۹۵۶ء
۴	اردو اورنگ آباد	جنوری ۱۹۲۸ء
۵	ماہ نو کراچی	جنوری ۱۹۵۴ء
۶	نوائے ادب بمبئی	جنوری ۱۹۶۹ء
۷	سب رس حیدر آباد	اپریل ۱۹۴۹ء
۸	ہندوستانی الہ آباد	جولائی، اکتوبر ۱۹۴۲ء
۹	دارالعلوم دیوبند	جنوری تا نومبر ۱۹۷۲ء
۱۰	الاصلاح سرائمیر اعظم گڑھ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۳۶ء۔ جنوری تا دسمبر ۱۹۳۷ء۔ جنوری تا دسمبر ۱۹۳۸ء۔ جنوری تا فروری ۱۹۳۹ء
۱۱	ترجمان الاسلام بنارس	جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء
۱۲	انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڑھ	مارچ ۱۹۸۳ء

۱۳	محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین علی گڑھ	اپریل تا جولائی ۱۹۹۵ء
۱۴	ماہنامہ معارف اعظم گڑھ	جولائی ۱۹۱۶ء۔ جنوری، فروری ۱۹۱۷ء۔ فروری ۱۹۱۸ء۔ دسمبر ۱۹۲۰ء۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء۔ اپریل ۱۹۲۲ء۔ جنوری، مئی، اگست، اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ ستمبر ۱۹۲۵ء۔ جولائی، ستمبر، دسمبر ۱۹۲۷ء۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۸ء۔ فروری، جون، اکتوبر ۱۹۲۹ء۔ دسمبر ۱۹۳۰ء۔ اگست، نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء۔ جنوری، اگست ۱۹۳۳ء۔ دسمبر ۱۹۳۴ء۔ فروری ۱۹۳۵ء۔ فروری، مارچ، اپریل، جولائی ۱۹۳۶ء۔ مئی ۱۹۳۷ء۔ مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء۔ مارچ ۱۹۴۴ء۔ مارچ ۱۹۴۵ء۔ جولائی، ستمبر ۱۹۵۰ء۔ اپریل ۱۹۵۱ء۔ جولائی ۱۹۷۱ء۔ دسمبر ۱۹۸۰ء۔ نومبر ۱۹۸۵ء۔ مارچ ۱۹۸۶ء۔ نومبر ۱۹۹۰ء۔ مئی ۱۹۹۵ء۔ اگست ۱۹۹۶ء۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء وغیرہ۔
۱۵	الہلال کلکتہ	۱۰ر جنوری ۱۹۱۳ء۔ ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء
۱۶	جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی پاکستان (Journal of the Pakistan Historical Society)	جنوری ۱۹۹۴ء۔ جولائی ۱۹۹۷ء وغیرہ

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل وجرائد کی فائلیں دیکھیں۔

ہماری زبان دہلی۔ ایوان اردو دہلی۔ تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ نقوش لاہور۔ ندائے ملت لکھنؤ۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ کاروان ادب لکھنؤ۔ مجلّہ علوم اسلامیہ علیگڑھ۔ ابخش لائبریری جرنل پٹنہ وغیرہ

☆☆☆

Darul Musannefeen Ki Tarikhi khidmat

By
Dr.M.Ilyas Al-Azami

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna